’’چہارسُو‘‘

...... نِکات ......

(تنقیدی مضامین)

''تاریخ علوم میں تہذیب اسلام کا مقام'' ترکی کے نامور عالم اور علوم مشرقی پر عمیق نظر رکھنے والے دانشور فواد سیزگین کے ان فکر انگیز خطبات کا اردو ترجمہ ہے جو انہوں نے حکومت سعودیہ کی دعوت پر ۱۹۷۹ء میں ریاض میں دیے گئے تھے۔ ان خطبات میں بعض ایسے علمی حقائق بیان ہوئے ہیں جنہیں بلا مبالغہ ان کے انکشافات و اوّلیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ستم نہیں کہ بعض لاطینی علماء نے مدتوں پہلے مسلمانوں کی پوری پوری کتابوں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے انہیں اپنی طبع زاد تصانیف قرار دے ڈالا تھا۔ مغرب میں تجربی اور استقرائی منہاج علم کا نام نہاد بانی راجر بیکن عربوں کے تحقیقی نتائج و افادات پر بڑی دیدہ دلیری سے ہاتھ صاف کرتا رہا۔ یہ اور متعدد دیگر علمی، تحقیقی اور تنقیدی حقائق زیر نظر خطبات کے مختلف ابواب میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اردو اور عربی ادبیات کے فاضل اور اردو کے منفرد شاعر اور نثر نگار ڈاکٹر خورشید رضوی نے مذکورہ بالا خطبات کا بڑا رواں اور عمدہ ترجمہ کر کے اردو کے تہذیبی، ثقافتی اور علمی حدود کو توسیع دی ہے۔ امید ہے ''نِکات'' کے مشمولات اہل نظر کے پسندِ خاطر ہوں گے وہ ان مقالات کا گہری تنقیدی نظر سے جائزہ لیں گے اور ان میں موجود خامیوں کی نشاندہی فرمانے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔

...... تحسین فراقی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۳۰۰، دستیابی: مجلس ترقی ادب، لاہور۔

...... بلوچستان میں اُردو فکشن کا تاریخی تناظر ......

قوموں کی تاریخ مینڈک کی چھلانگ نہیں، دریا کی روانی ہے، Flux ہے، Spontanious Flow ہے بلوچستان کے فکشن کے ڈانڈے مصر، یونان، روم، قدیم ہندی ادب اور سامانیوں سے جا ملتے ہیں۔ بلوچستان میں فکشن کی ابتدا بھی داستانوں سے ہی ہوئی۔ داستانوں کا علامتیم مطالعہ کرنے والے سوشیالوجسٹ انہی داستانوں کو اس دور کی سماجی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ نفسیاتی، معاشی، جنسی الجھنوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اجتماعی شعور، جذبۂ عشق اور ذات سے اندر یا باہر کا سفر اس ابتدائی داستانی دور میں بھی ملتا ہے۔ داستانیں تفریح کے لیے چٹخارے کے لیے کہی جاتی تھیں۔ انسانوں کو حقیقی دنیا سے نکال کر خیالِ جنت میں لے آیا کرتیں۔ جب کہ آج کا فکشن زندگی کا حقیقی نمائندہ ہے۔ تخلیق کاروں سے یہی درخواست ہے کہ ایسا ادب تخلیق کریں جو دھرتی سے بڑا ہو، زمین کی خوشبو ہو جس میں، وطن سے محبت ہو۔ ہم فخر سے اسے عالمی ادب کے مقابلے میں رکھ سکیں۔ وطنِ عزیز کو ادبی، تخلیقی طور پر بھی دنیا میں ممتاز مقام دلوائیں۔ ''حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا!''

......آغا گل

اشاعت: ۲۰۱۸، قیمت: ۳۰۰، دستیابی: مہروز پبلیشرز، پی او بکس 26، کوئٹہ، بلوچستان۔

...... رشتہ ......

علی رضا نے انسانی رشتے کے الجھاؤ اور سلجھاؤ دونوں کی تصویریں نمایاں کر کے دکھائی ہیں اور اپنے قاری کو خود یہ فیصلہ کرنے دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کیسی صورتِ حال کو پیدا کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ میرے نزدیک ''رشتے'' اپنے اندر بے پناہ دلچسپی کا عنصر رکھتے ہیں۔ اس کے کردار حقیقی زندگی سے مستعار ہیں اور ان کی تراش خراش میں افسانہ نگار نے اپنی استعداد کے مطابق عمدہ تحقیق کی کوشش کی ہے۔ اس کا تار و پود کو دیکھتے ہوئے اپنے ارد گرد کا ماحول اور اس میں چلتے پھرتے افراد متحرک نظر آتے ہیں۔ یہی تصویر کشی اور تحرک علی رضا کی کامرانی کا ثبوت ہیں۔ یہ کہانی رقم کرتے ہوئے اس نے تفکر و تدبر سے بھی کام لیا ہے اور اُردو کی شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس طرح اس کے پلاٹ میں ایک فکری گمبھیرتا کا عنصر بھی واضح ہے۔

......ڈاکٹر طارق ہاشمی

اشاعت: ۲۰۱۸، قیمت: ۳۰۰، دستیابی: مثال پبلیشرز، فیصل آباد۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۸،شمارہ:جنوری،فروری۲۰۱۹ء

رابطہ:537/D-1 ‘ گلی نمبر 18، ویسٹریج-III ‘ راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:8730633-8730433-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

شام سے پہلے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق	۶
چاند پاگل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندرعلی	۷
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید	۹
روشنی کی جنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا	۱۳
غزل کا سارا جہان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ندا فاضلی	۱۷
غزل آسان ہو جائے۔۔۔۔۔ڈاکٹر محبوب راہی	۲۰
غزل کا ارتقائی سفر۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عزیز عرفان	۲۵
غزل کی آنکھ میں نیزے۔۔۔۔۔ڈاکٹر طارق قمر	۳۰
ذہانت کے تذکرے۔۔۔۔۔۔۔۔سنجے مشرا شوق	۳۲
سچ بولنے والا شاعر۔۔۔۔۔۔ملک زادہ جاوید	۳۵
گریباں بدست ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔سراج نقوی	۳۸
حرم میں نہ شوالوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسلم چشتی	۴۱
شیشے کا بدن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔افق دہلوی	۴۳

خوشبوئے دھن

نسیم سحر، شگفتہ نازلی، انیس الرحمٰن	۴۷

افسانے

لو جہاد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شموئل احمد	۴۸
فٹ پاتھ جج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل	۵۰
درد کی زنجیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیما پیروز	۵۳
مفاہمت کا عذاب۔۔۔۔۔۔۔اسرار گاندھی	۵۸

بانسری کی صدا

مخدوم محی الدین، آصف ثاقب، محمود الحسن، حسن عسکری کاظمی، واصف حسین واصف، ناصر علی سید، غالب عرفان، عبدالرحمٰن عبد، عارف شفیق، عظیم بخت۔	۶۲

افسانے

آخر کب تک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وحشی سعید	۶۷
اُف یہ برگرز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رومانہ رومی	۷۰
دائرے کا سفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد عالم اللہ	۷۲
بڑا ابوائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔توصیف بریلوی	۷۶

اخلاص کی خوشبو

رضیہ اسماعیل، عرش صہبائی، سیفی سرونجی، ثاقب تبسم، اسد عباس، شوق انصاری، ملک محمد انور، زیبا سعید، شاہین مفتی، کلیم ضیا، ضمیر درویش، رئیس صدیقی، ابراہیم عدیل، سبھاش گپتا شفیق۔	۷۹

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ	۸۴

قصدِ زیارت

افتخار عارف، شاہین، پرویز شہریار، حنیف باوا، رضیہ اسماعیل، پروین شیر، کرشن گوتم، رفیق سندیلوی، شگفتہ نازلی۔	۹۱

زندگی نایاب ہے

ہیپاٹائیٹس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم	۹۶

آئینۂ فن

استنائی صورتیں۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ریاض احمد	۹۹
روشنی پھیلاتی شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔۔نوید سروش	۱۰۰

نشانِ راہ

لوٹ پیچھے کی طرف۔۔۔۔۔۔۔۔۔نازیہ پروین	۱۰۲

ڈرامہ

پردہ اُٹھاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اہل ٹھکر	۱۰۴

ایک صدی کا قصہ

شمی کپور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول	۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار	۱۱۷

☆

☆

☆☆

☆●☆

☆☆☆☆

قرطاسِ اعزاز

●☆●

راحت اندوری

●☆●

کے نام

☆☆☆☆

☆●☆

☆☆

☆

''شام سے پہلے''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام: راحت اللہ قریشی
تخلص: راحت اندوری
پیدائش: یکم جنوری ۱۹۵۰ء (اندور، بھارت)
والد: رفعت اللہ قریشی
والدہ: مقبول النساء بیگم
شریک حیات: سیما راحت
اولاد: شبلی عرفان، فیصل راحت، ستلج راحت
تعلیم:

میٹرک نوتن ہائی سکول، اندور
بی اے اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور
ایم اے اردو برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال
پی ایچ ڈی بعنوان ''اردو میں مشاعرہ'' یونیورسٹی آف بھوج

تصانیف:

۱۔ دھوپ دھوپ
۲۔ میرے بعد
۳۔ پانچواں درویش
۴۔ رت بدل گئی
۵۔ ناراض
۶۔ موجود
۷۔ چاند پاگل ہے
۸۔ دوقدم اور سہی

اعزازات:

۱۔ فروغِ اردو ادب ایوارڈ، کویت
۲۔ شاعرِ محفل ایوارڈ، انجمن فروغِ اردو ادب، کویت
۳۔ محمد علی تاج ایوارڈ، اردو اکادمی، بھوپال
۴۔ مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ، جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، دہلی
۵۔ ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ، لدھیانہ
۶۔ حق بنارسی ایوارڈ، انجمن نوائے حق، بنارس
۷۔ ساہتیہ سرسوتی ایوارڈ، انجمن نوائے حق، بنارس
۸۔ اِندرا گاندھی ایوارڈ، نیشنل فیڈریشن ہلدوانی
۹۔ پردیش رتنا، ساہتیہ ہندی پری شد، بھوپال
۱۰۔ یو پی ہندی اردو ساہتیہ ایوراڈ، اتر پردیش گورنمنٹ، لکھنؤ
۱۱۔ راجیو گاندھی ادبی ایوارڈ، ہم سب ایک ہیں، بھوپال
۱۲۔ ایکسی لینس، شاعری اور سماجی خدمات (SEWA) ممبئی
۱۳۔ سدھاوٗنا ایوارڈ، بزمِ گنگوہ جمن، اجین
۱۴۔ آفاق حیدر ایوارڈ، شمیم میموریل، ورانسی
۱۵۔ نشور واحدی ایوارڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، کانپور
۱۶۔ نیتا جی ایوارڈ، سبھاش منچ، اندور
۱۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ، نیودہلی
۱۸۔ نشانِ اعجاز ایوراڈ، شکیل ویلفیئر، بریلی
۱۹۔ کیفی اعظمی ایوارڈ، ورانسی
۲۰۔ اردو ایوارڈ، جھانسی
۲۱۔ عشرت ایوارڈ، ورانسی
۲۲۔ کبیر سمان شکشا سمیتی ایوارڈ، جموں
۲۳۔ جگجیت سنگھ ایوارڈ، نرملا فاوٗنڈیشن
۲۴۔ اندور رتنا ایوارڈ، روزنامہ دبنگ، اندور
۲۵۔ راشٹریٔ ایکتا ایوارڈ، امراوتی
۲۶۔ کمل مدراسی ایوارڈ، چنائی
۲۷۔ مرزا غالب ایوارڈ، جھانسی
۲۸۔ کیف بھوپالی ایوارڈ، بھوپال
۲۹۔ فراق انٹرنیشنل ایوارڈ، آگرہ

خدمات:

ڈاکٹر راحت اندوری گزشتہ نصف صدی سے بڑے بڑے قومی و بین الاقوامی مشاعرے، سیمینار، مذاکروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ آپ نے بھارت کے تمام صوبوں اور ضلعوں کے علاوہ امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، ماریشس، سنگاپور، سعودی عرب، کویت، بحرین، اومان، قطر، بنگلہ دیش، نیپال اور پاکستان میں بے شمار موقعوں پر مشاعروں میں شرکت کی اور بے پناہ داد اور پسندیدگی حاصل کی۔

فلمی گیت:

پریم شکتی، آشیاں، سر، جنم، خوددار، ناراض، مرڈر، منا بھائی ایم بی بی ایس، مشن کشمیر، منا کسی، قریب، عشق، بیگم جان، گھاتک جیسی مشہور فلموں کے گیت لکھے جن میں سے چند بے حد مقبول ہوئے۔

پتہ: 269، انوپ نگر، اندور 452001۔(MP)، بھارت

چاند پاگل ہے
منتخب اشعار
عطیہ سکندر علی (سکھر)

رسوائی
آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

عشق اور محبت
اس کی یاد آئی ہے سانسو ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

روز تاروں کو نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

سورج ستارے چاند مرے سات میں رہے
جب تک تمہارے ہات مرے ہات میں رہے

تشنگی اور دریا
ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو

بوتلیں کھول کر تو پی برسوں
آج دل کھول کر بھی پی جائے

بہت غرور ہے دریا کو اپنے ہونے پر
جو میری پیاس سے الجھے تو دھجیاں اڑ جائیں

دوست اور دوستی
بیمار کو مرض کی دوا دینی چاہیئے
میں پینا چاہتا ہوں پلا دینی چاہیئے

خیال تھا کہ یہ پتھراؤ روک دیں چل کر
جو ہوش آیا تو دیکھا لہو لہو ہم تھے

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

گرمی
شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

شہر کیا دیکھیں کہ ہر منظر میں جالے پڑ گئے
ایسی گرمی ہے کہ پیلے پھول کالے پڑ گئے

دنیا
گھر کے باہر ڈھونڈھتا رہتا ہوں دنیا
گھر کے اندر دنیا داری رہتی ہے

دشمن

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
مرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

مزہ چکھا کے ہی مانا ہوں میں بھی دنیا کو
سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا اسے

میں آ کر دشمنوں میں بس گیا ہوں
یہاں ہمدرد ہیں دو چار میرے

پانی

میں آخر کون سا موسم تمہارے نام کر دیتا
یہاں ہر ایک موسم کو گزر جانے کی جلدی تھی

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

میں نے اپنی خشک آنکھوں سے لہو چھلکا دیا
اک سمندر کہہ رہا تھا مجھ کو پانی چاہیئے

سیاست

نئے کردار آتے جا رہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے

کانٹا

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

بے روزگاری

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

کالج کے سب بچے چپ ہیں کاغذ کی اک ناؤ لیے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بیکاری ہے

خواب اور نیند

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو

ہوا

یہ ہوائیں اڑ نہ جائیں لے کے کاغذ کا بدن
دوستو مجھ پر کوئی پتھر ذرا بھاری رکھو

ہجرت

خون آنکھوں کے چراغوں میں سجاؤ ورنہ
تیرگی شہر سے نہیں رخصت ہونے والی

ساتھ چلنا ہے تو تلوار اٹھاؤ میری طرح
مجھ سے بزدل کی حمایت نہیں ہونے والی

اب کے جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر گا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

براہِ راست

جناب راحت اندوری اردو شاعری کا ایسا کردار ہیں جنہوں نے وقت اور حالات کے آگے سَپر ڈالنے کے بجائے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی نا صرف جرأت کی بلکہ ظالم اور جابر کو جس زوردار طریق پر للکارا اور مسلسل للکار رہے ہیں اُس سے مظلوم اور پِسے ہوئے طبقات میں اک نئی زندگی دوڑ گئی ہے۔

اب عام آدمی بھی راحت صاحب کے بلند آہنگ کلام سے تقویت پا کر حالات کے جبر کا مقابلہ کرنے کے لیے پابہ رکاب ہے۔

آیئے ! آج کی نشست میں جناب راحت اندوری صاحب سے تفصیلی ملاقات کے ساتھ اُن کی زندگی کے دیکھے اَن دیکھے گوشوں سے بھی آگاہی حاصل کرتے ہیں اور اُن کی آواز میں آواز ملانے کی مقدور بھر کوشش کے ساتھ اردو ادب اور شاعری میں حق کی آواز بلند کرنے کی طرح بھی ڈالتے ہیں کہ وقت کی ضرورت اور تقاضا یہی ہے۔

گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز خاندانی پسِ منظر سے کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوالات در سوالات اٹھانے میں آسانی رہتی ہے؟

☆☆ اسکول کارڈ کے مطابق یکم جنوری 1950ء کو پیدا ہوا۔ اندور جائے پیدائش ہے۔ والد کا نام رفعت اللہ اور والدہ مقبول بیگم تھیں۔ والد نے مدرسی کے علاوہ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں کیں۔ پانچ بھائی، بہنوں میں چوتھے نمبر پر پیدا ہوا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ایک بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔

☆ ہر چند مشاعرے کے اسٹیج پر آپ کا جاہ وجلال دیکھنے کے باوجود ہم آپ کے بچپن سے ملنے کے پھر بھی خواہاں ہیں؟

☆☆ ایک لوئر مڈل کلاس میں پیدا ہونے والے بچے کی جس طرح گزر بسر ہوتی ہے میرا بچپن اسی طرح گزرا۔ والد ہمیں خوش رکھنے کی تگ و دو میں مصروف رہے۔ والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے ماں سے زیادہ قریب رہا۔ میرا بچپن بغیر کسی ایڈونچر یا غیر معمولی وقوعے کے ہی گزرا۔ لہٰذا کسی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
میں کہا رہ گیا، کہیں بھی نہیں
آرزوئیں نکال دیں ساری
آرزوئیں زیادہ تھی بھی نہیں

☆ کچھ بچے بچپن میں دو قسم کے ہوتے ہیں بڑے ہو کر پرپُرزے نکال لیتے ہیں۔ آپ ہمیں اپنے بارے میں بتلائیں کہ آپ طالب علم کس طرح کے تھے نیز کچھ ہم جماعت اور ہم مزاج دوستوں کی بابت آگاہی دیجیے؟

☆☆ دو قسم کا نہیں لیکن کچھ زیادہ ہوشیار، چالباز، چالاک اور جگاڑو بھی نہیں رہا۔ اسکول اور گھر کے درمیان بچپن کی آنکھیں جو منظر اور دل چسپیاں تلاش کرتی ہیں میرے حصے میں نہیں آئیں۔ دوستوں کی تعداد بھی وہی پونے تین رہی جو بچپن سے آج بڑھاپے تک قائم ہے۔

☆ طبیعت کی موزونیت کب اور کس طور مہمان ہوئی۔ ابتداء میں کس طرح کے اشعار ظہور میں آئے اور رہنمائی کا سلسلہ کس طور شروع ہوا؟

☆☆ جس طرح ہر آدمی میں دس بیس آدمی ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا نہیں البتہ کم عمری سے دو آدمی ہمہ وقت میرے ساتھ رہے۔ ایک آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا تھا آگے چل کر ایک مشہور کمرشیل پینٹر بن گیا۔ دوسرا لفظوں کو جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا لیکن اپنے شاعر ہونے کے راز کو پوشیدہ رکھا۔ پھر یوں ہوا کہ غیر محسوس اور لاشعوری طور پر دوسرا آدمی پہلے سے آگے نکل گیا اور اپنے ہونے کا اعلان کر دیا۔ ابتدائی اشعار اب یاد نہیں۔ اندور ہی کے ایک بزرگ شاعر حضرت قیصر اندوری سے مشورہ سخن ہونے لگا۔ استاد قیصر اندوری سے ذہنی یگانگت نہ ہونے کے سبب یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چلا۔

☆ ابتدا آپ کی سادگی اور سنجیدگی سے ہوئی مزاح، طنز اور تحقیر آپ کی شاعری میں کب اور کیونکر دخیل ہوئے؟

☆☆ کوشش آج بھی یہی ہے کہ سادگی اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ جائے۔ طنز شاعری کا حسن ہوتا ہے۔ طنز و مزاح شعر میں درآئے اس کی شعوری کوشش بھی نہیں کی۔ ''تحقیر'' کا لفظ سمجھ سے پرے ہے۔ کس کی تحقیر، کس کے ذریعے سے۔ جناب بے محل سی بات ہے۔ کس جھونک میں لکھ گئے آپ؟

☆ میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی، داد لوگوں کی، گلہ اپنا، غزل استاد کی یعنی شہرت کے لیے آپ نے بھی وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جنہیں پسندیدہ نہیں گردانا جاتا؟

☆☆ یہ کھلا طنز درحقیقت کڑی سچائی ہے۔ اس شعر میں کون نشانہ پر ہے یہ سمجھنا قطعی دشوار نہیں جو مجھے اور میری شاعری کو تھوڑا بھی جانتے ہیں انہیں معلوم

ہے کہ ہدف میں نہیں۔ ایسا سمجھنا آپ کی سادگی اور حقیقت حال سے ناواقفیت ہے۔ راحت اندوری اتنا سہل نہیں میرے حضور!

☆ ابتدا میں کچھ لوگ بھانڈ، اداکار یا مسخرا کہہ کر آپ کو مشاعروں کے کھاتے میں ڈالا کرتے۔ آج کل وہی لوگ آپ اور آپ کی شاعری کو سراہتے نہیں تھکتے۔ تبدیلی کا سہرا آپ کو دیا جائے یا اُن لوگوں کو؟

☆☆ مجھے ان سب کرم فرماؤں سے ہم دردی ہے۔ ان کی مجبوری تھی۔ زمانے کا چلن ہے۔ آسمان قامت فن کاروں تک نے یہ سب بھوگا ہے۔

☆ ایک زمانے میں ترنم بھی آپ کا محبوب ہوا کرتا تھا۔ اس سے لاتعلقی کا سبب کیا بنا؟

☆☆ اگر آپ بے سُرے ہیں اور اس کے باوجود بھی گا رہے ہیں تو گناہ کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں نے اپنے سامعین پر یہ زیادتی زیادہ دنوں تک نہیں کی۔

☆ کچھ لوگ آپ کی شاعری کو بوتل میں بند شراب یا جامِ جم سے تعبیر کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ سادہ پانی اور شراب میں یہی فرق ہے کہ ایک سے پیاس بجھتی ہے دوسری سے نشہ ہوتا ہے۔ جب تک لوگ مجھے قریب سے جانتے سمجھتے نہیں۔ میری شاعری کا مزہ نہیں لے سکتے۔

مجھے قریب سے پڑھ سرسری نظر سے دیکھ
مری کتاب میں دل چسپیاں بھی آئیں گی

☆ وہ کون سے جتن ہیں جو آپ نے بھیڑ سے الگ نظر آنے کے لیے اپنائے اور کامیابی کا تناسب کیا رہا؟

☆☆ میری شناخت کا پہلا حوالہ مشاعرہ رہا۔ تقریباً ہر دوسری رات کسی نہ کسی شہر میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو شعر سناتے آدھی صدی گزر گئی۔ میری کوشش رہی کہ مجمع کا آخری شخص بھی میری زبان، میرا لہجہ اور میری شاعری سمجھنے میں دشواری محسوس نہ کرے۔ شاید اس کوشش میں میں بھیڑ میں رہ کر بھی بھیڑ سے الگ رہا۔

☆ آپ کی زندگی کے وہ کون سے نشیب و فراز ہیں جن کی پردہ کشائی کے لیے احباب بے قرار ہیں اور جن میں آپ کو روحانی اذیت کا سامنا بھی رہا؟

☆☆ ـ

اک تعلق ہے وضو سے بھی صبو سے بھی مجھے
میں کسی کام کو پردے میں نہیں رکھتا ہوں

☆ آپ کے ہاں کچھ ایسے تضادات بھی گزرے ہیں جن کو منظوم کرنا آپ کے لیے دشوار رہا؟

☆☆ میں نے جو محسوس کیا، جو مجھے نظر آیا میں نے لکھا کسی مصلحت، خوف یا اندیشے کے بغیر۔

☆ کچھ لوگ آپ کی شاعری کو ظالم اور جابر کے خلاف بتلاتے ہیں۔ آج کی نشست میں اُن ظالم اور جابر طبقات کی نشاندہی ضرور کیجیے؟

☆☆ ظالموں اور جابروں سے بحمد للہ دنیا بھری پڑی ہے۔ جغرافیائی حدود کی نشاندہی غیر ضروری ہے۔

☆ ترقی پسندی کے سیلاب کی نسبت آپ کا رویہ، رائے اور اثرات کی بابت تفصیل سے جاننا بھی ضروری ہے؟

☆☆ آپ نے ترقی پسندی کے سیلاب کی جانب اشارہ کیا تو جواباً عرض ہے کہ ہر ذی شعور ادب کا طالب علم یہی رائے رکھتا ہے کہ ترقی پسندی کے نام پر جہاں بہت آفتاب طلوع ہوئے وہیں ہماری وراثت کا بیش قیمت سرمایہ اس سیلاب کی نظر بھی ہوا۔ اثر پذیری کا جہاں تک تعلق ہے تو ایک وقت یہ تھا فن کاروں کا پورا کا پورا کارواں ترقی پسندوں کے قدم بہ قدم چلتا نظر آتا تھا۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ دھیرے دھیرے لوگوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وجوہات ہمیں معلوم ہیں۔ انجام کار اس کا حشر اور حال بھی سب کے سامنے ہے۔

☆ جدیدیت سے آپ کا تعارف کب اور کیونکر ہوا اور آپ نے اُسے کس طور اپنے کلام میں برتا؟

☆☆ ادب میں جدیدیت کی ابتدا تو برصغیر کی آزادی سے پہلے ہو گئی تھی۔ میں نے جب ہوش کے ناخن لئے جدیدیت عروج حاصل کر کے اچھی خاصی متنازعہ اور اپنے حامیوں کے ہاتھوں ہی رسوائی کا شکار تھی۔ بہر حال لکھنے والے اس سے متاثر بھی رہے اور بہتوں نے اسے فیشن کے طور پر اختیار کیا۔ میرا معاملہ یہ رہا کہ اقلیم ادب کے ہر پڑاؤ پر میری نظر رہی۔ تاثر قبول کیا مرعوب کسی سے کبھی نہیں رہا وہ کوئی تحریک ہے یا شخصیت۔

☆ نیچر کو گلے لگانے کی بات کا آپ نے کتنا اثر لیا اور اُس پر عمل کا طریقہ کار کیا ٹھہرا؟

☆☆ نیچر کا ذکر یا تصویر کشی یا کشش بدقسمتی سے میرے یہاں سرے سے غائب ہے۔ زندگی نے فرصت ہی نہ دی کہ شہری زندگی کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی الجھنوں سے فرصت ملے اور نیچر کی گود میں چند لمحے آرام کر سکوں۔

☆ آپ کے نزدیک اردو غزل کی روایات کیا ہیں یا ہونا چاہئیں نیز یہ کہ آپ کی غزل اُن معیار پر پورا اترتی ہے؟

☆☆ اردو شاعری کی روایت میں ہمیں بڑی رنگا رنگی ملتی ہے۔ عربی، فارسی پھر ہندی اور انگریزی شاعری سے اردو غزل نے اثر قبول کیا ہے۔ تاہم غالب روایت عشق، تصوف، رومانیت پھر اشتراکیت رہی ہیں۔ میری شاعری میں غالب رنگ مذکورہ روایات میں سے کس روایت کا ہے قاری اور ناقد بہتر طور سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں جب شعر کہتا ہوں تو قصداً کسی اسکول یا روایت کو پیش نظر نہیں رکھتا۔

☆ یہ رومانی تحریک کی گل افشانیاں کب، کہاں اور کس رنگ میں ظاہر ہوئیں۔ آپ اور آپ کے فن پر اس کے اثرات کس شکل میں ظاہر ہوئے؟

☆☆ ہمارے ادب میں رومانی تحریک میرے نزدیک دو وجوہات کی بنا پر رونما ہوئی۔ اولاً اصلاحی تحریک کے ردعمل کے طور پر دوئم مغربی شاعری کے زیر اثر۔ رومان، محبت عشق چونکہ ہماری شخصیت اور سماج میں خون کی طرح گردش کرتے ہیں لہٰذا ان سے دامن بچانا ناممکن ہے۔

☆ وسیم بریلوی صاحب کے بقول آپ ہمیشہ مصلحت سے بالاتر ہو کر بات کرتے ہیں کچھ شواہد دستیاب ہوں تو وسیم صاحب کی رائے میں وزن پیدا ہو سکتا ہے؟

☆☆ وسیم بھائی کے ساتھ برسوں سے مشاعروں میں شریک ہو رہا ہوں۔ ان کی رائے صائب اور ان کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ کچھ اشعار

اک حکومت ہے جو انعام بھی دے سکتی ہے
اک قلندر ہے جو انکار بھی کر سکتا ہے
وہ چاہتا تھا کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا
اب کہاں ڈھونڈنے جاؤ گے ہمارے قاتل
آپ تو قتل کا الزام ہمیں پر رکھ دو
خبر ملی ہے کہ سونا نکل رہا ہے وہاں
میں جس زمین پہ ٹھوکر لگا کے لوٹ آیا
مکاروں سے ناطہ توڑ سب کو چھوڑ
بھیج کمینوں پر لا حول، اللہ بول

☆ بشیر بدر صاحب آپ کی شاعری میں روحانیت کا حوالہ کس نسبت سے دے رہے ہیں؟

☆☆ بشیر بدر بحمداللہ بہ قید حیات ہیں۔ تاہم بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان سے بھی میرا پرانا ساتھ ہے۔ وہ مجھے اور میں انہیں خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا موصوف نے یہ رائے سنجیدگی سے ظاہر کی ہے۔

☆ عنوان چشتی صاحب نے ''نئی غزل کا قلندر'' آپ کی کن خدمات کے عوض ٹھہرایا ہے؟

☆☆ عنوان چشتی خود قلندر تھے۔ میری شاعری میں مصلحت اندیشی سے جو گریز نظر آتا ہے وہ غالباً اس سبب سے ہے کہ سود و زیاں کے اندیشے مجھے دل کی بات کہنے سے کبھی نہیں روک سکے۔

☆ عزیز خاں صاحب آپ کے ابتدائی سفر کو کنفیوژن اور تشکک سے پُر کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میرا داخلہ شاعری کے میدان میں ہوا۔ سارے قدیم و جدید شعرا میرے مطالعہ میں رہے۔ فنی باریکیوں، مضامین کی ندرت اور اظہار کے حیرت انگیز پیرائے یہ سب دیکھے اور پھر مشاعروں میں اک نئی طرح کی شاعری جس کا براہ راست تعلق عوام کی دل چسپی اور سائیکی سے رہا ہے۔ شاعری کی اس دور رسی، تاثیر، شدید اپیل اور مقبولیت نے مجھے حیران ہی نہیں کنفیوژن اور تشکیک میں بھی مبتلا کیا جس کا اثر میری ابتدائی شاعری میں ظاہر ہے۔ عزیز عرفان کی تنقید مجھے مبنی بر حقیقت نظر آتی ہے۔

☆ یہی صاحب آپ کے کلام کو عیوب سے پاک بتلا کر اگلے سانس میں اظہار کی گہرائی اور معنی کی تہہ داری سے مفقود کیوں بتلا رہے ہیں؟

☆☆ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ شعر تکنیکی عیوب سے پاک ہو کر بھی اظہار کی گہرائی اور معنی کی تہہ داری سے عاری کیوں نہیں ہو سکتا۔ گہرائی اور تہہ داری ہر شاعر کے ہر شعر میں کہاں ہوتی ہے۔ اور پھر عزیز عرفان میری شاعری کے ارتقائی سفر کے ابتدائی مراحل کی بات کر رہے ہیں۔

☆ آپ کا مخاطب عام آدمی ہے جو بے بس بھی ہے اور لاچار بھی۔ اُس کو متحرک کرنے کی بابت آپ کے ذہن نے کبھی نہیں سوچا؟

☆☆ ہر باشعور شخص عام آدمی سے ہم دردی رکھتا ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش رہتی ہے کہ مصیبت زدوں کے لئے راحت کی سبیل کرے۔ میرے ہاں متعدد اشعار اس قبیل کے مل جائیں گے جو عام آدمی کو دعوتِ عمل دیتے ہیں مثلاً:

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا
طوفان سے آنکھ ملاؤ، سیلابوں پر وار کرو
ملاحوں کا چکر چھوڑو، تیر کے دریا پار کرو
میں اپنا عزم لے کر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پر رکھی تھی قسمت گھر پہ رکھی تھی

☆ آپ پر Anti Establishment کا لیبل کس سبب چسپاں ہوا۔ Establishment کے ساتھ آپ کے تنازعات کب اور کیونکر نمایاں ہوئے اور اُن کی نوعیت کیا تھی؟

☆☆ میں نے کسی پروگرام یا ارادہ باندھ کر اینٹی اسٹیبلشمنٹ شاعری نہیں کی۔ ہمارے نظامِ حکومت اور ہمارے سماج میں رائج جبر، استحصال جس سطح پر ہے اس کے خلاف احتجاجاً اک ردعمل کے طور پر جو اشعار ہوئے انہیں آپ اس خانہ میں ڈال سکتے ہیں۔

☆ سامراج یا زردار نظام کے ٹھیکیداروں کی جب آپ بات کرتے ہیں تو نشانہ اُنہی قوتوں کی جانب ہوتا ہے جنہیں آپ بہ زبان دیگر للکار رہے ہیں۔ آپ کی للکار کا جواب کس شکل میں برآمد ہوتا ہے؟

☆☆ صدا بہ صحرا۔ سامراجیت منظم ہے اسے للکارنے والے غیر منظم۔

☆ براہِ راست قومی لیڈروں مثلاً واجپائی صاحب، لال کرشن ایڈوانی صاحب، سونیا گاندھی جی، راہول گاندھی جی کے علاوہ دیگر کا مضحکہ اڑانا ایک قومی شاعر کے شایانِ شان ہے کیا؟

☆☆ مشاعروں میں شعراء کو عوام کے جذبات کی نمائندگی کرنی ہوتی

ہے۔وہاں ذوق کی تہذیب کرنے کی گنجائش کم کم رہتی ہے۔

☆ سنا ہے آپ نے کچھ بحور، قافیے اور ردیف بھی ایجاد کیے ہیں۔ ہمارے قارئین کے لیے تفصیل بتلانا پسند کریں گے؟

☆☆ تجربات ضرور کیے ہیں۔ ایجاد ویجاد نہیں۔

☆ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ناقدینِ ادب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر شعرائے جدید کو اُس قدر توجہ کا مستحق نہیں گردانا جس قدر اُن کا استحقاق بنتا ہے؟

☆☆ یہ بحث پرانی ہے۔ میں نے کبھی کسی ناقد یا ادبی جریدے کے مدیر سے شکایت نہیں کی۔

☆ مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار پر آپ کی تشویش میں ہر سنجیدہ عاشقِ اردو برابر کا شریک ہے مگر یہاں آپ سے ایک سوال کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر پندرہ بیس شعراء میں اگر نصف سے زیادہ تعداد متشاعروں کی ہو تو آپ ایسے مشاعروں کا بائیکاٹ کیوں نہیں کرتے؟

☆☆ یہ مشکل سوال ہے۔ اصولاً یہ ہونا چاہئے۔ موجودہ منظر نامہ میں ایسا اقدام متشاعروں کے سامنے ٹوٹل سرنڈر کے مترادف ہوگا۔ مشاعرے کا اسٹیج انہیں سونپنے جیسا ہوگا۔

☆ جس مزاج اور معیار کی شاعری آج کل آپ کر رہے ہیں اُس کے بعد ہمارے لیے اس رائے پر یقین کرنا مشکل بھی ہے اور دشوار بھی کہ آپ کسی نظریے اور مسلک کے قطعی پابند نہیں؟

☆☆ جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں میں نے کبھی کسی نظریہ یا مسلک کا پابند ہو کر شاعری نہیں کی۔ یقین کرنا نہ کرنا آپ کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں۔

☆ ؎

اب کے جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہو گا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

بہت ہی سادہ معنوں میں اگر کہا جائے تو بھی شعر کو الارمنگ کہے بنا چارہ نہیں۔ اس قدر دوٹوک بات کرنے کے لیے یہ وقت مناسب ہے کیا؟

☆☆ میں نے جب اور جن حالات میں یہ شعر کہا اور پڑھا اس وقت یہ لاکھوں دلوں کی آواز تھی۔ اس میں منفی پہلو تلاش کرنا آپ کی سوچ اور اختیار پر منحصر ہے۔ مظلوم کے ارادے کے ذکر کے ساتھ ظالم کو تنبیہ بھی ہے کہ وہ باز رہے۔

☆ ؎

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

اس اندازِ تکلم کو مخاطب اگر دھمکی سے تعبیر کریں تو حق بجانب نہیں ہوں گے؟

☆☆ کمال ہے صاحب آپ اسے دھمکی سمجھ رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ نادانوں اور کوتاہ بینوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا ہے۔

☆ گزشتہ دنوں تو آپ نے جلتی پر تیل یہ کہہ کر ڈال دیا:

''ہندوستان کسی کے باپ کا تھوڑی ہے''

☆☆ آپ کو اگر کوئی اپنے گھر سے بے دخل کرنے کے درپے ہے تو اسے اسی انداز اور انہی الفاظ سے مخاطب کرنا ہر مظلوم کا حق ہے۔ مزید برآں یہ آواز آپ کو صرف مسلمان کی آواز کیوں لگ رہی ہے۔

☆ ایک طرف دنیا چہار جانب سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے دوسری طرف سب سے بڑے جمہوری ملک کا نہایت مشہور و معروف اور بلند قامت شاعر یہ تنبیہہ کرتا سنائی دیتا ہے ''کہ ڈرو اُس وقت سے جب یہ بائیس کروڑ پانچ وقت کے نمازی دہشت گرد بن گئے تو کیا ہوگا؟''

☆☆ اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

☆ جس قسم کا ماحول، فضا اور حالات آپ کی شاعری نے پیدا کر دیئے ہیں اُس کے ردِعمل میں ہندوستان کے بائیس کروڑ مسلمان، اُن کی زبان، تہذیب اور تمدن کی بابت ہر باشعور آدمی کو انتہا کی پریشانی ہے؟

☆☆ اک حقیقت جو میں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی غالب اکثریت سیکولر اور غیر متعصب ہے۔ یہ جو یہاں وہاں سے اشتعال انگیز آوازیں آتی ہیں یہ مٹھی بھر شرارتی ذہنوں کی حرکت ہوتی ہے۔ ہماری تہذیبی شناخت کو خطرہ فرقہ پرستوں سے کم ہمارے اپنے رویے اور بے عملی سے زیادہ ہے۔ اردو زبان سے دوری ہمارے تہذیبی ورثے سے دوری ہے۔ زبان، تہذیب کے لئے تشویش اور پریشانی راحت اندوری کی شاعری کے سبب سے نہیں۔ عام بے حسی اور بے عملی کے کارن ہے۔

☆ جمہوریہ ہند کی غالب اکثریت مغلوں اور دیگر مسلمان حکمرانوں کو ڈاکو اور لٹیروں سے تعبیر کرتے ہے جبکہ انگریزی سامراج کو صد فیصد آبادی ناجائز قابضین گردانتی ہے۔ آپ کی شاعری میں کون سے ماضی کا نوحہ تلاش کیا جائے؟

☆☆ عوام کی اکثریت کے بارے میں آپ کی رائے بے بنیاد ہے۔ NCERT (نیشنل کاؤنسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ) جو حکومت ہند کا ادارہ ہے اور جس کی مرتبہ کتابیں مرکزی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں (جنہیں انٹرنیٹ پر با آسانی دیکھا پڑھا جا سکتا ہے) اس میں مسلم حکمرانوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تہذیبی ارتقا میں ان کی حصہ داری کا اعتراف کھل کر کیا گیا ہے۔ اسی تناظر میں آپ کا دوسرا سوال غیر متعلق ٹھہرتا ہے۔ اور آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ہندوستان ہی نہیں آج ساری دنیا مسلمانوں کے لئے کربلا بنی ہوئی ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ آپ کا ہر احتجاج آپ کی کمیونٹی کو بند گلی میں دھکیل رہا ہے؟

☆☆ قطعی نہیں۔

باقی صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ کیجیے

''روشنی کی جنگ''

(جناب راحت اندوری کے غزلیہ کلام کی بہار)

فاری شا (راولپنڈی)

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری ہو گئے
باپ حاکم تھا مگر بیٹے بھکاری ہو گئے
دیویاں پہنچیں تھیں اپنے بال بکھرائے ہوئے
دیوتا مندر سے نکلے اور پجاری ہو گئے
روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں
چاند پاگل ہو گیا تارے بھکاری ہو گئے
رکھ دیے جائیں گے نیزے لفظ اور ہونٹوں کے بیچ
ظلِ سبحانی کے احکامات جاری ہو گئے
نرم و نازک ہلکے پھلکے روئی جیسے خواب تھے
آنسوؤں میں بھیگنے کے بعد بھاری ہو گئے

...... ○ ......

☆

سسکتی رت کو مہکتا گلاب کر دوں گا
میں اس بہار میں سب کا حساب کر دوں گا
میں انتظار میں ہوں تو کوئی سوال تو کر
یقین رکھ میں تجھے لا جواب کر دوں گا
ہزار پردوں میں خود کو چھپا کے بیٹھ مگر
تجھے کبھی نہ کبھی بے نقاب کر دوں گا
مجھے بھروسہ ہے اپنے لہو کے قطروں پر
میں نیزے نیزے کو شاخِ گلاب کر دوں گا
مجھے یقین کہ محفل کی روشنی ہوں میں
اسے یہ خوف کہ محفل خراب کر دوں گا
مجھے گلاس کے اندر ہی قید رکھ ورنہ
میں سارے شہر کا پانی شراب کر دوں گا
مہاجنوں سے کہو تھوڑا انتظار کریں
شراب خانے سے آ کر حساب کر دوں گا

○

☆

آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو
راہ کے پتھر سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں منزلیں
راستے آواز دیتے ہیں سفر جاری رکھو
ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو
آتے جاتے پل یہ کہتے ہیں ہمارے کان میں
کوچ کا اعلان ہونے کو ہے تیاری رکھو
یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو
یہ ہوائیں اڑ نہ جائیں لے کے کاغذ کا بدن
دوستو مجھ پر کوئی پتھر ذرا بھاری رکھو
لے تو آئے شاعری بازار میں راحتؔ میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

○

☆

اجنبی خواہشیں سینے میں دبا بھی نہ سکوں ایسے ضدی ہیں پرندے کہ اڑا بھی نہ سکوں

پھونک ڈالوں گا کسی روز میں دل کی دنیا یہ ترا خط تو نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں

مری غیرت بھی کوئی شے ہے کہ محفل میں مجھے اس نے اس طرح بلایا ہے کہ جا بھی نہ سکوں

پھل تو سب میرے درختوں کے پکے ہیں لیکن اتنی کمزور ہیں شاخیں کہ ہلا بھی نہ سکوں

اک نہ اک روز کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا تجھ کو ٹھوکریں زہر نہیں ہیں کہ میں کھا بھی نہ سکوں

...... ○ ......

☆

اندھیرے چاروں طرف سائیں سائیں کرنے لگے
چراغ ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنے لگے
ترقی کر گئے بیماریوں کے سوداگر
یہ سب مریض ہیں جو اب دوائیں کرنے لگے
لہو لہان پڑا تھا زمیں پر اک سورج
پرندے اپنے پروں سے ہوائیں کرنے لگے
زمیں پر آ گئے آنکھوں سے ٹوٹ کر آنسو
بری خبر ہے فرشتے خطائیں کرنے لگے
جھلس رہے ہیں یہاں چھاؤں بانٹنے والے
وہ دھوپ ہے کہ شجر التجائیں کرنے لگے
عجیب رنگ تھا مجلس کا خوب محفل تھی
سفید پوش اٹھے کائیں کائیں کرنے لگے

○

☆

اب اپنی روح کے چھالوں کا کچھ حساب کروں
میں چاہتا تھا چراغوں کو آفتاب کروں
مجھے بتوں سے اجازت اگر کبھی مل جائے
تو شہر بھر کے خداؤں کو بے نقاب کروں
اس آدمی کو بس اک دھن سوار رہتی ہے
بہت حسین ہے دنیا اسے خراب کروں
ہے میرے چاروں طرف بھیڑ گونگے بہروں کی
کسے خطیب بناؤں کسے خطاب کروں
میں کروٹوں کے نئے ذائقے لکھوں شب بھر
یہ عشق ہے تو کہاں زندگی عذاب کروں
یہ زندگی جو مجھے قرض دار کرتی رہی
کہیں اکیلے میں مل جائے تو حساب کروں

○

☆

وہ اک اک بات پہ رونے لگا تھا　سمندر آبرو کھونے لگا تھا
لگے رہتے تھے سب دروازے پھر بھی　میں آنکھیں کھول کر سونے لگا تھا
چراتا ہوں اب آنکھیں آئنوں سے　خدا کا سامنا ہونے لگا تھا
وہ اب آئینے دھوتا پھر رہا ہے　اسے چہرے پہ شک ہونے لگا تھا
مجھے اب دیکھ کر ہنستی ہے دنیا　میں سب کے سامنے رونے لگا تھا

...... ❍ ......

☆

اندر کا زہر چوم لیا دھل کے آ گئے
کتنے شریف لوگ تھے سب کھل کے آ گئے
سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بے وقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آ گئے
مسجد میں دور دور کوئی دوسرا نہ تھا
ہم آج اپنے آپ سے مل جل کے آ گئے
نیندوں سے جنگ ہوتی رہے گی تمام عمر
آنکھوں میں بند خواب اگر کھل کے آ گئے
سورج نے اپنی شکل بھی دیکھی تھی پہلی بار
آئینے کو مزے بھی تقابل کے آ گئے
انجانے سائے پھرنے لگے ہیں ادھر ادھر
موسم ہمارے شہر میں کابل کے آ گئے

❍

☆

تیری ہر بات محبت میں گوارا کر کے
دل کے بازار میں بیٹھے ہیں خسارہ کر کے
آتے جاتے ہیں کئی رنگ مرے چہرے پر
لوگ لیتے ہیں مزا ذکر تمہارا کر کے
ایک چنگاری نظر آئی تھی بستی میں اسے
وہ الگ ہٹ گیا آندھی کو اشارہ کر کے
آسمانوں کی طرف پھینک دیا ہے میں نے
چند مٹی کے چراغوں کو ستارہ کر کے
میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تم نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارہ کر کے
منتظر ہوں کہ ستاروں کی ذرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پر بلا لوں گا اشارہ کر کے

❍

☆

اگر خلاف ہیں ہونے دو جان تھوڑی ہے	یہ سب دھواں ہے کوئی آسمان تھوڑی ہے
لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں	یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے
میں جانتا ہوں کہ دشمن بھی کم نہیں لیکن	ہماری طرح ہتھیلی پہ جان تھوڑی ہے
ہمارے منہ سے جو نکلے وہی صداقت ہے	ہمارے منہ میں تمہاری زبان تھوڑی ہے
جو آج صاحبِ مسند ہیں کل نہیں ہوں گے	کرایہ دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے
سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں	کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

...... O ......

☆

صرف خنجر ہی نہیں آنکھوں میں پانی چاہیئے
اے خدا دشمن بھی مجھ کو خاندانی چاہیئے
شہر کی ساری الف لیلائیں بوڑھی ہو چکیں
شاہزادے کو کوئی تازہ کہانی چاہیئے
میں نے اے سورج تجھے پوجا نہیں سمجھا تو ہے
میرے حصے میں بھی تھوڑی دھوپ آنی چاہیئے
میری قیمت کون دے سکتا ہے اس بازار میں
تم زلیخا ہو تمہیں قیمت لگانی چاہیئے
زندگی ہے اک سفر اور زندگی کی راہ میں
زندگی بھی آئے تو ٹھوکر لگانی چاہیئے
میں نے اپنی خشک آنکھوں سے لہو چھلکا دیا
اک سمندر کہہ رہا تھا مجھ کو پانی چاہیئے

O

☆

اسے اب کے وفاؤں سے گزر جانے کی جلدی تھی
مگر اس بار مجھ کو اپنے گھر جانے کی جلدی تھی
ارادہ تھا کہ میں کچھ دیر طوفاں کا مزہ لیتا
مگر بے چارے دریا کو اتر جانے کی جلدی تھی
میں اپنی مٹھیوں میں قید کر لیتا زمینوں کو
مگر میرے قبیلے کو بکھر جانے کی جلدی تھی
میں آخر کون سا موسم تمہارے نام کر دیتا
یہاں ہر ایک موسم کو گزر جانے کی جلدی تھی
وہ شاخوں سے جدا ہوتے ہوئے پتوں پہ ہنستے تھے
بڑے زندہ نظر تھے جن کو مر جانے کی جلدی تھی
میں ثابت کس طرح کرتا کہ ہر آئینہ جھوٹا ہے
کئی کم ظرف چہروں کو اتر جانے کی جلدی تھی

O

غزل کا ساراجہان

ندافاضلی

(●)

ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر اندور میں ایک سیمینار اندورلٹرری فورم کی جانب سے منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر ایک تنقیدی مضامین کی کتاب '' لمحے لمحے'' ''ڈاکٹر راحت اندوری شاعر اور شخص'' کی رسم اجراء بھی ہوئی۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر بشیر بدر، ندافاضلی، اقبال مسعود، راجستھان پتریکا کے شاہد مرزا اور مدھیہ پردیش وقف اور جیل منسٹر عقیل صاحب نے راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر بولتے ہوئے ندا فاضلی صاحب نے کہا۔۔ آپ اور میں جس ملک میں رہ رہے ہیں اس ملک میں کیا ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے اس کو آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔ یہ ہمارا پیارا ملک جو کبھی 1984ء کی دہلی ہے تو کبھی 1992ء کا بمبئی تو کبھی گجرات اور گودھرا۔ یہ ملک پچھلے کئی سالوں سے کئی اندھیری گپھاؤں سے گزر رہا ہے اور دور دور کہیں روشنی نظر نہیں آ رہی ہے۔

یہ ملک کہیں آنسو ہے کہیں فریاد ہے، کہیں دنگا ہے کہیں فساد ہے۔ یہ ملک سیاست کے ہاتھوں برباد ہے۔ ایسے کٹے پھٹے روتے چیختے، بسورتے دیس میں جب کبھی تاج محل کی یادگار پر چودھویں کا چاند جگمگاتا ہے یا کسی ماں کی گود میں بچہ مسکراتا ہے یا لتامنگیشکر کی آواز میں سر جگمگاتا ہے یا اندور جیسے خوبصورت شہر میں کسی شاعری کی اچھی اور سچی شاعری کا جشن منایا جاتا ہے تو میرا وشواس انسان کی انسانیت پر مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹا سا وشواس زندگی کا بہت بڑا احساس ہے۔ میرا یقین ہے ننھا سا دیا پہاڑ بھر اندھیرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

میں بمبئی میں مصروف زندگی جی رہا ہوں۔ میرے لیے وقت نکالنا خاص طور سے آج کل مشاعروں کے لیے بھی مشکل ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے یہاں آنا تھا میں آیا اور آ کر مجھے واقعی بہت اچھا لگا۔ اس کے لیے میں بدھائی دینا چاہتا ہوں میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ راحت اندوری کا اور ان کے ساتھیوں کا جنہوں نے آج کی محفل کو سجایا اور دنیا کو یہ دکھایا کہ زندگی صرف آتنک وادیا لڑائی نہیں وہ عشق کی گہرائی بھی ہوتی ہے دل کی انگڑائی بھی اور راحت اندوری کی غزل سرائی بھی۔

غزل ایک ودھا کا نام ہے ایک صنف کا نام ہے، جس کو نہ کسی سرحد نے کاٹا نہ کبھی بارڈر نے اکھاڑا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں اٹل بہاری کا صرف ہندوستان ہے، مشرف کا صرف پاکستان، کسی کا صرف افغانستان، کسی کا صرف ایران لیکن راحت اندوری کی غزل کا سارا جہان ہے۔

غزل بھید بھاؤ نہیں کرتی۔ یہ سیاست کی طرح انسان کو دھرم، ذات، علاقہ یا بھاشا سے نہیں پہچانتی۔ یہ تو انسان کو اس کی انسانیت سے جانتی ہے۔ غزل کیا ہے غزل کیوں ہے غزل کیسی ہے یہ زندگی سے گفتگو کرتی ہے، راحت اندوری کے لفظوں میں یا عورت سے بات چیت کرتی ہے نقادوں کی زبان میں، یہ آلو چکوں یا نقادوں کی بحث کا موضوع ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ غزل جہاں بھی ہو محبت کی زبان ہوتی ہے وہ پورا ہندوستان ہوتی ہے اور سارا جہان ہوتی ہے۔

غزل کی تاریخ بہت طویل ہے اس تاریخ کو سات سو یا ساڑھے سات سو سال کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس ساڑھے سات سو سال میں غزل کی ابتدا کا سراغ، شروعات کے نقش ہمیں چودہ صدی کے درمیان میں ملتے ہیں۔ یہ غزل آستانہ محبوب سبحانی حضرت نظام الدین اولیاء کے شاگرد امیر خسرو کی دین ہے جنہوں نے اس عہد میں ہند آریائی دو تہذیبوں کے ملاپ سے غزل کا ایک تجربہ کیا تھا وہ نمونہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک ہی مصرعہ میں آدھا فارسی اور آدھا ہندوستانی زبان کو جوڑا تھا۔ یہ جوڑنے کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیونکہ آج کل جوڑا نہیں جا رہا بلکہ توڑا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

''زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارد اے دل تو میں ہوں کا ہے لگائے چھتیاں''

تیرہ چودہ صدی کی اس پہلی تجرباتی غزل سے راحت اندوری کی غزل تک غزل کئی موڑوں سے گزری ہے۔ کئی منزلوں کو اس نے پھلانگا ہے اور راستے کی کڑی دھوپ چھاؤں اس نے دیکھی۔ اس غزل نے کہیں دھوپ کا ساتھ نبھایا تو کبھی چھاؤں کو آئینہ دکھایا، کبھی مندر میں مورتی کے سامنے سر جھکایا یا کبھی سیاست کی چکی پیستے ہوئے عوام کے ساتھ روئی ہے کبھی دوسروں کو رلایا ہے۔ یہی غزل امیر خسرو سے گول کنڈا آتی ہے تو اس کا روپ ہوتا ہے:

پیا باج پیالا پیا جائے نہ
پیا باج اک پل جیا جائے نہ

اور

غزل نینی تجھے مستی سہاوے
کہ تجھ نیناں نہ اٹھتے چاند تارے

اور اس کے بعد جب گول کنڈا سے احمد آباد یا اورنگ آباد آتی ہے جہاں اس کے مزار کی پہچان کچھ سال پہلے کی گئی تھی اور یہ خوش خبری میں آپ کو دوں کہ وہ مقدس قبر جو غزل کے پہلے شاعر کی قبر ہے وہ آج فساد کی آگ میں جھلس کر ایک جنگل بن گئی ہے۔ جو دیس اپنی پرمپرا کا احترام نہیں کرتا جو اپنی تاریخ کی عزت نہیں کرتا جو اپنی سامو ہک سنسکرتی کا آدر نہیں کرتا اس دیس کو میں اٹل بہاری کے لفظوں میں کہوں تو مجھے اب ''سارے جہاں سے اچھا'' کہنے میں، گانے میں،

سنانے میں شرم آتی ہے۔ یہ ولی کا ایمان ہے اور یہ ہندوستان کا ایمان ہے۔ یہ صرف ہندوستان کا ایمان نہیں یہ آپ کے اور میرے انسان ہونے کا ایمان ہے۔

یہ کون کر رہا ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے، یہ کس لیے ہو رہا ہے؟ بازار میں بنے بنائے فسادات پالیتھین کی تھیلیوں میں ملتے ہیں۔ جب الیکشن آتے ہیں وہ دو دن، چار دن یا آٹھ دن کا فساد خرید لاتے ہیں۔ عوام کو نچاتے ہیں اور خود انسان کا خون بہاتے ہیں۔ آج سے شاید 50 سال پہلے جگر مرادآبادی نے ایک شعر کہا تھا:

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانے
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

لیکن حضور جگر صاحب نے جب یہ شعر کہا تھا اس وقت محبت شاید اتنی طاقتور ہوگی جو سیاست کے بغیر بھی اپنی حفاظت کر سکتی تھی۔ مجھے حضرت نظام الدین اولیاء کا عہد یاد آ رہا ہے جب حضرت امیر خسرو ایک دن گزارش لے کر آئے بادشاہ وقت اور محبوب سبحانی سے کہا کہ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ وہ فقیر سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ جب خسرو نے زیادہ اسرار کیا کہ بادشاہ وقت کی گزارش ہے مل لیجیے تو نظام الدین اولیاء نے فرمایا خسرو تم ہمیں عزیز ہو تم چاہتے ہو تو بادشاہ کو بلاؤ۔ یاد رکھو فقیر کی خانقاہ میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے بادشاہ آئے گا دوسرے دروازے سے فقیر نکل جائے گا۔ لیکن جرأت اور انکار کی ہمت یہ طاقت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ اس کے لیے غالب نے دل برداشتہ کی شرط رکھی تھی۔ اس کے لیے اس نے کہا تھا:

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اس کے لیے اس سَنت کے لفظ کی شرط ہے جس نے کہا تھا:

انو بھوٗ گاوے سوراگی ہے

کبیر داس نے کہا تھا:

کبیرا کھڑا بازار میں لئے لوگاں کی ہار
جو گھر جالے آپ نا وہ چلے ہمارے ساتھ

اس کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا ''اندھیرا چاہے کتنا بھی بلوان ہو روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔ میں نے محسوس کیا کہ راحت اندوری کی شاعری کے پیچھے جو انکاری طاقت ہے جو ٹکرانے کی ہمت ہے وہ بادشاہ کے آگے سر نہ جھکانے کی شان و شوکت ہے۔ اس نے اس کے لفظوں کو چوکا یا ہے سجایا ہے:

جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

جہاں تک سوال ہے شاعری کا، شاعری کیا ہے اور کیسی ہونی چاہیے میں دو اور دو چار کی طرح نہیں بتا سکتا کہ کون سی شاعری اچھی ہے اور کون سی بری۔ راحت اور تنقیدی مضامین کی کتاب لمبے لمبے میں نقادوں نے بڑے جملے تراشے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ وہ جملے اچھے ہیں کہ سچے ہیں کہ نہیں۔ لیکن میں بہت انکسار سے ایک بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ ''اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں''۔ دوسری بات یہ کہ ہر عہد میں میں نے محسوس کیا کہ اور اگر آپ تاریخ پڑھتے ہیں تو آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ پڑھے لکھوں کی رائے کو ہمیشہ عوام کی معصومیت نے رد کیا ہے۔ کبیر داس کو آپ نے چار سو سال تک ادب کے محل میں داخل نہیں ہونے دیا لیکن وقت انتظار کر رہا تھا اور وقت نے دانشوروں کو نقادوں کے فیصلوں کو رد کر کے یہ بتایا کہ جو شاعر اپنے کو جاہل کہتا تھا وہ شاعر کتنا بڑا ہے۔ جنہوں نے گیتا نجلی پڑھی ہے وہ جانتے ہوں گے کہ کبیر کس طرح سے رویندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی پر حاوی ہے۔ رویندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز مل جاتا ہے۔ کون فیصلہ کرے گا۔ جو کبیر کے عہد میں فیصلے کر رہے تھے وہ کبیر کو جاہل ٹھہرا رہے تھے۔ وہ بہت پڑھے لکھے پنڈت تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بشیر بدر میر تقی میر کی بات کر رہے تھے۔ میر تقی میر کے بڑھاپے کا جوان شاعر ہے نظیر اکبرآبادی۔ میر جب ''نکات الشعراء'' لکھ رہے تھے تو انہوں نے ہر چھوٹے بڑے شاعر کا ذکر کیا لیکن نظیر اکبرآبادی اس میں سے غائب ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عہد اپنے تعصّبات سے Condition ہوتا ہے۔

پچھلے کچھ دن پہلے Times of India میں ایک ایڈیٹوریل میں لکھا گیا تھا کہ دنیا کے سو بڑے رائٹرس نے مل کر کسی ایک کتاب کا انتخاب کیا ہے جو بڑی کتاب ہے۔ اس مقابلے میں جو نام تھے ان میں شیکسپیئر بھی تھے، ٹالسٹائے کا وار اینڈ پیس بھی تھا اس میں ملٹن بھی تھے اس میں کالیداس بھی تھے اس میں غالب بھی تھے لیکن سب کتابوں کو رد کر کے جس کتاب کا نام لیا گیا وہ پرتگال کے ایک رائٹر کی ہے جس نے بہلاوے کے طور پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا ڈان کویٹزوٹ۔ یہ کیسے فیصلے ہیں یہ فیصلے کیوں ہوئے نقاد کہاں آئے نقاد کیسے پچھڑ گئے۔ نظیر اکبرآبادی، میر تقی میر جیسے خدائے سخن کی Conditioning میں فٹ نہیں ہوتے تھے۔ میر کہتے تھے:

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

Soft آوازیں Soft alphaets نغمگی، شائستگی کا شاعر میر اور اس کے عہد کے اس جوان شاعر نے یہ کہا کہ:

ہم کو تو چاند میں نظر آتی ہیں روٹیاں

تو میر تقی میر گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو شاعری ہی نہیں ہے۔

لیکن جب جینیس آتا ہے کسی Field میں کسی Stage پر تو وہ اپنے عہد میں بھلے ہی بھلا دیا جائے بھلے ہی نکارا جائے لیکن History اور وقت کھڑے ہو کر اور ہار پھول لے کر انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ جینیس آئے گا اور اسے یہ ہار پہنایا جائے گا اور نظیر اکبرآبادی اب ہندوستان میں اردو شاعری اور نظم کے ایسے بانکے سجیلے شاعر ہیں جو اپنی جگہ اکیلے ہیں۔ اور ان سے بڑا شاعر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ نظیر نے دوسرے شاعروں کی طرح دربار میں بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے دوسرے شاعروں کی طرح غزل کے پاؤں میں گھنگھرو نہیں باندھے۔ اس نے

بندر پر بھی لکھا اس نے ککڑی پر بھی لکھا،''جو جوتے چرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی'' لکھا اور اپنی نظم بنائی، اپنی غزل بنائی۔

ہر چیز شاعری کا موضوع بن سکتی ہے شرط یہ ہے کہ اس چیز سے رشتہ قائم اور جب یہ رشتہ قائم ہوتا ہے تو مجنوں کی نظر میں لیلیٰ پوری کائنات بن جاتی ہے۔غالب فرماتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

میں راحت اندوری کو سلام پیش کرتا ہوں میں ان کی لسانی جرأتوں کو سلام کرتا ہوں۔میں سلام کرتا ہوں اس احساس کو جس نے اپنے بات کا انگرکھا پہن کر آپ کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے ناپ کے لفظوں میں کپڑے خود بنوائے۔

مجھے یاد آ رہا ہے اردو وہ پہلا شاعر جس کی قبر احمد آباد میں منہدم کر دی گئی اس کی زندگی کا ایک سفر بہت اہم ہے اور وہ سفر ہے دہلی کا۔اس زمانہ میں ہوائی جہاز نہیں تھا اس زمانہ میں موٹر نہیں تھی سائیکل بھی نہیں تھی۔بیل گاڑی سے سفر کیا جاتا تھا۔وہ شاعر تھا ولی۔ولی سے پہلے دہلی غزل کی ودھا سے محروم تھی۔ولی کا سفر ہے ولی جا رہے ہیں سورج غروب ہوتا ہے ولی ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں رات بتانے کے لیے بیل کے سامنے چارا رکھا ہے۔سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے ولی کی آنکھ کھلتی ہے ولی تیار ہو کر باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں سامنے پیپل کی چھاؤں تلے ایک سادھو سواری لگائے بیٹھا ہے ولی نے پوچھا یہ راستہ کدھر جاتا ہے اس نے آنکھ کھولی اور کہا ہر راستہ دل کی اور جاتا ہے۔۔۔پوچھا کہاں سے آرہے ہو بولے گجرات سے۔۔۔پوچھا کہاں جا رہے ہو۔۔۔بولے دلی۔سادھو نے کہا صوفی بدیع الدین کے گجرات سے آرہے ہو اور نظام الدین کی دہلی جا رہے ہو۔ولی دہلی گئے عہد تھا اورنگ زیب کا اور ان کا جو گورنر تھا وہ ولی کا host تھا۔گورنر نے کہا میں آپ کا استقبال کرتا ہوں پوری دہلی اور دہلی والے آپ کا اور آپ کی غزل کا انتظار کر رہے ہیں۔ولی نے کہا دہلی اور دہلی والوں کو انتظار کرنے دو ہم پہلے اس سے ملیں گے جس سے ملنے آئے ہیں۔گورنر کو خیال آیا شاید وہ اورنگ زیب سے ملنا چاہتے ہیں۔اس نے کہا کیا ذل سبحانی سے وقت لے لوں آپ کے ملنے کا۔تو ولی نے کہا گورنر صاحب آپ بھول رہے ہیں کہ دہلی کسی بادشاہ اورنگ زیب کی نہیں ہے۔وہ فقیر نظام الدین کی تھی اور ہے۔۔۔اور اس نے ایک جملہ اور کہا کہ تلوار کو زنگ کھا جاتا ہے پیار سدا جگمگاتا ہے۔

راحت اندوری کی شدت نے، غصہ نے، تلخی نے لفظوں کے کھردرے پن میں وہی محبت شامل کی ہے جو ایک اچھے انسان کو دوسرے انسانوں سے ہوتی ہے اور یہی طاقت اس کی شاعری کی طاقت ہے۔

بقیہ : براہِ راست

☆ بابری مسجد کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔کیا واقعی یہ مسجد رام مندر کو منہدم کر کے تعمیر کی گئی تھی۔آج کے عدم برداشت کی فضا میں اس مسئلے کا کوئی مثبت حل نکالا جا سکتا ہے؟

☆☆ شکر ہے یہ قضیہ اب عوام کی پنچایت سے نکل کر عدالت عالیہ میں زیر غور ہے۔ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے مجھے کہنے دیجئے کہ وہاں کا ہر فیصلہ ماننے کے لئے میں پابند ہوں۔

☆ اگر ہم عالمی منظر نامے پر نظر دوڑائیں تو تمام تر ہلچل، بے چینی، ظلم اور زیادتی صرف اُنہی علاقوں میں ہے جہاں مسلمان اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔ایسی صورت میں آپ مسلمان قوم کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں اور اُن کی رہنمائی کے لیے کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ میرے نزدیک اس کی بڑی وجہ اکثر ریاستوں میں جمہوری حکومتوں کا نہ ہونا ہے۔خاندانی اور آمرانہ حکومتیں اپنے آقاؤں کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو ماننے پر مجبور ہیں۔مغربی طاقتیں اس صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔مسلم ریاستوں میں آپسی عناد اور نفاق پھر خود غرضی کے سبب حالات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔دیکھیے ملیشیا کو۔جمہوری حکومت ہے چین اور جاپان کے زیر اثر ہے نہ مغربی ممالک کے۔دہشت گردی کی تاریخ پر نظر کریں تو افغانستان سے روس کو بے دخل کرنے کی خاطر پاکستان کا استعمال کیا گیا۔پاکستان کا استعمال جنرل ضیا کی عافیت سے مشروط تھا۔یہ دو محاذوں پر مہلک ثابت ہوا۔نتیجتاً حکومت کی بے دخلی اور مغربی خصوصاً امریکی مداخلت کو فری لائسنس۔دیکھیے امریکہ نے تب سے آج تک اپنا ہولڈ کس قدر بڑھا لیا ہے کہ پاکستان کی خود مختاری پر بن گئی ہے۔

افسوس کہ ہماری کوتاہ بین اور خود غرضی مغرب کی عیاری کو دیکھتے سمجھتے ہوئے بھی اس سے صرفِ نظر کرنے پر مجبور ہے۔

مسلم قوم کی رہنمائی کے لئے کیا کہوں......! شہریار مرحوم کا شعر ہے

زندگی جیسی نئے شام و سحر بدلا کی
آنکھ کا کام تھا بس دیکھنا سو دیکھا کی

''غزل آسمان ہوجائے''

ڈاکٹر محبوب راہی
(ممبئی، بھارت)

ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ محض مشاعرہ کا شاعر نہیں ہے۔۔۔اس اجمالی کی تفیصل کے لیے راحت اندوری ہی کے ایک شعر سے اپنی بات شروع کرتا ہوں۔

تمام عمر گزرنے کے بعد دنیا میں
پتہ چلا ہمیں اپنے فضول ہونے کا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے کہ مصداق گزشتہ چند دنوں میں راحت کے بیشتر اشعار پڑھ کر لگا کے یہ تو میرا خیال تھا۔راحت کے دل میں کیسے آ گیا۔میرا احساس تھا راحت کو کیونکر محسوس ہوا۔میرا تجربہ تھا راحت اس سے کس طرح گزرا۔میری بات تھی راحت کی زبان پر کیسے آ گئی۔میرا زخم تھا راحت کو ٹیس کیوں محسوس ہوئی۔میرا شعر تھا راحت کے نوک قلم تک کس طرح آ گیا۔عمر کی سات سرد گرم دہائیاں جھیل جانے کے بعد آپ آٹھویں دہائی میں کہ چل چلاؤ کی گھڑیاں قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔لگ رہا ہے کہ زندگی کا بیشتر حصہ خود غلط فیصلے کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے اور ان کے ''گندم از گندم بروید جواز جو'' کے خدائی فیصلے کے تحت غلط نتائج بھگتنے میں گزر گیا۔اب کہ لمحات کی چڑیاں عمر کا سارا کھیت چگ چکی ہے پچھتا رہے ہیں۔فی الوقت عمر بھر غلط نہج پر فیصلوں کی نتائج کی روشنی میں اپنے فضول ہونے کے اعتراف کا موقع نہیں ہے۔اس وقت تو مجھے اپنے اس فیصلے کی غلطی کا اعتراف کرنا ہے جو راحت اندوری کو محض مشاعرے کا شاعر سمجھتے ہوئے تمام تر ادبی زندگی میں مجھ سے سرزد ہوتی رہی ہیں۔چلتے چلاتے اس غلطی کا جواز بھی پیش کرتا چلوں۔میرے تجزیے کی روشنی میں گزشتہ ڈیڑھ دوسو برسوں میں کم وبیش ہر دور میں اردو شعراء ایک خاموش سمجھوتے کے تحت دو گروہوں میں منقسم رہے ہیں۔جن میں ایک کی مشاعروں سے وابستگی رہی تو دوسرے کی رسائل وجرائد سے۔مشاعروں والا گروہ تو عوامی شہرت ومقبولیت کے وسیلوں سے اپنی فتوحات کی سرحد میں وسیع سے وسیع تر کرنے کی تگ ودو میں دنیا ومافیہا حتیٰ کہ دن بدن فزوں تر شعری معیارات کی زوال پذیری اور ادبی حرمتوں کی پامالی نیز پرواز کی گمشدگی سے بے نیاز شہرت کی ہواؤں میں اڑتا رہا۔ادھر اپنے بیشتر مفادات کی محرومی سے دل برداشتہ رسائل وجرائد سے وابستہ دوسرے گروہ کے بیشتر شعراء (بالاستثنائے چند) معیارات کی دہائی دیتے ہوئے، مشاعرے کے شعراء کے نام پر ناک بھویں چڑھاتے، طنز وتشنیع کے تیر برساتے ہوئے مشاعروں سے دور اپنے معیاری ادب کے گھروں میں جلتے کڑھتے رہے۔اس طرح دونوں گروہوں کے مابین حد فاصل فزوں اور مستحکم ہوتی گئیں۔میری وابستی بیشتر رسائل وجرائد سے رہی۔مشاعروں میں بھی آنا جانا ہوتا رہا۔راحت اندوری کی طرح ابتدا ترنم سے بھی پڑھا۔بعدہ تحت الفاظ میں بھی زور آزمائی کی لیکن فطری عدم مناسبت اور ذہنی عدم آہنگی کی وجہ سے بات کچھ بنی نہیں۔راحت اندوری سے اولین ملاقات ۱۹۷۷ء جشن واصل جناب (پرنسپل حبیب عالم کے والد مرحوم) کھنڈوہ کے کل ہند مشاعرے میں ہوئی۔اس کے بعد وقفے وقفے سے موصوف سے ملاقاتوں کے سلسلے رہے لیکن جہاں تک ان کے میرے مابین ہم رشتگی کا معاملہ ہے نقار خانے کی گھن گرج میں طوطی کی آواز والی مناسبت رہی۔البتہ راحت جب بھی ملے میری ادبی سرگرمیوں سے کامل واقفیت کے ساتھ۔محض ان مشاعرہ باز شعراء کی طرح نہیں جو عدم واقفیت کی بنا پر عندالملاقات نام، کام اور پتہ ٹھکانہ پوچھتے ہیں۔پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون کے مصداق۔۔۔راحت اندوری کے ساتھ علیک سلیک سے آگے تعلقات کے چند قدم نہ بڑھنے کی بظاہر کوئی خاص وجہ مشاعروں کے مروجہ معیارات اور تقاضوں سے عدم مطابقت کی بنا پر میری مشاعروں سے وابستگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اسے اس یک طرفہ غیر ارادی یا لاشعوری ردعمل سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔جو ترسیل وابلاغ کے اس عوامی وسیلے سے دوری کے نتیجے میں رسائل وجرائد سے وابستہ شعراء کی جانب سے کبھی ببانگ دہل اور کبھی سرگوشیوں میں تحریری یا تقریری صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھ کر میں بھی مروجہ مشاعروں کے تنزل پذیری معیارات اور متعلقہ بدعنوانیوں کے خلاف اکثر ڈھول پیٹتا رہا ہوں۔اور خدا جھوٹ نہ بلوائے راحت اندوری کو ڈرامہ باز، نوٹنکی وغیرہ سے موسوم کرنے والوں کی ہاں میں ہاں ملانے کا گناہ مجھ سے بھی سرزد ہوتا رہا ہے۔لہٰذا جیسا کہ آغاز کلام میں عرض کر چکا ہوں زندگی بھر کئے جانے والے غلط فیصلوں میں راحت کو محض مشاعرے کا شاعر سمجھتے رہنے کا فیصلہ بھی ہے کہ شیشۂ ذہن کو مشاعرہ بازوں کے تعلق سے بدگمانیوں نے جو غبار آلود کر رکھا تھا اسے صاف کر کے راحت اندوری کے تخلیقی خدوخال کی تب وتاب دیکھنے کی نہ مہلت نصیب ہوئی اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور دھند کی تہیں دبیز سے دبیز ہوتی چلی گئیں۔وہ تو اللہ عمر خضر عطا فرمائے چھیاسی سالہ حضرت رازؔ بالاپوری کو کہ پچھلے دنوں ان کے تازہ ترین شعری مجموعے ''طلوعِ شب'' کے اجراء وجشن راز کے تحت بالاپور میں انعقاد پذیر کل ہند مشاعرے میں فرزند رازؔ منظور ندیم نے حسب روایت مجھے بھی مدعو کیا جس کی صدارت کا بار سبک راحت اندوری کے دوش توانا پر تھا جو موصوف کو پہلی بار سنجیدگی سے سننے سنانے کا سبب ہوا۔راحت اندوری نے بطور خاص حضرت رازؔ، بشیر نواز، ہیچمند اں کی موجودگی میں ''دھندا نہیں کروں گا'' کہتے ہوئے جب اپنا اعلیٰ وارفع منتخبہ جو الگ باندھ کر رکھا تھا کلام سنا کر توقع بلند آہنگی کے ساتھ خلاف توقع پر وقار سنجیدگی اور متانت کے باوجود مشاعرے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔اختتام مشاعرہ پر جی کھول کر داد دیتے ہوئے میں نے موصوف کے شعری رویوں کے تعلق سے کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کی۔جس کے مثبت جواب میں موصوف نے اپنا شعری مجموعہ ''ناراض'' اور ''لمحے لمحے'' بدایوں کی طارق شاہینؔ اور عزیز عرفانؔ کی مرتبہ پونے پانچ سو صفحات کی ضخامت پر مبنی تصنیف ''راحت اندوری شاعر اور شخص'' مجھے مرحمت فرمائی۔اب جو پہلے ''ناراض'' اور پھر ''راحت اندوری شاعر اور شخص'' کے باب یکے بعد دیگر وا ہوتے ہیں اور صفحہ در صفحہ شعر در شعر، مصرع در مصرع، سطر در سطر، فقرہ در فقرہ اور لفظ ان دونوں تصانیف

سے گزرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو منزل بہ منزل، گام بہ گام، لحمہ بہ لحمہ ایک جہان حیرت واستعجاب کا سامنا ہوتا ہے۔ راحت اندوری کے تعلق سے قائم کردہ اپنے پچاس سالہ نظریاتی قلعوں کو یکے بعد دیگر انہدام پذیر ہوتے محسوس کرتا ہوں۔ جب راحت کے گلستان اشعار سے روش درروش گزرتا ہوں تو ہر شعر ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاویں جاست'' کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہوں۔ جب لفظوں کی گہرائی میں جھانکتا ہوں تو تہہ در تہہ معنی ومفہوم کے نو بہ نو جہانوں سے ہوتا ہوا گنجینۂ معنی کے طلسم تک پہنچ کر اپنے دامن خیال کو گوہر افکار سے مالا مال کر لیتا ہوں۔ اپنی سابقہ سوچوں پر احساس ندامت ہوتا ہے کہ محض۔۔۔تو گڑیا ہے، بڑھیا ہے۔۔۔وغیرہ جیسی بازاری آوازوں کے فریب میں مبتلا ہو کر میں بھی راحت کو سستے مشاعرہ بازوں میں شمار کر بیٹھا تھا۔ جب کہ موصوف خود اس بازاری پن سے اظہار بیزاری کرتے رہتے ہیں:

لے تو آئے شاعری بازار میں راحت میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

اور وہ خود آئے دن:

ادب کہاں کا کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعروں میں تماشے مداریوں والے

لہٰذا وہ خود اپنے بیشتر مشاعرہ باز ساتھی متشاعروں پر طنز کرتے رہتے ہیں:

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

اور جبکہ وہ خود ایک انٹرویو کے دوران مشاعروں میں جاری وساری بدعنوانیوں کے تعلق سے واضح طور پر اعتراف بھی کر چکے ہیں کہ ''مشاعرہ ایک کاروبار بن چکا ہے'' اگر کسی مشاعرہ میں پندرہ شعراء کی فہرست ہے تو اس میں دس متشاعر ہوتے ہیں۔ یہی حال شاعرات کا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں ان گنت شاعرات ہیں لیکن مشکل سے گنی چنی چند خود شعر کہتی ہیں۔ لہٰذا خود ان کا (راحت کا) مشورہ ہے کہ ''ادب کی اس دنیا میں جو گندگیاں روز بہ روز اپنے پاؤں پسار رہی ہے انہیں روکنے کی کوشش کریں ورنہ شاعری مشاعرے اور ادب کے نام پر گہری تاریکیوں کے علاوہ دور دور تک کچھ بھی نہیں دکھائی دے گا'' علاوہ ازیں انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ:

مسائل، جنگ، خوشبو، رنگ، موسم
غزل اخبار ہوتی جا رہی ہے

لہٰذا انہوں نے حرمت غزل کے تحفظ کے لیے اپنا سب کچھ خون کے آنسوؤں کی شکل میں نچھاور کر دیا ہے اور فارسی زدگی سے محفوظ اردو کے سبک لفظ ومعنی کی امانت سنبھالتے ہوئے پتھروں کو بھی پانی کر دیا ہے۔ نیز جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو غزل کا نام دے کر رات بھر کی کروٹوں کا ذائقہ منظوم کرتے رہے ہیں۔ بلندی فکر کی خواہش اور پرواز تخیل کی بیکرانی کے باوجود ان کی غزل اپنے گردوپیش کے روزمرہ معاملات اور معمولات سے وابستہ زمینی مسائل سے انہیں پابستہ رکھتی ہے۔

میں چاہتا تھا غزل آسان ہو جائے
مگر زمین سے چپکا ہے قافیہ میرا

زمین سے وابستگی اور زمینی مسائل سے پیوستگی کے باوجود انہیں زبان کی عصمت دری اور بے حرمتی کر کے اس کی مٹی پلید کرنا گوارا نہیں ہے۔

میں جاہلوں میں بھی لہجہ بدل نہیں سکتا
میری اثاث یہی شین قاف ہے جانی

جاہلوں سے سابقہ پڑنے کے بعد بھی اپنے لب ولہجہ کی انفرادیت، زبان کے تقدس، بیان کی پاکیزگی اور فن کی حرمت وعصمت کا تحفظ کرنے اور اپنے شین قاف کے اثاثے کے غنیمت جاننے والے راحت اندوری کے سامنے پھر پتہ نہیں وہ کون سی ایسی مجبوری ہے جو وہ آئے دن کھلی آنکھوں سے متشاعروں، متشاعرات، گلے بازوں، ادارکاروں اور مداریوں کی غلط کاریوں کے تماشے دیکھتے رہے ہیں۔ اور باوجود قدرت کے ادب میں روز بہ روز پاؤں پسارتی ہوئی گندگیوں کے سد باب کے لیے کوئی میسر اقدام نہیں کرتے۔ جبکہ ان کی عقیدت مند منتظمین مشاعرہ ان کی ہر جنبش مژگاں پر سب کچھ نچھاور کر کے ہر الٹ پھیر کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ انہیں کسی کی خوشامد یا چاپلوسی کی قطعی احتیاج نہیں کہ شہرت و ناموری میں انہیں کے ہم قامت منور رانا کے بقول ''راحت مملکت شاعری کا بے تاج بادشاہ ہے وہ مشاعروں کی ضرورت نہیں مشاعروں کا وقار ہے، وہ سنگ میل نہیں سنگ بنیاد کا روپ دھار چکا ہے جس پر تعمیریں تو کی جا سکتی ہیں اسے اکھاڑ کر نہیں پھینکا جا سکتا'' راحت اندوری کو خود بھی اپنی قیمت وقامت کا بخوبی اندازہ ہے۔ تب ہی تو وہ انتہائی خود اعتمادی کے لہجے میں کہتے ہیں:

میں نے ملکوں کی طرح لوگوں کے دل جیتے ہیں
یہ حکومت کسی تلوار کی محتاج نہیں

اور مشاعروں کی تاثر انگیزی کی لامحدودیت کے تعلق سے ان کی یہ امید افزا دل خوش کن نوید کہ:

روز آباد نئے شہر کیا کرتی ہے
شاعری اب کسی دربار کی محتاج نہیں

اپنے البیلے بانکے، ترچھے تیوروں، تلخ وترش اور کھٹے میٹھے لہجے، بلند آہنگ للکارتی ہوئی پر اعتماد، مبارزت طلب مجاہدانہ آواز اور ہڑبڑا کر جگا دینے والے بلالی انداز سے قلب وجگر شکار کرنے والا اشہب فکر مہمیز کرتا ہوا میدان شاعری کا یہ شہسوار ایشیائی ممالک میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑتا فتح مندیوں کے پرچم لہراتا، کروڑہا کروڑ شائقین شعر وادب کے قلوب واذہان کو اپنے پر تمکنت انداز دل ربائی کی سحر آفرینیوں سے مسخر کرتا ہوا یورپ، امریکہ اور افریقہ کے براعظموں میں جہاں جہاں مشاعروں کی محفلیں برپا ہوتی ہیں وہاں وہاں اردو شاعری کی مقبولیت اور محبوبیت کے سکے جاری رکتا ہوا کراچی پاکستان کے تاریخی نوعیت کے ایک عظیم الشان اور عدیم المثال عالمی مشاعرے میں لاکھوں سامعین

کے جم غفیر میں ہندوستانی مشاہیر مدعو شعراء کے علاوہ پاکستانی احمد فرازؔ، افتخار عارفؔ، منیر نیازیؔ، قتیل شفائیؔ، شہزاد احمد، سلیم کوثرؔ اور امید فاضلیؔ وغیرہ کی موجودگی میں جب للکارتا ہوا اپنا یہ شہرۂ آفاق شعر پڑھتا ہے:

اب کہ جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

تو بقول راحت ''مشاعرے میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا شعر کئی کئی بار پڑھوایا گیا اخبار ''جنگ'' سے متعلق ایک شخص اسٹیج پر چڑھ آئے اور انہوں نے مجھے بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ بہت سے اخبارات نے میرے شعر کی سرخیاں لگائیں۔''

راحت اندوری کا تحت الفظ کا والہانہ طلسماتی انداز جس کے ملک زادہ منظور احمد (جنھوں نے اپنی سوانح ''رقص شرر'' میں اردو مشاعروں کی پوری تاریخ رقم کرتے ہوئے گذشتہ صدی کا پورا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے کہ وہ مشاعروں کے سب سے ممتاز ناظم مشاعرہ رہے ہیں) کے بقول راحت اندوری بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ جن کے شعر خوانی کے انداز کو ملک زادہ نے آغا حشر کے ڈراموں کے کرداروں کے مماثل بتایا ہے۔ نیز ترقی پسند تحریک کے سرخیل وامق جونپوری نے جسے حسیاتی، شکاری چیتے کو لوچ اور کوبرا کے کرائٹ کو ڈس لینے کی کوشش کے عمل اور پیچ و تاب سے تعبیر کیا ہے اور رفعت سروش نے راحت کے انداز پیش کش کو کسی تیز شراب کی بوتل کا کاک اڑ جانے کے بعد شراب کے ابلنے اور سامعین کے نشے میں ڈوب جانے کا منظر پیش کیا ہے۔ زبیر رضوی نے راحت کی نشتریت، ڈرامائی انداز، آواز کے زیر و بم اور لہجے کی نشاندہی کی ہے جبکہ مظفر حنفی کانپور میں اپنی زیر صدارت منعقدہ مشاعرے میں راحت کے شعر پر:

دھوپ اور چھاؤں کے مالک میرے بوڑھے سورج
میرے سائے کو میرے قد کے برابر کر دے

لکھا ہے کہ ''مشاعرہ بارود کے ڈھیر کی طرح اُڑ گیا۔ عوام انہیں مشاعروں کا بے تاج بادشاہ یوں ہی نہیں کہتے۔ مائک پر ہوتے ہیں تو لگتا ہے پستول پر گھوڑا چڑھا ہوا ہے۔''

راحت اندوری کی مشاعروں میں تاریخ ساز کامیابی کے اعتراف میں چند مزید ارباب نقد و بصیرت، اکابرین ادب کی گراں قدر آراء کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

''راحت اندروری ایک ایسا بادل ہے جو گرجتا ہی نہیں برستا بھی ہے۔ اس کی شاعری میں مشاعرے کے زہریلے تالاب میں اٹھنے والی کرب انگیز موجوں کا رقص بھی ملتا ہے'' (عنوان چشتی)

''راحت نے ایک ایک شاعر کو چیخنا سکھایا ہے۔ مردانہ وقار اور بلند آہنگی کا لبادہ پہنایا ہے۔ اس کا شعر سامع کی روح کو بیدار کرتا ہے۔'' (قیصر الجعفری)

''ان کی گھن گرج محفل شعر ہی میں نہیں بلکہ کل ہند مشاعروں میں دلوں کو دہلا دیتی ہیں۔'' (رؤف خیر)

''راحت جس لمحے اپنے شعر کے قافیے پر پہنچتے ہیں تو گویا ایک بم پھٹ پڑتا ہے اور سارا مشاعرہ ان کی مٹھی میں سما جاتا ہے'' (مضطر مجاز)

''شکاری چیتے کا لوچ تیز شراب کی بوتل کا کاگ اڑنا، بارود کے ڈھیروں کی طرح مشاعرہ اڑ جانا، بم کی طرح پھٹ پڑنا، گھن گرج سے دلوں کو دہلا دینے والے بے باک اور سفاک لہجے کی زبان زد خاص و عام اشعار سے راحت کی شاعری بھری پڑی ہے انتخاب سخت مشکل ہے تاہم کوشش کرتا ہوں۔

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کے
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پر بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہو گئے

تم اپنی سربلندی پر ہو نازاں
میاں! قیمت یہاں دستار کی ہے

دربدر جو تھے وہ دیواروں کے مالک ہو گئے
میرے سب دربان درباروں کے مالک ہو گئے

اور ان تمام اشعار کیا راحت کے ابلتے جذبوں، اچھلتے خون اور دہکتے احساسات سے چھلکتے اس رنگ آہنگ کے زادہ، متحرک اور ولولہ انگیز اشعار کو محض اس لیے مشاعرے کے اشعار کا لیبل چسپاں کر کے ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جائے گا کہ یہ مشاعروں کی چھتیں اڑا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ مشاعرے کے اشعار ہیں لیکن مشاعرے کے معیار کو ایک مستحکم اور روشن پہچان عطا کرنے والے ہیں۔

راحت اندوریؔ کو محض مشاعروں کے شاعر کی تہمت لگا کر ٹاٹ باہر نہیں رکھا جا سکتا کہ انہوں نے ادب پڑھایا ہی نہیں پڑھا بھی ہے۔ وہ بڑبولے پن کے خمار میں میر و غالب کو ''وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے'' کہہ کر تالیاں نہیں پٹواتے۔ میر و غالب و یگانہ جیسے یگانۂ روزگار فن کاروں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی فنی جہتوں میں نو بہ نو وسعتوں اور اضافوں کے امکانات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ مثال کے لیے راحت کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

غالبؔ بھی ہے بچپن بھی ہے شہروں میں
مجنوں بھی ہے لیکن پتھر غائب ہیں

کون؟ وہ مرزا اسد اللہ خاں
مجھ سے وہ تنہائی میں اکثر کھلا

یہ تو میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ وغیرہ کی ادبی روایت سے وابستگی یا استفادہ کا نام بہ نام راست اظہار ہوا۔ راحت نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کا احاطہ کیا ہےاس سے ان کے مطالعے کی وسعت، تجربات کی کثرت، فکر ونظر کی بلوغت ونتائج اخذ کرنے میں ان کی ذہانت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ عالم بالخصوص تاریخ اسلام کے مدوجذر، عروج وزوال اور فتح وشکست کے تمام مناظر گویا ان کی آنکھوں کے سامنے تیرتے رہتے ہیں۔ جنھیں حسب موقع ومحل وہ اپنے اشعار میں منعکس کرتے رہتے ہیں۔ محض ایک مصور اور کیمرا مین کی طرح نہیں بلکہ ان میں ان کے شدت احساس کے لہو ریز رنگوں کی بھی شمولیت ان کی تاثر انگیزی کو دوبالا کر دیتی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری ہو گئے
باپ حاکم تھا مگر بیٹے بھکاری ہو گئے

چلو دیوان خاص اب کام آیا
پرندوں کا ٹھکانہ ہو چکا ہے

میری گم گشتگی پر ہنسنے والو
میرے پیچھے زمانہ چل رہا ہے

اسلامی تاریخ کے عروج وزوال اور ملت اسلامیہ کے حالات کی اتھل پتھل کے علاوہ راحت کی شاعری کا ایک اہم موضوع سیاست بالخصوص ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کی لعنتوں پر نشتر زنی بلکہ شمشیر زنی ہے۔ ملاحظہ کیجیے چند مثالیں:

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

سڑک پر وردیاں ہی وردیا ں ہیں
کہ آمد پھر کسی تہوار کی ہے

اور لال کرشن اڈوانی کو ٹارگیٹ بنا کر تخلیق کی گئی یہ غزل جسے علی سردار جعفری فرمائش کر کے بار بار سنتے تھے:

اس کونے سے اس کونے تک دعوے داری سائیں کی
آسانی سے ٹھیک نہ ہو گی یہ بیماری سائیں کی

کھیت لہو سے ہم نے سینچے اور فصلوں پر حق اس کا
روزہ رکھنے والے ہم ہیں اور افطاری سائیں کی

یہ پوری غزل اور پچھلے صفحات پر بے باک اور سفاک لہجے کی زبان زد خاص وعام کے تحت مثالوں میں سے بیشتر اشعار راحت اندوریؔ کے احتجاجی لہجے کے ذیل میں آتے ہیں جو موصوف نے ملکی سیاست کی بدعنوان اور فرقہ پرستانہ روش کے ردعمل میں تخلیق کیے ہیں۔ ویسے راحت کی کثیر الجہات شاعری کو کسی ایک خانے یا چند شعروں میں رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں اکثر کچھ لکھنے سے پہلے عنوان قائم کر لیا کرتا ہوں۔ راحت اندوریؔ پر لکھنے سے قبل اس رنگ کا شاعر اس لہجے کا شاعر۔ جیسے بیسیوں عنوانات سوچ کر رد کر دینے پڑے کہ موصوف کی شاعری ہر متعینہ عنوان سے باہر نکل پڑتی تھی۔ بالآخر محولہ بالا اعترافی عنوان متعین کرنا پڑا۔ راحتؔ کی شاعری بیک وقت تاریخ، سماجیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات اور مذہبیات وغیرہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ موصوف نے ان تمام اجزائے ترکیبی کے متوازن امتزاج سے ایک بالکل نیا لب ولہجہ اور اچھوتا رنگ وآہنگ ایجاد کیا ہے۔ جس پر میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ اور شادؔ کی انانیت پسندی اور آتش کے سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ اقبال کی مقصدیت آمیز داخلیت اور مسائل حیات وکائنات کے اشتراک باہمی سے رچے بسے بے تکلف واشگاف انداز اور اپنے ہم عصروں میں مظفر حنفی کے طرز سے منفرد لب ولہجے کی چھاپ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنا ایک ایسا لہجہ اور آہنگ اختیار کیا ہے جو ان کا اپنا لہجہ ان کا اپنا آہنگ ہے جس کا تلخی آمیز کھٹا میٹھا ذائقہ نہیں ان کے ہم عصروں میں سب سے الگ تھلگ ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ راحت نے اپنے دامن فکر کو ہر ہنگامی تحریک، وقتی رجحان یا گروہی نظریے کی آلودگی سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنے گرد وپیش لحہ لحہ درپیش اپنے روزمرہ معاملات اور معمولات پر مبنی زمینی مسائل کی ترجمانی سے اپنے تخلیقی وجود کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔

راحت اندوریؔ کے مشاعرے میں پیش کش کے منفرد انداز پر مضطر مجازؔ نے لکھا ہے۔

''راحتؔ پہلے تو شعر کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں اور بڑی جادوگری کے ساتھ اسے پورے مشاعرے پر چادر کی طرح پھیلا دیتے ہیں'' شعر کو اپنے اوپر مسلط یا طاری کرنے کے تعلق سے خود راحت اندوریؔ کا خیال ہے کہ

کاغذ کو سب سونپ دیا یہ ٹھیک نہیں
شعر کبھی خود پر بھی طاری کیا کرو

کاغذ سے اپنی بے نیازی کا اظہار راحتؔ نے اور بھی کئی جگہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر شعر ہے تو چاہے مشاعروں کے ذریعے آئے یا کاغذ کے راستے سے آئے اپنا مقام ضرور بنائے گا۔''

''میری غزل یا تو میرے لیے ہوتی ہے یا میرے سامعین کے لیے۔ قارئین (سکہ بند رسالوں والے سے میرا رشتہ کچھ خاص گہرا نہیں ہو پاتا جس کا مجھے افسوس نہیں۔''

ترسیل وابلاغ کے اس اہم وسیلے یعنی پرنٹ میڈیا کے تعلق سے راحت اندوریؔ نے اپنی بے نیازانہ روش کا اظہار اپنے کئی اشعار کے ذریعے بھی

کیا ہے۔ مثلاً

لوگ ہونٹوں پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں مجھے
میری شہرت کسی اخبار کی محتاج نہیں

اس تعلق سے اپنی رائے پیش کرنے سے قبل راحت کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

اس ضمن میں خاکسار کا شعر ہے:

ایسے ویسوں کو بھی کیا کیا نہیں لکھا ہم نے
ہم ہیں جیسے ہمیں ویسا نہیں لکھا جاتا

اب نہ تو میں اپنے آپ کو ایسے ویسوں میں شمار کرتا ہوں اور نہ راحت اندوری ایسے ویسے ہیں لہٰذا جیسے واقعتاً وہ نہیں انہیں ویسا لکھنے کے ساتھ کچھ رائے دینے کا حق بھی مجھے حاصل ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ راحت کے سیکڑوں اشعار ان کے کروڑہا کروڑ سامعین لاکھ اپنے ہونٹوں پر سجائے پھرتے ہوں۔ انہوں نے ملکوں کی طرح چاہے جتنے لوگوں کے دل جیتے ہوں اگر رسائل و جرائد کے قارئین سے تاہنوز ان کا رشتہ کچھ خاص گہرا نہیں ہو پایا تو اس کا انہیں افسوس بھلے ہی نہ ہو۔ اب ان ساری باتوں سے اپنی بے نیازانہ روش کو ترک کر کے پرنٹ میڈیا سے اپنے تخلیقی رشتوں کو استوار کرتے ہوئے رسائل و جرائد میں اشاعت کلام پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ان کی آواز لاکھ متاثر کن ہو۔ اپنے لب و لہجے کی تمام گھن گرج اور انداز بیان کی سحر انگیز دلکشی یہ سارا طلسم ایک مدت گزرنے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ رسائل و جرائد اور کتابوں میں وہ آئندہ کئی صدیوں تک محفوظ ہو جائیں گے کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کے باوجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت کو اب بھی تسلیم کیا جا رہا ہے اور آئندہ بھی اس کے مکمل طور پر رد کرنے کے امکانات کم ہیں۔ اس لیے بھی کہ راحت مشاعر کے بلا مبالغہ سب سے بڑے شاعر ہونے کے باوجود محض مشاعرے کے شاعر نہیں ہیں۔ اعلیٰ و ارفع معیار کے حامل سنجیدہ ادب میں بھی وہ ایک مقام و وقار و اعتبار کے مستحق ہیں جس کے حاصل نہ ہونے میں ان کی بے نیازانہ روش کا بھی کچھ کچھ عمل دخل ہے۔ تنقید میں بھلے ہی بقول راحت ہر دور میں کئی بد دیانتیاں قلانچیں بھرتی پھرتی ہیں۔ تنقید کی ناہمواریوں کے تفصیلی ذکر سے بھلے ہی دفتر تیار ہو جائیں لیکن تنقید راحت کی فکری جولانیوں، فنی رنگارنگیوں اور تخلیقی جدت طرازیوں سے صرف نظر ہرگز نہیں کر سکتی بشرطیکہ اسے متوجہ کرنے کی طرح متوجہ کیا جائے۔

مظفر حنفی نے راحت کو فراق کے بعد اسٹیج پر شعر کی تصویر بن جانے والے دوسرے شاعر سے موسوم کیا ہے۔ قمر رئیس ان کی شاعری کو نئی کمان کا تیر سے مشابہ قرار دیتے ہیں جو جدید میزائلوں کی طرح اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ وسیم بریلوی نے انہیں میزائیلی لہجے اور تیزابی تیور کا فنکار کہا ہے جو اپنی شعلہ بیانی سے اقتدار کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت رکھتا ہے۔ اختر نظمی انہیں تلخ اور درشت لہجے سے خود اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے والا بتاتے ہیں جبکہ نظام صدیقی انہیں نئے عہد کی غزلیہ تخلیقیت کے آبنوسی گلاب سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے راحت کو غزل کا جیون ساتھی قرار دیا ہے جبکہ اسعد بدایونی کو ان کے بنیادی مزاج میں عصری صداقتوں اور سفاکیوں کے بیباکانہ اظہار کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اندوری راحت کی شاعری میں عصبیت کے خلاف اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر للکارتے لہجے کو تلوار کی کاٹ بنا کر لفظوں کی تیزی سے دماغوں کو جھنجھوڑ دینے، مردہ طبیعتوں کی افسردگی دور کرنے، شعلہ بیانی، بلند آہنگی، احتجاجی روش اور برہنہ گفتاری جیسے نمایاں اوصاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صلاح الدین نیر نے انہیں شعلے اگلنے والا، آتش زور آور آندھی کی طرح فضا کو تہہ و بالا کرنے والا صبا رفتار سیلاب، تیغ آبدار، طمطراق، دبدبہ اور باغیانہ بانکپن والے امڈ امڈ کر برسنے والے بادل۔ برق باراں جیسی کیفیات کا حامل شاعر قرار دیا ہے جبکہ اقبال مسعود ان کی احتجاج کی آواز کو ایک مسلسل چیخ سے تعبیر کرتے ہیں جو نعرہ ہے نہ پاگل پن۔ یہ چیخ مزاحمتی شاعری کی صورت میں شہر شہر گلی گلی پھیلی ہوئی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔ عشرت ظفر ہر محاذ پر شمشیر بکف راحت کی غزل کو عصری نظام کا کرب اور خندہ استہزا قرار دیتے ہیں۔ شکیل گوالیاری نے راحت کی غزل کو چاق و چوبند پھرتیلی اور منہ پھٹ سے موسوم کیا ہے۔ شاعر جمالی انہیں قلم کو سینۂ باطل کے لیے نیزے کی طرح استعمال کرنے والا جرأت انکار کا شاعر کہتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید عارفی نے انہیں ایک نئے ذائقے کا شاعر قرار دیا ہے جو معاشرتی نظام کے تضادات، زندگی کی تلخیوں، حالات کی سنگینیوں، بے ثباتی اور بے یقینی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ معراج فیض آبادی نے انہیں بائیں کاندھے کا فرشتہ جبکہ طارق شاہین نے قدیم و جدید رویوں کا نقطہ اتصال قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر خالد حسین راحت کی زبان میں متانت، بیان میں شدت، اظہار میں جسارت اور اسلوب میں لطافت و نزاکت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ راہی شہابی نے راحت کو اپنے عہد کے ساتھ آنے والے وقتوں کا بھی سرمایہ قرار دیا ہے۔ واجد قریشی نے انہیں عصری حسیت کا شاعر اور ان کی شاعری کو ساعتوں اور جسارتوں کی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں جو تمام معیاروں پر کھری اترتی ہے۔ واصف فاروقی نے ان کی شاعری کو ہوش و حواس اور وجدان کو مسخر کرنے والی آواز قرار دیا ہے۔ اثر صدیقی انہیں عبقری اور منفرد غزل گو نیز اردو کا ایک غیور اور نابغۂ روزگار سخنور کہتے ہیں۔ احمد کلیم فیض پوری معنویت کی گہرائی کو راحت کا شیوہ شاعری قرار دیتے ہیں جبکہ جوہر کانپوری انہیں اپنا آئیڈیل تسلیم کرتے ہیں۔ سید محمد عقیل کی رائے میں ان کی شاعری میں ''برہنہ گفتاری کے ساتھ ساتھ تہہ داریاں بھی ہیں جو کیفیت اور حالات کی بے رحمیوں کو سمیٹ کر راحت کی شاعری میں متحرک ہو گئی ہے۔ ایسی شاعری محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوا کرتی اس لیے زندگی کی سخت و صعب راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔'' ترقی پسند تحریک کے سرخیل علی سردار جعفری نے راحت کا شعری رشتہ قرون وسطیٰ کی شاعری سے ملایا ہے۔ اور آخر میں طنز و ظرافت کے نابغۂ روزگار شاعر مرحوم ساغر خیامی کی سنجیدگی اور متانت کی حامل اس رائے کو بجائے مقطع پیش کرتا ہوں کہ ''اس صدی میں جینے والے قابل تحسین و مبارکباد ہیں کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جس میں راحت اندوری جیسا شاعر اپنی پوری ادبی تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔

غزل کا ارتقائی سفر

ڈاکٹر عزیز عرفان
(اندور، بھارت)

اردو غزل کے احیاء کی روایت راحت کے بہت قریب کی روایت تھی اس شاعری کا راحت کی غزل گوئی پر گہرا اثر ہے۔راحت نے ہماری روایتی شاعری (کلاسیک) کا بغور اور عمیق مطالعہ کیا۔ظاہر ہے ایک فنکار کی حیثیت سے مطالعہ اثر انگیزی پر ختم ہوتا ہے۔ پھر وہ دور بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہا جب غزل قابلِ گردن زدنی ٹھہری اور شعراء کو یہ تنبیہہ اور تاکید کی گئی کہ فرسودہ موضوعات سے دست بردار ہو کر نیچر کو گلے لگائیں یا معاشرتی اصلاح کی بات کریں۔اس تحریک کے ردِعمل کے طور پر رومانوی تحریک کی گل افشانیاں بھی دیکھیں اور پھر غزل کا احیا اقبال کا عروج وغیرہ ہر دور اور ہر نوع کی شاعری زیرِ مطالعہ رہی بعد ازاں ترقی پسندی نام کا سیلاب بھی کہ جس نے ہر روایت اور ماضی کے ہر بت کو منہدم کر کے بالکل نئے خطوط پر شعر وادب کی بنیاد رکھی اس ملبہ سے سر اٹھاتی ہوئی جدیدیت کا دور راحت کی شاعری کے ابتدائی دور سے جا ملتا ہے۔گویا راحت کی شاعری کا خمیر جس مواد سے اٹھا اس میں شاعری کے ہر دور ہر رنگ کی آمیزش ہے۔ یہاں نہ کوئی مخصوص نظریہ ہے نہ کسی نظریہ کی تردید نہ روایت کی خالص تقلید ہے نہ روایت سے کلی بغاوت نہ جدیدحسیت شاعری کا لازمی عنصر ہے نہ اس سے روگردانی کوئی شرط۔اس نسل کے نمائندہ شعراء کے لیے اب بھی بزرگوں کے وضع کردہ اصول موجود ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے مسلک کا تعین کر لیتے ہیں۔ان اصولوں کے مطابق چل کر یا انہیں رد کر کے، روحانیت کی نفی کر کے مادیت کی پناہ لینے، حال سے بے اطمینانی کی صورت میں ماضی یا کسی خیالی مستقبل میں عافیت تلاش کرنے۔غمِ روزگار سے فرار حاصل کر کے غمِ جاناں یا غمِ جاناں سے دست بردار ہو کر غمِ دوراں کو اپنانے کی روش یا اشتراکیت سے برگشتہ ہو کر اشتراکیت دشمنی کو اپنا مطمعِ نظر بنانے کا رویہ۔گویا کہ ہر نوع کی فکر و نظریہ کے نمائندہ اشعار سے راحت اندوری کے دور کی شاعری عبارت ہے۔

راحت ایک عام انسان کی طرح زندگی کے ناہموار راستے کے مسافر ہیں۔ان کی ابتدائی زندگی بھی ظاہر ہے ایسی ہی ناہمواریوں سے الجھتے گزری۔ لیکن تجسس کی انفرادیت اور اشیا اور عوامل کے رموز سے تجربات اخذ کرنے کی ان کی صلاحیت انہیں بھیڑ سے جدا کرتی ہے۔لہٰذا عام رہ کر عوام سے منفرد اور مختلف بن جاتے ہیں۔

راحت کی شاعری کی ابتدا سادگی اور سنجیدگی کی فضا میں وجود میں آئی۔مطالعہ، مشاہدہ اور دور اندیشی کے ساتھ زمانے کے حوادث اور نشیب و فراز رفتہ رفتہ ان کے تجربہ کا حصہ بنتے گئے جس نے ان کی شاعری کو اعتبار کی دولت سے ثروت مند کیا۔

راحت کی شاعری کی ابتدا 1970ء سے ذرا پہلے ہوئی لہٰذا 80-1970ء کے دہے میں ارتقا کی منازل طے ہوئیں۔اس دہے میں راحت نے بہ حیثیت شاعر اپنی شناخت قائم کر لی تھی۔متفرق موضوعات اور مختلف مزاج کے حامل اشعار بھی ہمیں ابتدائی برسوں میں مل جاتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے راحت نے بڑی تیز رفتاری سے ارتقا کا سفر طے کیا۔ایک حیرت زدہ بچے کی طرح ہر منظر اور ہر دل کش شے کو دیکھنا، مشاہدہ کرنا پھر اسے نظم کرنا۔ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی برسوں میں شاعر متحیر و متجسس نظر آتا ہے۔مختلف النوع مظاہر بہ یک وقت راحت کی فکر اور ذہن و دل کو متاثر اور متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا کو درپیش ہر مسئلہ کا علم اور حل راحت کے پاس موجود ہے۔حل اگر نہیں ہے تو اک جھنجھلاہٹ ہے، جھلاہٹ ہے، برگشتگی ہے۔

دشمنوں کی کوئی بات تو سچی ہو جائے
آ مرے دوست کسی دن مجھے دھوکہ دے دے

سحر تک تم جو آ جاتے تو منظر دیکھ سکتے تھے
دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

تم تو سورج کے پجاری ہو تمہیں کیا معلوم
رات کس حال میں کٹ کٹ کے سحر ہوتی ہے

راحت کی شاعری کا خمیر اسی کنفیوژن کے ماحول سے اٹھا اس کے باوجود ان کا کلام بڑی حد تک ان عیوب سے پاک ملتا ہے۔بے تکلف بات کہنے کا وصف اور آپ بیتی کو شعر بنانے کا ہنر راحت کے یہاں موجود ہے گو کہ اظہار میں گہرائی اور معنی کی تہہ داری مفقود ہے۔اندور نے بڑی مضبوطی سے روایت کا دامن تھاما ہوا تھا۔بالخصوص سینئر شعراء کا وہ گروہ جو وسط ہند میں سرکردہ تصور کیا جاتا تھا اور جو مبتدیوں اور نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید تھا۔دوسری طرف عمیق حنفی، شمیم حنفی، وقار واثقی اور کچھ حد تک عزیز اندوری ہندوستان گیر جدید شاعری کی لہر سے آشنائی رکھتے تھے اور نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ گروہ بہت محدود افراد پر مشتمل تھا جس کا حلقۂ اثر محدود تر تھا۔

راحت ایک نو وارد ہونے کے سبب کسی مخصوص نقطۂ نظر سے خود کو مربوط نہ کر سکے لہٰذا متشکک اور کنفیوزڈ رہے۔راحت کی مشکل صحیح راہ کا تعین نہ کر پانا تھا وہ نہ تو اس گروہ کے ساتھ Identify کرنا چاہتے تھے جو سخت روایت پرست تھا اور بزرگوں کے راستے سے سرمو، روگرانی گوارا نہیں کرتا تھا۔ نہ ترقی پسندوں کے اس گروہ کے ساتھ خود کو کھڑا کرنا پسند کرتے تھے جو گو تھکا ماندہ تھا پھر بھی فعال ہونے کا سوانگ بھر رہا تھا۔نہ ہی راحت بھٹکے ہوئے بے راہ جدید شعراء کے ساتھ ہونے پر آمادہ تھے۔لیکن اسی دوران میں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''جدید تر شاعروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہو چلی تھی جو انکار و اثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ نسل نہ کافر ہے نہ مومن، نہ زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحیر اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے وہ انسان اور فطرت، ظاہر و باطن، غم اور مسرت، زندگی اور موت، کفر اور ایمان کے ناگزیر لیکن بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھ کر زندگی کے آہنگ کو سمجھنا چاہتی ہے۔''

راحت کا تعلق اسی نسل سے ہے۔ خود کو سنبھالنے اور سمیٹنے میں جسے پسینہ آ جاتا ہو ایسے ماحول میں فن کار کا اپنے حواس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ راحت اس میدان میں نسبتاً نو وارد تھے لہٰذا جذبات کو من عن بیان کرنا یوں بھی مشکل امر تھا۔ راحت کی یہ معذوری کوئی حیران کن عمل اس لیے نہیں ہے اظہارِ ذات فن کار کے لیے ہمیشہ ٹیڑھا مسئلہ رہا ہے۔ ذہن اور جذبات کو یکجا کر کے تخلیق کی خاطر پیرائے وضع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ دیانت دار فنکار کے لیے مسئلہ زیادہ پیچیدہ رہتا ہے۔ زندگی سے متعلق ساری قدریں جس پامالی کا شکار فن میں بھی اگر دھاندلی روا رکھی جائے تو یہ بڑی بدبختی کی بات ہے۔ زیادہ قابلِ مذمت یہ امر ہے کہ اس خیانت کے مظاہر یہاں وہاں ہم دیکھتے اور کڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ادب میں اس ارزانی کے ذمہ داران سے ہمارا خطاب نہیں ہے اور ہو بھی اگر تو وہ کب کسی کی بات پر کان دھرنے والے ہیں ہمیں تو اس تناظر میں راحت کے خلوص اور دیانت داری کی طرف متوجہ ہونا ہے جس کے سہارے انہوں نے تخلیق کے مراحل طے کئے ہیں۔

1980ء کے بعد راحت کے یہاں اظہار کی سطح پر ایک واضح پختگی اور بالیدگی کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہر فن پارے کو جنم دینے کے بعد فنکار کی توانائی اور تجربے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اظہار کے نت نئے پیمانے آزما کر بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اعتبار میں اضافہ کے ساتھ خود اعتمادی لہجے کا وصف بنتی ہے اور اسی لحاظ سے کلام میں سنجیدگی اور وقار بڑھتا ہے۔ راحت کا لہجہ بھی اب نسبتاً سنبھلا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ جذبہ کے اظہار میں ٹھہراؤ، پختگی اور تجربہ میں وسعت کے ساتھ بالغ نظری بھی پیدا ہوئی۔ اس سب کے باوجود فنکار کی شخصیت میں بے درد زمانہ شکست و ریخت کا جو عمل روا رکھتا ہے اس سے اس کا مزاج اور احساس مجروح ہوتا ہے جو اظہارِ مدعا پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ خوابوں کے ٹوٹنے، نصب العین کی ریخت اور منصوبوں کی شکستگی کے نتیجے میں شاعر ذہنی اور جذباتی تصادم اور کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ سماج، مذہب اور روایات ہر محاذ پر وہ لٹا سا ٹھگا اور فریبِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے۔ حادثات کا تواتر اسے اتنی بھی مہلت فراہم نہیں کرتا کہ وہ ایک لمحہ ٹھہر کر اپنے خسارے کا سبب معلوم کر سکے۔ نقصان کا تخمینہ لگا سکے۔ مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو کمر بستہ کر سکے۔ تبدیلیوں کی تیز رفتاری سے وہ بوکھلا جاتا ہے۔

زندگی عجیب شے ہے، ہر آن آس بندھتی اور ٹوٹتی ہے۔ امید کی کرن نظر بھی آتی ہے اور فوراً ہی معدوم بھی ہو جاتی ہے۔ مناظر روشن ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ اداسی اور ناامیدی ذہن کو پراگندہ کرتی ہیں اور سوچ میں انتشار کی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔

میں چاہتا تھا زمیں آفتاب ہو جائے
مگر زمیں سے چپکا ہے قافیہ میرا

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈنے میں زندگی برباد کی

ہم دیا رکھ کے چلے آئے ہیں دیکھیں کیا ہو
اس دریچے میں تو پہلے سے ہوا رکھی تھی

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے تھے جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بے چارے ہوا دیتے تھے

یہ اور اس طرح کے اور اشعار میں تلخی گھلی ہوئی ہے، اظہار میں کڑواہٹ ہے لیکن لہجہ سنبھلا ہوا اور نرم ہے۔ اندازِ بیان بھی سپاٹ نہیں ہے جو شعر کو سٹیٹ منٹ بنا دیتا ہے۔ اشاروں کنایوں تشبیہوں اور استعاروں سے کلام مزین ہے۔ بات سلیقہ مندی سے کہی گئی ہے اس لیے بامعنی اور معیار ہے موضوعات وہی مانوس مانوس سے، تماشے وہی روزمرہ کے، انسانیت کی وہی پامالی اور جبر کی کہانی وہی دیکھی دیکھی سی۔ مقدر وہی کانٹے بھری راہوں کا سفر، راہیں ٹوٹے شیشے کی کرچیوں سے بھری، کہیں شکایت، کہیں بغاوت، کہیں ناانصافی کے سامنے سینہ سپری، کہیں تخریب اور ظلم کے سامنے مغلوبیت۔ زندگی کی بے رحم سچائیوں کا بیانیہ راحت کی شاعری کو حقیقت سے قریب کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہ فنکار سے جس اخلاص اور دیانت داری کا مطالبہ کیا جاتا ہے راحت بڑی حد تک اسے پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ دیانت داری اور اخلاص اس لیے ممکن ہے کہ راحت کے یہاں اظہارِ ذات کے لیے کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ وہ نہ کسی نظریہ کے پابند ہیں نہ کسی مسلک سے وابستہ ہیں۔ تخیل کسی قسم کی بیڑیوں میں گرفتار نہیں ہے۔ ان کی کوشش بہت واضح انداز میں خیر کو خیر کہنے اور شر کو شر کہنے کی ہوتی ہے۔ شکست پر وہ کبھی صبر کرتے ہیں کبھی شکایت کبھی غصہ۔ وہ کسی خود فریبی کا شکار نہیں ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز نے انہیں یہ سکھا دیا ہے کہ یہاں سب کچھ کالے اور سفید میں نہیں ہے۔ نہ سب جھوٹ ہے اور نہ سارا سچ بلکہ حقیقت اور اصلیت بین بین ہے۔ اس سبب سے وہ کسی شے کو یا کسی سچائی کو نہ مطلقاً رد کرتے ہیں نہ پوری طرح قبول وہ نجی تجربہ کی بنا پر فیصلہ کرتے ہیں اور دل و ذہن پر جب جو گزرتا ہے اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ نہ کسی شے کو حقیر جان کر اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں نہ کسی انقلابی کی طرح دنیا کی بساط الٹنے کے لیے کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ راحت کی

شاعری میں وہ سارے مظاہر جلوہ افروز ہیں زندگی جن سے عبارت ہے۔ اصل زندگی کی خالص عکاسی ہی شاعری میں تاثیر پیدا کرتی ہے۔ جذبہ کے خلوص کے سبب یہ تاثیر زیادہ حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ راحت کے یہاں اسی اثر انگیزی کا سیدھا رشتہ حقیقت نگاری سے استوار ہے۔ محسوسات کی اصل اور سچی تصویر کشی ہی اصل شاعری ہے۔ قاری مختلف سطحوں پر مختلف تاثرات لیتا ہے۔ مسرور بھی ہوتا ہے محزون بھی، حادثات سے شکست خوردہ بھی ہوتا ہے اور کبھی جبر کو آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔ راحت بھی اس ماحول اور انہی حالات میں سانس لیتے ہیں۔ لہٰذا آپ بیتی جگ بیتی خود بہ خود بنتی ہے۔ شاعری کے مطالعہ کے دوران قاری بھی اگر ذہنی انتشار کا شکار ہو تو سچا شاعر اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ خود تجربات کے جس کربناک راستہ پر چل کر یہ جنجال پالتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی شاعری کے مطالعہ کے دوران قاری کو بھی آگ کے دریا کو پار کرنا ہی ہوگا۔

راحت نے زندگی کے تضادات کو شعر بنانے کی جو کوشش کی ہے اس میں وہ شدید ذہنی کشمکش کے شکار ہوئے ہیں۔ متضاد کیفیتوں کو شعر بنانا اس لیے آسان نہیں ہے کہ اس سے ذہن میں تذبذب اور غیر یقینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن راحت سے یہ سب فنکارانہ دیانت داری نے کروالیا ہے۔ وہ اپنے ضمیر سے شرمندہ نہیں ہوئے بلکہ اس کی رہنمائی ہی میں وہ تخلیقیت کی منزلوں سے گزرے ہیں:

درمیاں اک زمانہ رکھا جائے
پھر کوئی پل سہانا رکھا جائے
خوب باتیں رہیں گی رستے بھر
دھوپ سے دوستانہ رکھا جائے

وہ اب آئینے دھوتا پھر رہا ہے
اسے چہروں پہ شک ہونے لگا تھا

مرا خلوص ادھر ہے ادھر ہے ترا غرور
تیرے بدن پہ میری قبا کیسے آئی گی

آنگن کے معصوم شجر نے ایک کہانی لکھی ہے
اتنے پھل شاخوں پہ نہیں تھے جتنے پتھر آئے ہیں

دلی جذبات کو اس طرح شعر بنا کر کاغذ پر اتار لینا کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ سارے کرب کو تنہا بھگتنا، انگیز کر کے ظاہر کرنا، اذیت، خوف، تحیر، تجسس، حق کی جستجو اور اس جستجو کے نتیجے میں ٹھوکریں اور ناکامیاں۔ ان ساری واردات کو تجربہ اور مشاہدہ کی چکی کا ایندھن بنا کر ہی شاعری وجود میں آتی ہے۔ یہ شاعری ایک انسان کی قنوطیت اور رجائیت کی ملی جلی کہانی ہوتی ہے اسے سلیقے سے برت کر فن تخلیق کیا جاتا ہے۔ فن کار آزاد بھی ہے اور آزاد نہیں بھی ہے۔ خیال اس کا اپنا رہتا ہے لیکن اصناف کی ہیئت اور Form کے انتخاب اور استعمال میں اسے اس صنف کے مخصوص اصولوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔

راحت کی شاعری میں محسوسات کی سطح سے پیش کش کی سطح تک آتے آتے فنی باریکیوں کے حوالے سے اک واضح فرق نمایاں ہوتا ہے۔ عمر کے ساتھ تجربہ نے ان کی نظر کو بالغ، ان کی نگاہوں کو عمیق بنایا ہے اور پسِ اشتہار کچھ پوشیدہ رکھنے کی صلاحیت اور ہنر میں اسی لحاظ سے اضافہ ہوا ہے۔ راحت نے بیان اور اظہار میں تشبیہات و استعارات اور ترکیبوں کے لیے نئے پیرائے تراشے۔ اطراف و جوانب میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات سے شاعر کی روح میں قوی تر ارتعاشات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ چونکہ عام آدمی کی بہ نسبت شاعر زیادہ حساس ہوتا ہے۔ دکھ اور درد کو پرائے ہوں اسے اپنے دکھ اور درد محسوس ہوتے ہیں اور اس شدت کے ساتھ کہ جیسے مثلاً کسی اور پر بیتتے ہیں۔ یہ شاعر کے محسوسات کے حد درجہ حساس ہونے کے سبب ممکن ہو پاتا ہے۔ لہٰذا ردِعمل اسی تناسب سے شدید ہوتا ہے۔ مادی آسائشوں سے روح کی پیاس نہیں بجھتی۔

راحت کا لہجہ، زبان، طرزِ اظہار، موضوعات اور موضوعات کا برتاؤ ایک مخصوص سماجی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کے شعروں میں مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، رنگوں کی دھنک، چڑیوں کی چہچہاہٹ، سورج کی تمازت، چاندنی رات کی خنکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، محنت کش آدمی کے پسینے کی تیز بو، مشتعل عوام کی نظروں کا نکیلا پن، احتجاج کی آواز، انتقام کی للکار کی گونج، محرومی کی سسکی، دبے کچلے عوام کی پسپائی کا نوحہ، شگفتگی کے مناظر ساری خوشبو سارے مناظر، ساری تلخی، سارا شور باہم مدغم اور مخلوط ہے۔

سورج کہیں ایک عظیم الشان تہذیب کا استعارہ ہے۔ کہیں راحت غروب ہونے کو نئی صبح کے آمد کے پیش خیمے کے طور پر پیش کر کے طبعی رجائیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہی سورج کبھی ان کے کلام میں انسانی جدوجہد کی داستان بن کر طلوع ہوتا ہے۔ اور کہیں یہ ظالم، جابر طاقت کی علامت کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح سورج کہیں دیوتا بن کر انسانی آنکھ کا آنسو پوچھتا ہے اور ایک غم گسار انیس و رفیق کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور معصوم آنکھوں کے خواب کی شکل اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ اسی طرح پرندے بھی مختلف مواقع اور موڑ پر مختلف علامتوں کے طور پر کلام میں کثیر جہتی معنی آفرینی کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ یہ زمین انسان پر تو تنگ ہی رہی ہے اس کے باوجود یہ انسان ہے جس نے پرندوں کے مسکن اجاڑ کر انہیں اپنے مسکنوں سے محروم کیا ہے۔ لہٰذا کہیں پرندہ دربدر اور بدحال سماجی بدحالی کا استعارہ بنتا ہے۔

آب و دانہ کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح
میں جہاں شاخ پہ بیٹھوں کہ اڑاتا ہے مجھے
اجنبی خواہشیں میں دل میں دبا بھی نہ سکوں
ایسے ضدی ہیں پرندے کہ اڑا بھی نہ سکوں

بہہ گیا وحشی کبوتر کی ہوس کا گرم خوں
نرم بستر پر تڑپتی فاختائیں رہ گئیں

ہمارا شوق ہے دار و رسن کی پیمائش
تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

عقاب ان میں کوئی ہو گا تو ہو گا
ہمیں تو سب کبوتر لگ رہے ہیں

راحت کا مشرب شروع ہی سے میانہ روی رہا ہے۔راحت نے کسی کمٹ منٹ کا خود کو کبھی پابند نہیں بنایا۔ نہ روایت کی سخت پابندی نہ اس سے نفرت۔ نہ خالص ترقی پسندانہ جدید حسیت کی دعویداری۔ کسی مخصوص گروہ کی وفاداری کو راحت نے کبھی اپنی شناخت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جذبات واحساسات کا مخلصانہ اظہار شروع ہی سے راحت کا طریقہ رہا۔ یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ تقلید آسان ہوتی ہے۔ پرچم برداری عافیت کا عمل ہے۔ محفوظ اور مامون راہ لیکن راحت نے اپنا راستہ خود بنایا۔

زندگی کے معمولی سے معمولی وقوعے جو ملال ومسرت سے عبارت ہوتے ہیں انہی جذبات کی عکاسی نے راحت کی شاعری کو اپنے زمانے کی نمائندہ شاعری کی صف میں جگہ فراہم کی۔

زندگی یوں بھی ہے عظیم کہ یہ
عمر میں ہم سے کچھ زیادہ ہے

بغاوت کی ہے میرے آنسوؤں نے
عجب آفت سمندر پر پڑی ہے

موسم کے پتے ہیں شول
سب کے چہرے پیلے ہیں

آنکھ پیاسی ہے کوئی منظر دے
اس جزیرے کو بھی سمندر دے

مرے چراغ مری شب مری منڈیریں ہیں
میں کب شریر ہواؤں سے ڈرنے والا تھا

دولت بازو حکمت گیسو شہرت ماتھا غیبت، ہونٹ
اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے

عام زندگی کی یہی نمائندگی، یہی آنسو، یہی مسکراہٹیں، یہی ہار، یہی جیت، یہی غرور وناز، یہی فضیحت انسانی زندگی کی اصل ہیں۔انسانی زندگی انہی معاملات سے عبارت ہے۔راحت کے یہاں ان وارداتِ زندگی کو مکمل نمائندگی ملی ہے دراصل انہی سب معاملات کو راحت نے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ لہٰذا راحت کی شاعری کے کینوس کو وسعت ملی اور وہ زیادہ ہمہ گیر ہوئی ہے، استعارہ زیادہ چمک دار اور تشبیہات کے استعمال میں زیادہ چابک دستی اور سلیقہ زیادہ نظر آتا ہے۔معاملاتِ عشق کا بیان ہو یا زمانے کی ستم رسانیوں کا شکوہ ہو ہر صورتِ حال کے اظہار کے لیے مناسب اور موزوں لفظیات کے ماہرانہ انتخاب اور استعمال نے راحت کے کلام کو پختگی، طرفگی اور اعتبار بخشا ہے۔

موضوع کو مناسب الفاظ کے ذریعے برتنے میں راحت کے یہاں بہتری کا عمل بتدریج نکھرتا اور سنورتا رہا ہے۔قادر الکلامی کے نمونے جابجا دیکھے جا سکتے ہیں۔لفظ کی حرمت کا احساس راحت کو بہت زیادہ ہے۔وہ کسی غیر مانوس لفظ کے استعمال سے قطعاً پرہیز نہیں کرتے بشرطیکہ ان کے نزدیک وہ لفظ کسی مخصوص سیاق میں مخصوص شعر میں مخصوص جگہ مناسب اور ضروری ہو۔ضرورتِ شعری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے راحت ہر دم کمر بستہ رہتے ہیں۔الفاظ کے اسی غیر معمولی احتیاط اور استعمال نے اکثر ان کے کلام میں چونکا دینے والا عنصر پیدا کر دیا ہے۔راحت ایسا اپنے اعتبار، اعتماد اور یقین کے سہارے کر پاتے ہیں۔

راحت اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں کسی قسم کے گھماؤ یا پیچ کے قائل نہیں۔اپنے اطراف پھیلے تشدد، سماجی ابتری کے مناظر، ذات کے کرب اور تنہائی سے پیدا شدہ نفسیاتی الجھنیں راحت کے ذہن ودل پر شدید طور پر اثر انداز ہو کر اسی قدر شدید ردِعمل پیدا کرتی ہیں۔تشدد اور ناانصافیوں کے ہولناک مظاہر کے نتائج سے راحت بہ حیثیت فنکار واقف ہیں۔یہی ان کی جھلاہٹ کا سبب ہے اور یہی امر انہیں ذہنی طور سے بہت بے قرار رکھتا ہے۔قلبی اور ذہنی واردات کا بے ساختہ اظہار شعر کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ذہن پر یک بارگی کسی خیال کے اترنے اور اس کے فوری اظہار کے مرحلے سے گزرنے کے سبب شاعر اتنی مہلت نہیں پاتا کہ زبان کے حوالے سے شعر میں کوئی تزئین کاری کر کے تشبیہوں اور استعاروں کا اہتمام کرے اور فنی باریکیوں کے جھمیلے میں خود کو الجھائے۔ان اشعار کی خصوصیت، لہجے کی بے ساختگی اور تیور ہوتے ہیں۔راحت کا شعر ان اوصاف سے مالا مال نظر آتا ہے۔

خودکشی کو بزدلی کہنا سمجھ کا پھیر ہے
موت سے آنکھیں چرانے میں بھی ہمت چاہیے

مجھے خریدنے والوں قطار میں آؤ
وہ چیز ہوں جو پسِ اشتہار رہتی ہے

راحت اندوری کی شاعری کی جہاں اور خصوصیات ان کی پہچان کا سبب بنتی ہیں وہیں ان کا لہجہ خاص طور سے ان کی پہچان کا سب سے امتیازی ذریعہ ہے۔انہوں نے طرزِ ادا میں غیر معمولی انداز اختیار کیا ہے۔ان کے یہاں

شکوہ وشکایت نہیں ہے نہ اصحابِ اقتدار پر محض انگلی اٹھانے کا انداز ہی ہے وہ اس لہجے میں اپنی عظمتِ رفتہ کی یاددہانی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاریخی عروج کے ترانے اور علم وحکمت کے میدان میں کارگزاریوں کے مدح خواں بھی ہیں۔ اپنی شاعری کی ابتدا سے آج تک یہ حقیقت ایک مستقل وقوعہ کی طرح ان کی سائیکی سے اس سارے عرصہ مربوط ومنسلک رہی لہٰذا ان کے ہاں عصری رجحان کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے، اور شعر جدید شعری رویے کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔

انسانی بے توقیری کے مناظر شاعر راحت کے حساس ذہن پر مرتسم ہو کر ایسے نقوش بن گئے جنہوں نے شعری پیش کش کو شدید طور پر متاثر کیا لیکن چونکہ بات شعر کے قالب میں ڈھال کر کہنی تھی لہٰذا راحت نے ہر تجربہ اور واردات کو تمام تر شعری نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس لحاظ سے راحت کی شاعری بہتر اور زیادہ دیدہ زیب بنی۔

اظہار کے نئے اور انوکھے رنگوں نے کلام میں جاذبیت پیدا کی۔ یہی خوبی راحت کے تخلیقی شرارے کو فروزاں کئے ہوئے ہے اور ان کو یہ حیثیت شاعر مستند اور باوقار بنا رہی ہے۔ جذبہ کی شدت کے ساتھ اظہار کی پختگی سے راحت کا شعر وقیع بنا ہے۔ ملال ومسرت اور حیرت وحسرت کے ملے جلے تاثرات سے تشکیل شدہ منظر نامہ راحت کے یہاں انتہائی مہارت، بے ساختگی، سیدھے اور صریح انداز میں شعر کی صورت خلق ہوا ہے۔

ان آنکھوں کی نیندیں گم ہو جاتی ہیں
جن آنکھوں کو خواب میسر ہوتے ہیں

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک لفظ کو صدا بھی جان

خوار پھرتے ہیں آئینہ ہو کر
جانے منہ دیکھنا ہے کس کس کا

راحت کے ہاں ہنگامِ ذات کے مظاہر اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ ارتعاشات اور ردِعمل جب تجربہ بن کر شعری پیکر میں ڈھلتے ہیں تو ان کا تاثر بہت شدید ہوتا ہے۔ یہ تاثیر سچائی اور خلوص کے سبب سے ہے کہ شاعر اس عذاب سے پہلے خود گزرا اور اس کے بعد یہ سارے درد وکرب شعر بنے۔ قاری اس تجربہ میں بعد میں شریک ہوا۔

راحت کی زندگی بے انتہا نشیب وفراز سے عبارت ہے۔ ذہنی اور روحانی سطح پر راحت کو سخت ترین تجربات کا سامنا رہا ایسا کہ معمولی قویٰ کے شخص کے لیے ان کٹھن مقامات سے سلامت گزرنا محال ہے۔ راحت نے حد درجہ ضبط، ہمت، حوصلہ اور صبر سے ان حالات کا مقابلہ کیا انہیں اپنے نجی تعلقات یا سماجی مرتبہ پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ لیکن ان واردات کے تاثر کو اور روح کی گھٹن کو کہیں نہ کہیں تو راہ پانا تھا۔ سو یہ سب شعر کی شکل کاغذ پر اترا کہ فنکار اس غبار کو فن کے ذریعے ظاہر کر کے تسکین حاصل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

جہاں کڑھے ہوئے رومال ہم نے بھیجے ہیں
وہیں سے جنگ کے پرچم کی واپسی ہوگی

یقیں کیسے کروں میں مر چکا ہوں
مگر سرخی یہی اخبار کی ہے

اردو شاعری کے موجودہ منظر نامہ میں راحت کی شاعری کے لیے بے کراں امکانات موجود ہیں۔ اک کہکشاں ہے مختلف النوع شعری پیکروں کی۔ ہر مکتب فکر کے شعراء اپنے مخصوص انداز اور نظریہ کے تحت شاعری کر رہے ہیں اور ہر ایک کے حصے میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ہے۔ کسی طے شدہ راستہ پر نہ چل کر اور کسی مخصوص نظریہ یا مکتب فکر سے عدم وابستگی سے فائدہ یہ ہوا کہ راحت کی شاعری کا کینوس نسبتاً وسیع رہا اس میں منظر اور موضوع کا ایسا تنوع ہے کہ یہاں زندگی کی خوب صورتی اور کثافت، محبت اور کدورت، قرب کی مٹھاس اور نفرت کی تلخی، انسانی رشتوں کی پامال ہوتی ہوئی برکتیں، قدروں کو معدوم ہوتا ہوا دیکھتی خراش آنکھوں کا خالی پن، نفرتوں کی آگ میں خاکستر ہوتی ہوئی بستیاں اور باسیوں کے خواب، خون خوف شک اور شامت کی خیمہ زنی اور سکھ شانتی کی دربدری سب کچھ موجود، محسوس اور مذکور ہے۔ راحت کی شاعری کی امیجری انسان اور انسانیت سے متصل ہر گوشہ کو مَس اور منور کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ راحت کے یہاں حساس موضوعات کا نہایت دردمندانہ اظہار پایا جاتا ہے۔

گھیرے رہتے ہیں کئی خواب مری آنکھوں کو
مرے اللہ مجھے نیند بھی آنے لگ جائے
میری خواہش ہے کہ ہر شام یہ جلتا سورج
شب کی دہلیز پہ اک شمع جلانے لگ جائے

کچھ پلوں کی تتلیوں کے پر، ہمارے سنگ ہیں
چند خوشیاں ہیں غموں کی پاس داری کے لیے

ساری دنیا کو سر چڑھائے رکھو
سر کا کیا مول دردِ سر کے بغیر

ایک دوزخ جو سب جلا ڈالے
ایک جگنو، جو روشنی کر دے

ان کی اس خصوصیت نے اقلیم شعر میں ان کا مقام اور مرتبہ بلند کر دیا ہے۔

غزل کی آنکھ میں نیزے

ڈاکٹر طارق قمر
(لکھنؤ، بھارت)

اہل علم ودانش ابھی غزل کی بدلتی صورت، ہیت اور معنویت پر کفِ افسوس مل ہی رہے تھے کہ۔فضا تبدیل ہوتی محسوس ہوئی۔ایک سایہ نمودار ہوا۔صبح کی نوید کے امکان روشن ہوئے،غزل کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں امید سحر جگمگانے لگی۔دیکھتے ہی دیکھتے نمودار ہوئے سائے کی تجسیم ڈاکٹر راحت اندوری کی شکل میں ہوگئی۔زمانے کی بے رحمیوں چیرہ دستیوں کی شکار،تھکی ہاری معتوب ومضروب غزل نے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھ ڈاکٹر راحت اندوری کے ہاتھ میں دیدئے۔اور پھر تحفظ کے اس ایوان میں آگئی جہاں غزل کی آبرو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسے وقار ومعیار بھی عطا کیا گیا۔۔ادب کے سنجیدہ اور ذمہ دار قارئین جانتے ہیں کہ بے حفاظت اور بنام جدت گلے بازوں تشاعروں اور خود ساختہ عظمتوں میں مبتلا شاعروں نے غزل کے ساتھ جو سلوک کیا وہ عبرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ایک طرف تو جدیدیت کے نام پر غزل کا مقدس پیرہن تار تار کیا جاتا رہا جدید فکر وخیال کے نام پر مرغے کی بانگ،گھوڑے کی ہنہناہٹ اور کتے کی بھوں بھوں کو حسنِ ساعت کا حوالہ بنایا گیا، جمالیات کے نام پر غزل کو برہنہ کر دیا گیا۔محبوب کے جسم کے راز افشا کئے گئے۔نازیبا علامتوں کے ذریعے اپنے جنسی احساس کی تسکین کی گئی،گرم سرخ سلاخ تڑپتی ہوئی مچھلی کے اندر اتاری گئی،سلگتے جسم پر جسم کی بارش کی گئی،بوند بوند سے ترسیل نوازش کر کے بدن کی کھیتیاں ہری کی گئیں،گائے سے گائے کا بدن چٹوایا گیا،شب کو بے لباس کر کے شلوار وشرٹ کو ایک ساتھ کھونٹی پر ٹانگ دیا گیا۔ایک طرف تو غزل کی دیرینہ تہذیب وروایت کی دھجیاں اڑائی جاتی رہیں دوسری طرف بے اپنے ادبی کنبوں اور قبیلوں کی پرورش میں مصروف ناقدین اپنے کفش برداروں کے گلے میں عظمتوں کے طوق ڈالتے رہے۔راحت اندوری کا کمال یہی ہے کہ جس وقت فحش نگاری پر تنقید عظمتیں تقسیم کر رہی تھی اس وقت بھی راحت اندوری غزل کی آنکھ میں نیزے سے کاجل لگانے اور غزل کو سجانے کے دشوار عمل میں مصروف تھے۔آسمانوں کو زمین پر لانے کی آرزو اور چاند تاروں کو ٹوٹے ہوئے دیوں کے برابر سجانے کی جستجو کر رہے تھے۔جب دوسرے شاعر محبوب کے بدن کے راز فاش کر رہے تھے اس وقت یہ شاعر مظلوم عوام کی کروٹوں کا ذائقہ لکھنے میں مصروف تھا جس وقت گونگے بہرے شاہوں کی قصیدہ خوانی ہو رہی تھی اس وقت راحت اندوری کی آواز روایتوں کی صفیں توڑنے کی جستجو اور سیاسی ایوانوں کی دیواروں میں شگاف ڈالنے کی آرزو کر رہی تھی۔

ہمیں حقیر نہ جانو ،ہم اپنے نیزے سے
غزل کی آنکھ میں کاجل لگانے والے ہیں

یہی عقیق تھے شاہوں کے تاج کی زینت
جو انگلیوں میں مداری پہن کے آئے ہیں

چھت سے اس کی، دھوپ کے نیزے آتے ہیں
جس آنگن میں چھاؤں ہماری رہتی ہے

مری غلیل کے پتھر کا کارنامہ تھا
مگر یہ کون ہے جس نے ثمر اٹھایا ہے

ڈاکٹر راحت اندوری کے لہجے کی اس شدت وبغاوت پر تنقیدیں تو کی گئیں لیکن اس شعری محل ومحاکات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی جو بڑی شاعری کی اساس ہے اس شاعری کے پس منظر میں سانس لے رہے اس تعمیری جذبے کو نظر انداز کر دیا گیا جو کسی بھی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔اہم سوال یہ ہے کہ کیا عصری صداقتوں کا عرفان وبیان ہی بڑی شاعری ہے؟۔۔شاید نہیں۔۔اگر یہ بڑی شاعری کا وصف ہے تو یہ کام تو دوسرے لوگ بھی کر رہے ہیں۔۔راحت اندوری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس مرحلے سے گزرتے ہوئے بھی غزل کے دامن کو کہیں میلا نہیں ہونے دیا ہے اپنے لہجے کو تبدیل کرتے وقت بھی غزل کی تہذیب اور لسانی رویوں کا خاص خیال رکھا ہے غزل کو نعرہ نہیں بن نے دیا ہے۔

صلح کرتے ہیں کہ آدابِ سفر جانتے ہیں
ورنہ ہم جنگ کے میدان کو گھر جانتے ہیں

کچھ لوگ ڈاکٹر راحت اندوری کے سلگتے لہجے کی شدت پر اس لئے Negative marking کر سکتے ہیں کہ اس میں ایک شعلگی ایک احتجاج پوشیدہ ہے لیکن سچائی یہی ہے کہ ہر عہد کی بڑی شاعری اور بڑے شاعر کو اس انداز کے کمزور اور دقیانوسی اندیشوں اور خدشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔جب شیلی نے اپنے لہجے کو تبدیل کر کے حکمرانوں کی نیندیں توڑنے کی کوششیں کی تھیں تو اس وقت بھی مخالف تنقید نے اپنے دفتر کھول دئے تھے۔

Shelly's Ideas were anarchic and he was considered dangerous by the conservative society of his time.

راحت اندوری کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا ہے۔فکر واحساس کی سطح پر راحت اندوری کی شاعری میں ہمہ وقت کئی شیڈس نظر آتے ہیں جن کے رنگ قاری کے شعری شعور اور شعری وجدان کے مطابق گہرے اور ہلکے ہوتے رہتے ہیں۔راحت اندوری کا فن یہی ہے کہ ان کا PoeticTreatment ہر شیڈس

کو جاذب نظر اور دلکش بنائے رکھتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کو پڑھتے اور سنتے وقت ان کے قاری اور سامع کا موڈ بھی رنگوں کی طرح تبدیل ہوتا رہتا ہے کبھی وہ ترکی کے شاعر ناظم حکمت کی طرح Romantic Communist نظر آتے ہیں تو کبھی پی بی شیلی کی طرح Revolutionary Reformer کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔راحت اندوری کی ناراضگی کا مطالعہ و مشاہدہ کیجئے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ:

Rahat Indori's poetry has two moods... in one he is a revolutionalry reformer wanting to change the old order to find universal happiness. in the second he is a great lover almost merging himself in the beauty of love...

ذاتی تجربات و مشاہدات کی خوشہ چینی کرتے ہوئے معاشرے کے آشوب کو غزل میں سمیٹنے کا ہنر پل صراط سے قدم جما کر گزرنے کے مترادف ہے اس پل صراط سے گزرتے ہوئے ہمارے بہت سے شاعروں کی سانسیں پھول گئی ہیں۔بہت سے قلم کاروں نے اپنا توازن کھودیا ہے۔کئی لوگوں کو تو اس پل صراط پر بیٹھنا اور رکنا پڑا ہے لیکن راحت اندوری اس پل صراط پر خوش خرامی کا فن جانتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی غزل ہمارے عہد کی تلخ حقیقتوں اور سچائیوں کا عرفان کراتے ہوئے بھی اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھتی ہے۔

خیال یہ تھا کہ پتھراؤ روک دیں چل کر
جو ہوش آیا تو دیکھا لہو لہو ہم تھے

پسینے بانٹتا پھرتا ہے ہر طرف سورج
کبھی جو ہاتھ لگا تو نچوڑ دونگا اسے

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

ہمارا ذکر بھی اب جرم ہوگیا ہے وہاں
دنوں کی بات ہے محفل کی آبرو ہم تھے

بدنصیبی یہ ہے کہ جدید غزل کی مظلوم و معتوب شہزادی کو بہا بلیوں کے شکنجوں سے آزاد کرانے والے اس خود رنگ شاعر کو ہماری تنقید مشاعروں میں تلاش کرتی رہی۔اور راحت اندوری نے حدِ تنقید کے آگے قدم رکھ دیا۔ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں تاخیر تو ہوگئی لیکن یہ تاخیر باعثِ توقیر ہے۔اگر شاعری واقعی نامعلوم سے معلوم اور لاموجود سے موجود کا سفر ہے تو راحت اندوری کی شاعری ادب عالیہ کا حصہ ہے۔

مجھے ڈبو کے بہت شرمسار رہتی ہے
وہ ایک موج جو دریا کے پار رہتی ہے

راحت اندوری کے یہاں معنوی یافت کا فن اس قدر شدید اور حیرت انگیز ہے کہ ان کے یہاں قدرِ زوالی بھی قدرِ لازوالی ہوجاتی ہے۔اور غزل اپنی حدوں سے نکل کر لامحدودیت تک پھیلی دکھائی دیتی۔بڑی بات یہ ہے کہ اس پھیلاؤ کے ساتھ راحت اندوری کا قاری اور سامع بھی پھیلتا رہتا ہے اسی لئے لوگوں کے ذہنوں پر راحت اندوری کے شعر منڈلاتے رہتے ہیں۔کل راحت اندوری ایک شعری انقلاب کا نام تھا آج شعری ادب کی معتبر و مہذب شعری علامت کا نام ہے ،چند شعر دیکھئے اور اعتراف کیجئے کہ یہ شاعری اس لئے بڑی شاعری ہے کہ اس کے سارے دروازے اس زندگی کی طرف کھلتے ہیں جو محبت اور صرف محبت ہے۔

میں سوچتا ہوں کوئی اور کاروبار کروں
کتاب کون خریدے گا اس گرانی میں

سبب وہ پوچھ رہے ہیں اداس ہونے کا
مرا مزاج نہیں بے لباس ہونے کا

منتظر چاک پہ ہے میری ادھوری مٹی
تو ذرا ہاتھ لگادے تو مکمل ہو جاؤں

بہت سی نظریں ہماری طرف ہیں محفل میں
اشارہ کردیا اس نے ذرا سرک کے مجھے

ہزار بار ہزاروں کی سمت دیکھتے ہیں
ترس گئے تجھے اک بار دیکھنے کے لئے

کوئی بتائے تو میں اس کا کیا علاج کروں
پریشاں کرتا ہے یہ دل دھڑک دھڑک کے مجھے

اپنی قسمت میں لکھی تھی دھوپ کی ناراضگی
سایہء دیوار تھا لیکن پسِ دیوار تھا

سنجیدہ قارئین کے ذہن و دل پر خوش گوار نقش قائم کرتی ہوئی اس آفاقی شاعری کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ تلخ حقیقتوں اور حقیقی مسرتوں کی شاعری ہے جو خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا رہنے والوں کے لئے روشنی کی بشارت ہے۔یہ شاعری شعلوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی طرح ہے جس میں لطافت بھی ہے اور حرارت بھی لطافت و حرارت کا یہ امتزاج ہی ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت کا شناخت نامہ ہے۔

ذہانت کے تذکرے

سنجے مشر اشوق

(بریلی، بھارت)

بیمار ارادوں کی کشتی میں سوار ہوکر منزل کی جستجو عقلمندوں کا شیوہ نہیں ہے۔منزل سدا انھیں کوملتی ہے جوپیہم سفر کرتے ہیں، ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اورعزم کی ٹھوکر سے راہ کی ہر دیوار گرانے کا حوصلہ وجذبہ رکھتے ہیں۔راحت ایک ایسے ہی شاعر کا نام ہے جس نے فطری صلاحیتوں اور ذہانت سے اپنی دنیا بنائی ہے۔کلام کو چربہ، سرقہ اور توارد کے دھبّوں سے پاک رکھنے کے لئے ایجاد و اختراع کے عمل کو بہتر جانا۔ مطالعے اور مشاہدے کی آنکھ کھلی رکھی۔روایتی موضوعات کا پیٹ بھرنے کے لئے عصری حقائق کا گلا نہیں گھونٹا۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں بیل گاڑی چلانے یا چارپائی پرسونے کی تبلیغ نہیں کی بلکہ علم و عمل اورعزم وحوصلہ کی راہ سے ٹھوس حقیقتوں کا ذکر کیا۔اس لئے راحت کی شاعری عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔انھوں نے رابطہ کی زبان اردو اور سب سے بڑے ادارے ''عوامی مشاعرے'' کا استعمال کیا۔

اس حقیقت سے کون بینا انکار کرسکتا ہے کہ آج بوڑھے، بچے، جوان سبھی کے لبوں پر راحت اندوری کا نام ہے۔ان کی شاعری اور پڑھنے کا انداز سبھی کومتاثر کرنے کے ساتھ دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ان کے اشعار کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ کے بعد بجز جگر کے ایسے شعراء کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے کہ جن کے ایک سے زائد شعر زباں زد خاص وعام ہیں۔ مگر راحت نے اپنے انداز پیش کش اور فطری شعری صلاحیتوں سے دلوں میں ایسی جگہ بنائی ہے کہ ان کے اشعار کثیر تعداد میں مختلف عمر اور خیال کے لوگوں کو از بر ہیں۔ایسے ہی چند شعر یہاں پیش ہیں:

ہماری سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

سمندروں میں موافق ہوا چلاتا ہے
جہاز خود نہیں چلتے خدا چلاتا ہے

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

قطار میں کئی نابینا لوگ شامل تھے
امیر شہر کا دربار دیکھنے کے لئے

ہر ایک لفظ سے چنگاریاں نکلتی ہیں
کلیجہ چاہئے اخبار دیکھنے کے لئے

گلاب ، خواب ، دوا، زہر، جام کیا کیا ہے
میں آگیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے

ایسے ہی نہ جانے کتنے خوبصورت اشعار سے ان کا جہانِ شاعری آباد ہے۔خاصی تعداد میں مجھے ان کے شعر یاد ہیں اور دوسرے بھی موقع ومحل کی مناسبت سے ان کے اشعار پڑھتے رہتے ہیں۔راحت کبھی سستی، کاہلی یا جمود کے شکار نہیں ہوئے۔ وہ سدا مصروف رہتے ہیں۔فلمی دنیا سے علمی دنیا تک اُن کی صلاحیتوں ، خوبیوں اور ذہانت کے تذکرے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی ڈاکٹر راحت اندری کو نہ صرف یہ کہ ''نئی غزل کا قلندر'' لکھتے ہیں بلکہ ان کے اخلاقی رویوں سے کافی متاثر ہیں اور اس اعتراف پر مجبور ہیں۔''راحت اندوری اپنے بڑوں سے احترام سے پیش آتے ہیں۔اور چھوٹوں سے بے تکلف ہیں باتوں میں مٹھاس اور اسلوب سادہ ہے۔وہ جب بھی ملتے ہیں دل کے تکلف اور تردد کی گرد دھو جاتے ہیں۔ساتھ ہی دل کو اپنے خلوص کی خوشبو میں بسا دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر بشیر بدر انھیں ''غزل کا ناقابل فراموش شاعر'' قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں '' آج کی نئی غزل میں راحت اندوری کی شاعری منفرد انداز کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔راحت کی غزل میں زندگی کی قوت، عصری حقیقتوں کا ادراک اور روحانیت کا ایسا خوبصورت امتزاج ہے کہ موضوعات کے لحاظ سے بھی ان کی غزل وسیع کینوس کی غزل ہے۔

پروفیسر وسیم بریلوی، عقابی نظر، تیزابی تیور اور میزائلی لہجہ والا فنکار لکھ کر راحت کو دنیائے محبت کا نیا عنوان بتاتے ہیں۔ان کے مطابق راحت کا زندہ ضمیر ہر مصلحت کو نکارنے، ہر بندش کو ٹھکرانے اور ہر ریاکاری کو بے نقاب کرنے ہی میں طمانیت محسوس کرتا ہے۔

مظفر حنفی اور زبیر رضوی جیسے جید قلم کار بھی راحت کی متضاد خوبیوں اور صلاحیتوں کے معترف و متاثر ہیں۔ ادب و احترام کے جذبے اور شاعرانہ صفات کا ذکر جمیل کرتے ہیں اور مجھ جیسے ہیچمداں بھی ان کے مداح و پرستار ہیں تو صرف اس لئے کہ راحت کی شاعری صرف مشاعروں کی شاعری نہیں ہے کہ سن کر، لطف اندوز ہوکر یا فقط داد وتحسین کے تبادلے پر ہی بات تمام ہو جائے بلکہ غور طلب بات تو یہ ہے کہ ہر دور میں راحت نے چونکانے والے اشعار سے دامن ادب کو مالا مال کیا ہے۔اس لئے ان کے کلام میں معیاری اشعار کی تلاش بے سود نہیں ہے۔دعوے کی دلیل میں چند شعر یہاں پیش ہیں:

یہ میکدہ ہے، وہ مسجد ہے، وہ ہے بت خانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

میں اکثر بادلوں میں دیکھتا ہوں
کوئی بوڑھا عبادت کر رہا ہے

اب تو اس شیشے کے گھر میں سانس لینا ہے محال
کم سے کم سر پھوڑنے کو ایک پتھر چھوڑ دے

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

کہا اور لکھا جا سکتا ہے کہ راحت کی شاعری یک رخی نہیں ہے۔موضوع اور ماحول کی مناسبت سے ان کا رخ بدلتا ہے، انداز تبدیل ہوتا ہے۔نرمی، گرمی، تلخی، ترشی سب کچھ بقدر ضرورت ہے۔مشاعرے، فلم اور کتاب کی شاعری کا بنیادی فرق ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔

مشاعروں کے عام سامعین کے ذوق وشوق کی تکمیل کے لئے اُن کے پاس چورن، چٹنی اور گرم مسالہ سبھی کچھ ہے، تو ادب کے سنجیدہ قاری اور خالص ادبی حلقہ کے لئے ان کے پاس معیاری اشعار کی کوئی کمی نہیں ہے اور بلاخوف وتردید ایک بڑا طبقہ ان کا گرویدہ ہے۔سکّہ بند ناقدین بھی انھیں پوری طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔رمز واشارہ اور تشبیہ واستعارے سے ان کی شاعری آراستہ ہے مگر علمیت کے بیجا استعمال سے انھوں نے گریز کیا ہے۔

پتھر اور شیشہ کا استعمال ماضی تا حال سبھی شعراء کے یہاں ہے مگر راحت نے فکر کے زاویہ اور سوچ کے طریقے کو کس ہنرمندی سے بدلا ہے۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

یہ آج راہ میں پتھر کا ڈھیر کیسا ہے
ضرور کوئی پیمبر اترنے والا ہے

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

اب تو ہر راہ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گذری ہے ترے شہر میں آتے جاتے
ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گذرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

غزل پھیری لگا کر بیچتا ہوں
میں صرافے میں پتھر بیچتا ہوں

ہمیں بنیاد کا پتھر ہیں لیکن
ہمیں گھر سے نکالا جا رہا ہے

یہ جاکے میل کے پتھر پہ کوئی لکھ آئے
وہ ہم نہیں جنھیں راستہ چلا تا ہے

عروج وزوال کی عبرت ناک کہانیاں اور وقت کے الیے شاعر کے درون میں ہلچل پیدا کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

امیرِ شہر تری طرح قیمتی پوشاک
مِری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

راحت دوسروں کو کوسنے، موردِ الزام ٹھہرانے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ اپنا جائزہ اور محاسبہ کرلیں۔اسی کیفیت سے دوچار ہو کر وہ اس طرح کے با مقصد شعر کہہ کر دنیا کو سر دھننے پر مجبور کرتے ہیں:

آج کانٹوں بھرا مقدر ہے
ہم نے گل بھی بہت کھلائے تھے
ہے غلط اس کو بے وفا کہنا
ہم کہاں کے دھلے دھلائے تھے

موجودہ حالات کا تجزیہ کیجئے اور شاعر کا شعر پڑھئے:

یہ لوگ پاؤں نہیں ذہن کے اپاہج ہیں
اُدھر چلیں گے جدھر رہنما چلاتا ہے

تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے:

واقف ہے خوب جھوٹ کے فن سے یہ آدمی
یہ آدمی ضرور سیاست میں جائے گا

جدیدیت کی راہ سے:

تلا ہے دھوپ برسانے پہ سورج
شجر بھی چھتریاں لے کر کھڑے ہیں

منتظر ہوں کہ ستاروں کی ذرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پہ بلا لوں گا اشارہ کر کے

سب کے دکھ سکھ اس کے چہرے پر لکھے پائے گئے
آدمی کیا تھا ہمارے شہر کا اخبار تھا

سچی اور کھری مگر تلخ بات:

ادب کہاں کا کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعروں میں تماشے مداریوں والے

قیمتی پیغام اور مشورہ:

جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
ان چراغوں کو بجھا دو تو اجالے ہوں گے

ظالم کے ظلم وجور سے ڈر کر راہ بدلنے کے بجائے راحت آنکھ میں آنکھ ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور یوں گویا ہوتے ہیں:

تیرے ہاتھوں میں ہے تلوار ترے لب پہ دعا
سورما آ، مجھے میدان سے باہر کر دے

ایمان ویقین کی دھیمی آنچ شاعر سے یہ شعر کہلواتی ہے:

ہو نمازی کہ شرابی، یہ کوئی شرط نہیں
وہ جسے چاہے مقدر کا سکندر کر دے
سارے بادل ہیں اُسی کے وہ اگر چاہے تو
میرے تپتے ہوئے صحرا کو سمندر کر دے

قیمتی احساس:

میری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
میرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

راحت نے ڈاکٹر یا پروفیسر بن کر یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان کے انداز میں سبق پڑھانے کا کام نہیں کیا ہے بلکہ غمزدہ انسان کو ہنسانے، اُس کے مسائل کو بیان کرنے اور تدارک کی ہر ممکنہ کوشش کی ہے۔ پارسائی کا دعویٰ کرنا اور ناصحانہ انداز اختیار کرنا اُنھیں کل پسند تھا نہ ہی آج پسند ہے۔

میری اپنی رائے ہے کہ راحت کی زندگی دورخی نہیں ہے۔ اُن کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہے۔ ان کی شاعری زندگی سے قریب ہے۔ ذات کے کرب سے زیادہ ذکر کائنات ہے۔ پوری دنیا کو وہ اپنا وطن تصور کرتے ہیں۔ تفریق اور تعصب سے ان کا دل دکھتا ہے۔ علاقائی ولسانی تعصب انھیں قطعاً پسند نہیں۔ ذات، پات اور نسلی تفریق کا خاتمہ ایک طرح سے اُن کی شاعری کا مشن ہے۔ مصروفیت اور پیہم چلتے رہنے کو وہ کامیابی کی کلید مانتے ہیں۔ اُن کا یہی نظریہ انھیں کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ اُن کے پُر خلوص اور مشفقانہ رویّوں سے ان کے چھوٹے فائدہ اٹھا کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں تو بڑے بھی ان کے ادب واحترام کے جذبے کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

ایسے پُر خلوص، بیباک اور جراتمند شاعر پر برِصغیر ہی نہیں دنیا کے ہر ملک اور شہر سے خصوصی نمبر نکلنے چاہئے۔ سیمینار و سمپوزیم کی میز بجنی چاہئے اور تحسینی کلمات کی ادائیگی میں کسی بھی طرح کے بخل کو گناہ تصور کیا جانا چاہئے۔

☆

ڈیجیٹل لائف

(بہ زمینِ غالب)

نیٹ ہی اب بتائیگا کیا ہے
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ایک مس کال بھی نہیں دیتا
دلِ ناداں اسے ہوا کیا ہے

فیس بک پڑھ کے سر میں درد ہوا
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

جیوسم کارڈ ہے ہمارے پاس
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

وہاٹس ایپ پر جتائیں اپنا پن
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

تیرا ریچارج میرے نمبر پر
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

آف لائن کبھی، کبھی ہیں بلاک
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ڈیجیٹل لائف میں بھلا بیٹھے
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

وائی فائی گلی گلی ہو غالب
اور درویش کی صدا کیا ہے

(شاعر نامعلوم)

سچ بولنے والا شاعر

ملک زادہ جاوید
(نوئیڈا، بھارت)

یہ بات سچ پر مُبنی ہے کہ ڈاکٹر راحت اندوری عرصہ دراز سے مشاعروں پر حکومت کر رہے ہیں اور وہ اپنے اشعار کے ذریعہ دنیا کو سچائی کی وہ تصویر، جو کہ جھوٹ کو بے نقاب کرتی ہے پورے ادبی التزامات کے ساتھ دکھا رہے ہیں، دنیا میں روز بہ روز رونما ہونے والی یہ غیر اخلاقی، انسانیت کو شرمندہ کرنے والی ننگی حقیقتیں جسکو اس زمانے کے زیادہ تر ادیب، صحافی، شاعر، سیاست داں دیکھ کر چشم پوشی کر رہے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کے سبب اُسکے خلاف آواز اُٹھانے سے اسلئے کترا رہے ہیں کہ اُنکو برسرِ اقتدار جماعت، سماج، ایڈمنسٹریشن سے کچھ نہ کچھ پانے کی اُمیدیں باقی ہیں اور اُن کو اس سسٹم پر تنقید کر کے کچھ نہیں حاصل ہونے والا ہے بلکہ اُسکے غصہ کا شکار ہونا پڑ سکتا ہے، اسلئے یہ لوگ ڈرتے ہیں؟ ڈاکٹر راحت اندوری اس معاملہ میں ایک بیباک اور نڈر انسان ہیں، اُنہیں نہ کسی عہدے کی تلاش ہے اور نہ وہ کسی سے خوف کھاتے ہیں، سچ کو اپنی شاعری کے حوالہ سے اُجاگر کرنا ہی اُنکا مشن ہے، جس مشاعرے میں وہ ہوتے ہیں کسی دوسرے شاعر کو وہ پزیرائی اور منزلت نہیں ملتی جو اُنکے حصہ میں آتی ہے، ہوسکتا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ مشاعروں کی دنیا ڈاکٹر راحت اندوری کے کلام اور اُس میں سچ کی آمیزش کو پسند کرتی ہو؟ ڈاکٹر راحت اندوری آج مشاعروں میں اچھی شاعری کی ضرورت بن گئے ہیں، جس مشاعرے میں وہ ہوتے ہیں اُس مشاعرے کو کامیاب سمجھا جاتا ہے اور جہاں وہ نہیں ہوتے اُس مشاعرے کو سامعین کم تر درجہ کا آنکتے ہیں، اُردو کی اعلیٰ تعلیم کی ڈگری اُنکے پاس ہے یعنی وہ پی ایچ ڈی ہیں اُنکے تحقیقی مقالہ • اُردو کی ترویج و اشاعت میں مشاعروں کا کردار • عنوان پر ہے، جو کہ اُنکے مزاج سے ہم آہنگ ہے ، یہ بات بھی سچ ہے کہ اُردو ادب کے ''مٹھادھیش'' ایک مدت سے ہر اُس شاعر کو نظر انداز کر رہے ہیں جنکے پاس عوامی شہرت ہے، اسکے اسباب کی تلاش ایک دشوار گُن مسعلہ ہے مگر کچھ ضروری باتوں پر قارئین حضرات کی توجہ مبزول ضرور کرانا چاہتا ہوں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اُردو ادب کو اپنی جاگیر سمجھنے والے نقادوں کی سوچ کا دائرہ بڑا محدود ہے، وہ یا تو اُن شاعروں پر اپنا قلم اُٹھاتے ہیں جو کہ اُردو شاعری کی میراث سمجھے جاتے ہیں جن میں غالب، میر، اقبال، فیض، فراق کے علاوہ اور بہت سے کلاسیکل شعراء اور ترقی پسند شعراء کے نام آتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی ایک مستقل جگہ بنائی ہے اور Legend ہو گئے ہیں، یا یہ لوگ اُن پر قلم اُٹھاتے ہیں جن سے اُنکے کچھ ذاتی مفادات وابستہ ہوتے ہیں؟ جدید شعراء پر ابھی اُتنا نہیں لکھا گیا ہے جتنا لکھا جانا چاہیئے تھا؟ اسکی وجہ شائید یہ رہی ہو کہ اُنکے پاس مشاعروں کے حوالہ سے عوامی شہرتیں تھیں اور عوامی شہرتوں سے نقادوں کو ایک زمانے سے للّلاہی بغض ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نقادوں نے ان اہ شاعروں پر اس لئے قلم اُٹھایا ہے کہ جب ان شاعروں کی Biblio Graphy بنیں تو اُنکا نام بھی اُن پر کام کرنے والوں میں شامل ہو جائے اور وہ اسی بہانے اپنی سُرخروئی کا تمغہ اپنے سینے پر ٹانک کر گھومیں گے؟

ڈاکٹر راحت اندوری کا اُردو زبان و ادب کے فروغ میں وہ مرتبہ ہے جسکو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا، اُنھوں نے مشاعروں کے حوالہ سے نئی نسل کے غیر اُردو داں طبقہ کے لوگوں میں اپنی شاعری کی مقبولیت سے نہ صرف اُردو زبان کو سیکھنے کا رُجحان غیر اُردو داں طبقہ میں پیدا کیا بلکہ سہل ِممتنع میں شعر کہہ کر ہر خاص و عام کو اُردو شاعری سے قریب تر کیا، ڈاکٹر راحت اندوری کو یہ معلوم ہے کہ اچھے کلام کے ساتھ اگر آپکو پرفارمنگ آرٹ کی جانکاری ہے تو مشاعروں میں کامیابیاں آپکے قدموں کو چومتی ہیں ورنہ مشاعرے میں شاعر سپاٹ نکل جاتا ہے، پنڈال یا ہال کے کسی کونے سے بھی سامعین کی داد و تحسین کی صدایں بلند نہیں ہوتیں اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنا کلام سُنانے والا شاعر اچھا کلام ہونے کے باوجود پرفارمنگ آرٹ نہ آنے کے سبب ہوٹ ہو جاتا ہے۔

راحت اندوری کے کلام میں سچائی کی بازگشت ہمیں سُنائی دیتی ہے، وہ جھوٹ پر صف آرا نظر آتے ہیں، بُرائیوں پر کھُل کر تنقید کرتے ہیں، اُنکی شاعری کے مزاج میں مصلحت، چاپلوسی، خود غرضی کا عنصر شامل نہیں ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر راحت اندوری کسی بڑی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ بڑے سے بڑے لوگ اُن کے کلام اور پرفارمنس سے متاثر نظر آتے ہیں اور ایک بھیڑ مشاعروں کے بعد اُنہیں گھیر لیتی ہے۔ اُردو کی نئی بستیوں تک ڈاکٹر راحت اندوری کی رسائی ہے، نوجوان ہوں یا بزرگ سب اُنکے کلام کے سحر میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اُنکے ہم عصر شعراء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کہ اُنکی شاعرانہ صلاحیتوں کا معترف اور مداح نہ ہو، ہر چھوٹا بڑا اُنکے کلام کی تعریفیں کرتا ہوا نظر آتا ہے،

ڈاکٹر راحت اندوری نے ایوانِ شاعری میں اپنی جگہ بڑی محنت اور مشقت سے بنائی ہے، ابتدا میں وہ ایک پینٹر (Painter) تھے، رنگ اور برش سے خاکوں میں رنگ بھرا کرتے تھے، بعد میں اُنہوں نے اپنی زندگی میں جو رنگ بھرنا شروع کیا تو اُسکو وہ بلندیاں عطا کر دیں کہ اُسکی مثال بہت کم ملتی ہے • جب شعر و شاعری کی طرف وہ متوجہ ہوئے تو مشاعروں کے زریعہ عالمی سطح پر اُنہوں نے اپنی معیاری شاعری سے اپنی پہچان بنائی، لیکن ان سب کے درمیان تعلیمی سرگرمیوں سے راحت اندوری نے خود کو بے دخل نہیں ہونے دیا بلکہ علم سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا اور اُردو کی جو اعلیٰ تعلیم کا تصور ہے اُسکی ڈگری اُنہوں نے حاصل کی یعنی ڈاکٹر آف فلاسفی ہوئے کافی وقت درس و تدریس کے شعبہ سے وہ

وابستہ رہے مگر مشاعروں کی بے پناہ مقبولیت نے اُنکو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ طالب علموں کو اُتنا وقت نہیں دے سکتے جتنی اُنکو ضرورت ہے، اس لئے اُنہوں نے اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے مُلازمت کو چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنی ذاتی زندگی ہو یا شاعری ہر جگہ سچ بولا ہے، سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔

''ہے میرے چاروطرف بھیڑ گونگے بہروں کی
کسے خطیب بناؤں کسے خطاب کروں''

''امیرِ شہر کے کچھ کاروبار یاد آئے
میں رات سوچ رہا تھا حرام کیا کیا ہے''

''جرم خود کرنا اور الزام کسی پر دھرنا
یہ نیا نسخہ ہے بیمار بھی کر سکتا ہے''

''جو طور ہے دنیا کا اُسی طور سے بولو
بہروں کا علاقہ ہے زرا زور سے بولو''

ڈاکٹر راحت اندوری دنیا کی نبض پر اُنگلی رکھ کر شعر کہتے ہیں اور شائید اسی لئے اُنکو دنیا بھی اپنے کاندھوں پر بٹھائے رہتی ہے، اُنکو نہ اس بات کا ملال رہتا ہے کہ کون اُنکے بارے میں کیا کہہ رہا ہے اور نہ اُنکو اس بات کا غم ہوتا ہے کہ اُنکو اور بہت کچھ ملنا چاہئے تھا جو کہ اُنہیں ابھی نہیں ملا ہے؟ اُنکو سرکاری سطح پر ملنے والے اعزازات کی حقیقت کا علم ہے کہ اُسکو حاصل کرنے کے لئے نہ جانے کہاں کہاں کس کس کے در پر جا کر لوگوں کو سجدہ کرنا پڑتا ہے مگر ڈاکٹر راحت اندوری کا مزاج اور انا اُنہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ شعبیہ ءاقتدار کے ہاتھوں اُنکا استحصال ہو اور تملق اور چاپلوسی اُنکا شعار بنیں، وہ قلندرانہ مزاج رکھتے ہیں، اپنے اسی مزاج کے چلتیا ور اپنی مقبولیت اور کامیابی کی وجہ سے اُنہوں نے اپنے ہم عصر شعراء کو ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا کیا ہے، یہ بات بھی سچ ہے کہ جب مشاعروں کے اسٹیج پر وہ ہوتے ہیں تو بڑے بڑے شعراء کا چراغ نہیں جلتا اور کامیابیوں کا تمغہ راحت اندوری صاحب اپنے سینے پر سجا کر مشاعروں کے اسٹیج سے نیچے اُترتے ہیں

نشہ ویسے تو بُری چیز، پر راحت سے
شعر سُنتا ہو تو تھوڑی سی پلا بھی دینا''

''میں نے کچھ پانی بچا کر رکھا تھا اپنی آنکھ میں
اک سمندر اپنے سوکھے ہونٹ لیکر آ گیا''

گناہوں میں لذت کا احساس ہر اُس شخص کو ہوتا ہےجو کہ کسی (اسلام کے پیشنظر) نا جائز شئے کا عادی ہو جاتا ہے، ایسا انسان اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے کسی سطح تک جا سکتا ہے جھوٹ بولتا ہے، کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے، اپنے زرا سے فائیدے کے لئے جگنو کو خدا کا نور سمجھ کر سجدہ کرنے سے گریز نہیں کرتا، پھر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کو اس کام سے گناہ حاصل ہوگا یا ثواب، لیکن کچھ لوگ جنکا ضمیر نہیں مرتا اُنکو یہ معلوم رہتا ہے کہ وہ گناہ کریں گے تو اُسکی سزا اُنہیں ملیگی، ایسے لوگوں کو گناہ کرتے ہوئے ایک خفت اور شرمندگی کا احساس ہمیشہ رہتا ہے، مگر دل ہے کہ مانتا نہیں،

''میں نے کچھ پانی بچا کر رکھا تھا اپنی آنکھ میں
اک سمندر اپنے سوکھے ہونٹ لیکر آ گیا''

''نشہ ویسے تو بُری چیز ہے پر راحت سے
شعر سُنتا ہو تو تھوڑی سی پلا بھی دینا''

ڈاکٹر راحت اندوری شاعری اور زندگی میں ایک سیلف میڈ (Self Made) انسان ہیں، اپنی زہانت کے سبب حالات ءحاضرہ کو شاعری کے کیمرے میں مُقید کرنے کا فن اُنکو بہت اچھی طرح سے آتا ہے، اُنکی شاعری مختلف رنگوں کا گلدستہ ہے تغزل، ترقی پسندی، جدت سب کچھ اُنکے کلام میں موجود ہے، ان کے کچھ اشعار دیکھئے

''ادھر کیا کرم کسی پر اور اُدھر جتا دیا
نماز پڑھ کے آئے اور شراب مانگنے لگے''

''شاخوں سے ٹوٹ جائیں، وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے''

'' مُنتظر ہوں ستاروں کی زرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پہ بُلا لونگا اشارہ کر کے''

''بہت غرور ہے دریا کو اپنے ہونے پر
جو میری پیاس سے اُلجھے تو دھجیاں اُڑ جائیں''

'' میرے بچوں مجھے دل کھول کر تم خرچ کرو
میں اکیلا ہی کمانے کے لئے کافی ہوں''

''عشق میں جیت کے آنے کے لئے کافی ہوں
میں نہتھا ہی زمانے کے لئے کافی ہوں''

"جو جرم کرتے ہیں اتنے بُرے نہیں ہوتے
سزا نہ دے کے عدالت بگاڑ دیتی ہے"

"سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بیوقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آ گئے"

"میرے حُجرے میں نہیں اور کہیں پر رکھ دو
آسماں لائے ہو لے آؤ زمیں پر رکھ دو"

"افواہ تھی کہ میری طبعیت خراب ہے
لوگوں نے پوچھ پوچھ کے بیمار کر دیا"

"نئی ہواؤں کی صحبت بگاڑ دیتی ہے
کبوتروں کو کھلی چھت بگاڑ دیتی ہے"

"اپنے دروازے پہ میں نے پہلے خود آواز دی
اور پھر حُجرے سے میں خود ہی نکل کر آ گیا"

"اب اپنے روح کے چھالوں کا کچھ حساب کروں
میں چاہتا تھا چراغوں کو آفتاب کروں"

"یہ نیا اک چاند سورج کے برابر کون ہے
روشنی کم ہو تو یہ دیکھیں کہ چھت پر کون ہے"

مشاعروں کی حوالہ سے ایک بات عجب ہے کہ اُردو شاعری کا ہر بڑا شاعر مشاعروں کا مرہون ِ منت رہا ہے، اُسکی شاعری کو مشاعروں نے ترسیل دی ہے، اُس زمانہ میں جب لاوڈ اسپیکر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور پرنٹنگ پریس وغیرہ نہیں تھے تب چھوٹی چھوٹی نشستوں کی بازگشت پورے شہر میں سُنائی دیتی تھیں مگر جب ان آلات کا چلن عام ہو گیا تو فنون ِ لطیفہ کی ہر صنف کو پر لگ گئے، آج انٹر نیٹ اور کمپیوٹر کا زمانہ ہے، ایک منٹ میں پوری اُردو دنیا آپکے کلام کو پڑھتی یا سُنتی ہے ایسے حالات میں آپکی صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے کے بہت مواقع ہیں۔

اُردو کے بہت سے دانشوران، تنقید نگار، ایسے ادیبوں اور شاعروں کی برانڈنگ (Baranding) کر رہے ہیں جنکو اُنکے شہر میں بھی کوئی نہیں جانتا، اُنکے خیال میں جو چیز کم مُہیا ہوتی ہیا ور بکتی ہے وہ اچھی اور معیاری ہوتی ہے، جبکہ جو لوگ شاعر کے طور پر پوری دنیا میں مشاعروں کے حوالہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں، جنکو اردو عوام سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے، اُنکے نزدیک اُنکی وہ اہمیت نہیں ہوتی جتنی گمنام شاعروں اور ادیبوں کی ہوتی ہے، جسکو کوئی نہیں جانتا اُنکو صرف یہی حضرات جانتے پہچانتے ہیں اور اُنکے بارے میں لکھ رہے ہیں، اُنکی تعریفیں کر رہے ہیں ایسے لوگوں کو ڈاکٹر راحت اندوری جیسے اچھے اور معیاری شاعر جنکی شاعری عوام کے ساتھ ساتھ خواص کو بھی متاثر کرتی ہے اُن کے کلام کو نہ صرف پڑھنا چاہیئے بلکہ اُنکو سُن کر اچھی اور معیاری شاعری کے فرق کو سمجھنا چاہیئے؟

میرے والدِ محترم پروفیسر ملک زادہ منظور احمد مرحوم کا ڈاکٹر راحت اندوری کا بڑا ساتھ مشاعروں میں رہا ہے، مُشاعروں میں جہاں اک طرف میرے والد نظامت کے حوالہ سے مشاعروں میں داد و تحسین بٹورتے تھے تو دوسری طرف ڈاکٹر راحت اندوری اپنی شاعری اور پرفارمنس کے سبب مشاعرہ لوٹتے تھے، مشاعرہ کے بعد مشاعرہ میں شرکت کرنے والے بقیہ شعراء کا ذکر بس خال خال ہوتا تھا مگر میرے والد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور ڈاکٹر راحت اندوری کا ذکر اور تعریفیں اُس خطے میں جب تک دوسرا مشاعرہ برپا نہیں ہوتا تھا تب تک سُنائی دیتی تھیں۔

ڈاکٹر راحت اندوری کا ایک طویل عرصہ مُشاعروں میں گزرا ہے، اس درمیان نہ جانے کتنے شعراء مشاعرے کے اسٹیج پر اُبھرے اور گمنامی کے اندھیروں میں کہیں گم ہو گئے، لیکن ڈاکٹر راحت اندوری ایک ستارے کے مانند اُس زمانے سے لیکر آج تک عوام و خواص کے ذہن و دل میں چمک رہے ہیں تقریباً "تین نسلوں سے وہ اُردو عوام کو اپنی شاعری سے متاثر کئے ہوئے ہیں، آپ کیا اُنکا یہ کارنامہ کم سمجھتے ہیں؟ جب میں اپنے والدِ محترم پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے ساتھ مشاعرہ سُننے کے لئے ایک سامع کی حیثیت سے مشاعروں میں جاتا تھا تب میرے پسندیدہ شاعر راحت اندوری ہوا کرتے تھے، اب میں اُنکے ساتھ بیشتر مشاعروں میں بحیثیت شاعر کے مدعو رہتا ہوں، اب بھی میرے پسندیدہ شاعر راحت اندوری ہی ہیں، پھر میرے بچے اُنکی شاعری اور اُنکے پڑھنے کے انداز کے دیوانے ہیں، اگر میں کسی مشاعرے میں جاتا ہوں تب وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ڈاکٹر راحت اندوری وہاں ہونگے؟ اسکے علاوہ ٹی وی پر اگر کوئی مشاعرہ آ رہا ہے اور اُس میں ڈاکٹر راحت اندوری ہوتے ہیں تو وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ پاپا جب راحت اندوری کلام سُنائیں تو ہم لوگوں کو بُلا لیجیے گا؟

تین سہ ؤں تک اپنی شاعری کا دبدبہ قائم رکھنے والے شاعر ڈاکٹر راحت اندوری اپنی اچھی شاعری اور پرفارمنس سے ایوان ادب میں اپنی مُستقل جگہ بنا چکے ہیں حالانکہ اُن پر بہت کچھ لکھا جا چُکا ہے، اور اُن پر ادب ِ رسائل کے کئی نمبر نکل چکے ہیں مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک جتنا کام اس بڑے اور عظیم شاعر پر ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہوا ہے؟ اب کوئی بڑا تنقید نگار یا ادیب اُن پر کچھ لکھے نہ لکھے مگر سوشل میڈیا، یو ٹیوب، گوگل، فیس بک، ٹیوٹر اور دوسرے تمام سوشل سائٹ پر ڈاکٹر راحت اندوری کا کلام اور ویڈیو محفوظ ہو چکے ہیں جو کہ اُنکو سیکڑوں سالوں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

''گریباں بدست ہو جاؤ''

سراج نقوی
(بھارت)

رابرٹ لوئیس اسٹیونینس نے کہا ہے کہ 'شراب بوتل بند شاعری ہے'۔اگر راحت اندوری کی شاعری کی بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری بوتل میں بند شراب کے جام جم بن جانے کا دوسرا نام ہے جس میں آپ آج کی دنیا خاص طور پر اپنے آس پاس کی بہت سی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔راحت عصر حاضر کے ان چند شاعروں میں ہیں کہ جو مشاعروں سے فلموں تک اور فلموں سے ادب تک یکساں طور پر مقبول بھی ہیں اور معتبر بھی۔انھیں اپنے قارئین کو جھنجھوڑنے اور سامعین کو بیدار کرنے کا فن آتا ہے۔وہ جانتے ہیں کہ گونگے بہروں کے سماج میں چیخ کر بولنا ضروری ہے۔ورنہ صدا بہ صحرا ہوتے دیر نہیں لگتی۔راحت نے مشاعروں کو مترنم اور مسحور کن ماحول سے نکال کر انھیں بجلیوں جیسی گھن گرج اور ایک بالکل منفرد و بلند آہنگ سے روشناس کرایا ہے جو چنگھاڑتی ہوئے مشینی دور کا شناخت نامہ بھی ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ بلند آہنگ اور گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھنا ہی راحت کا تعارف ہو۔یہ تو محض مشاعروں میں ان کے منفرد لہجے کا ایک پہلو ہے جو انھیں اپنے سامعین میں مقبول بناتا ہے۔مشاعروں سے الگ ادب کی جو دنیا ہے ،اس میں اپنی پہچان بنانا اور سند قبولیت حاصل کرنا بڑی بات ہے لیکن راحت اندوری کو ہم عصر ادبی شاعری میں بھی نمایاں مقام حاصل ہے،اور یہ اس لیے کہ ان کی شاعری میں سوئے ہوئے ذہنوں کو جگانے اور مایوسی،شکست خوردگی و ناامیدی کے شکار عام آدمی میں حوصلوں کی الکھ جلانے کی طاقت ہے۔راحت بنیادی طور پر anti establishment شاعر ہے۔ان کی شاعری میں صاحبان اقتدار کے خلاف باغیانہ تیور انھیں اپنے بیشتر ہم عصر شعراء سے الگ کرتے ہیں۔یہ ذہنی رویہ کسی بھی جمہوری سماج میں خاص طور پر اس لیے اہم ہے کہ بغیر اپوزیشن کے جمہوریت کا وجود ہی بے معنی ہے۔خاص طور پر ایسے دور میں کہ جب مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک جمہوریت کو آمریت سے چیلنج مل رہے ہوں تو ہمارے ادیب و شاعر کو اقتدار کے خلاف اور گمراہی کے شکار نظام کے مقابلے پر آنا لازمی ہو جاتا ہے۔راحت اپنی شاعری کے توسط سے یہ فرض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔حالانکہ چند مستثنات کو چھوڑ دیں تو ان کی شاعری کسی سیاسی شخصیت یا پارٹی کے خلاف نہیں بلکہ ان کا نشانہ وہ نظام ہے کہ جو سیاسی دہشت گردوں کا یرغمال بنتا جا رہا ہے۔جس میں ایک عام آدمی کی حصول انصاف کی امیدیں اس لیے دم توڑ رہی ہیں کہ وہ دنیا کے بیشتر سماجوں میں انصاف کی ترازوؤں پر ایسے سیاسی منافع خوروں کا قبضہ ہوتے دیکھ رہا ہے کہ جو اس ترازو میں کم تولنے یا ڈنڈی مارنے کو ہی اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور نہایت بے شرمی سے اگلی ایک یا نصف صدی تک دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔راحت ایسے لوگوں کو مردہ خور پرندے کہتا ہے۔ایسے پرندے کہ جنھوں نے ہمارے سماج کو مقتل بنا دیا ہے۔وہ ایسی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے اور عوام کو بھی یہ کہہ کر آمادۂ بغاوت کرتا ہے کہ،

اب گریباں بدست ہو جاؤ
کر چکے ان سے التماس بہت

یا یہ شعر کہ،

کئی ذرات باغی ہو چکے ہیں
ستاروں کو خبر کر دی گئی ہے

راحت کی شاعری اس نظام کے خلاف ایک عام آدمی کی آواز کو استحکام اور حوصلہ دیتی ہے کہ جو کمزوروں کو بندوقوں اور تلواروں کے بل پر اپنا غلام بنا لیتا ہے لیکن راحت کی شاعری میں ان لوگوں کا دل جیتنے کی ادا ہے،اسی لیے وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ،

میں نے ملکوں کی طرح لوگوں کے دل جیتے ہیں
یہ حکومت کسی تلوار کی محتاج نہیں

راحت کی شاعری اس عام عادمی کی آواز ہے جو گلیمر کی سحر انگیزیوں میں گرفتار اس دنیا میں کوئی بڑا استارہ بننے کا شرف بھلے ہی حاصل نہ کر پائے لیکن ایک جگنو کی طرح اپنے حصے کی روشنی اس احسان فراموش دنیا کو دے کر اسے اجالنے میں اپنا اہم رول ادا کرتا ہے۔راحت ایسے لوگوں کے دکھ درد کو یہ کہہ کر بانٹتا ہے کہ،

اجالے بانٹنے والوں پہ کیا گزرتی ہے
کسی چراغ کی مانند جل کے دیکھتے ہیں

یا یہ شعر کہ،

چاند زیادہ روشن ہے تو رہنے دو
جگنو بھیا جی مت بھاری کیا کرو

راحت اندوری کی شاعری میں پائے جانے والے رجحانات کی زمرہ بندی کی جائے تو اس میں بڑی تعداد ایسے اشعار کی ہے کہ جن میں وہ جمہوری نظام کے ٹھیکیدار بن بیٹھے لوگوں کے خلاف باغیانہ تیور میں نظر آتے ہیں۔حالانکہ عصر حاضر میں ایسے اور بھی کئی شعراء ہیں کہ جو اپنی اپنی بساط بھر نظام کی ناہمواریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں لیکن راحت اندوری اپنے مخصوص رویے،صاف گوئی و بیباکی اور طنز آمیز جارحانہ انداز کے سبب منفرد نظر آتے ہیں۔ان کے لہجے کا کھرا پن،صداقت اور جراتمندی،بے ساختگی اور سادہ و دلچسپ مکالماتی زبان ان کی شاعری کو پر تاثیر بناتی ہے۔وہ قاری کے دل میں اتر جانے کا فن جانتے ہیں۔فصاحت و بلاغت کے روائتی شعبدوں اور بھاری بھرکم لفظیات سے پاک رکھ کر انھوں نے اپنی شاعری کو عوام پسند بنا دیا ہے اور ان کا خطاب بھی اس عوام سے ہی ہے۔ان کی شاعری کی ترسیل عربی یا فارسی لغت کی محتاج نہیں،وہ خود اس پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں،

ہم نے سیکھی نہیں ہے قسمت سے
ایسی اردو جو فارسی بھی لگے

راحت کی بڑی خوبی یہی ہے کہ ان کی شاعری سے ایک عام آدمی بھی محظوظ ہوسکتا ہے۔ یہ عام آدمی ہی مشاعروں میں بھی ان کا سامع ہے، سوشل میڈیا میں بھی ان کا دیوانہ ہے اوران کے ادبی مرتبے کا بھی تعین کرنے میں مدد کرتا ہے۔ راحت نے گاؤوں سے شہروں کی طرف ہونے والی ہجرت، شہروں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ کے باوجود لوگوں کے احساس تنہائی، بے روزگاری سے پیدا مایوسی، مشترکہ کنبوں کے دم توڑتے ہوئے نظام اور ٹوٹتی بکھرتی سماجی قدروں جیسے بیشمار مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ چند مثالیں دیکھیں۔

کالج کے سب لڑکے چپ ہیں کاغذ کی اک ناؤ لئے،
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بیکاری ہے
پڑھے لکھے بیکار، دردر ہیں فنکار، عالم فاضل خوار،
جاہل، ڈھور، گنوار قوم کے ہیں سردار اللہ بادشاہ
فرق نہ ان کے بیچ یہ بندر وہ ریچھ، سب کی رسی کھینچ
سارے ہیں مکار سب کو ٹھوکر مار اللہ بادشاہ
کچھ دنوں شہر کی ہوا کھا لے
سیکھ جائیگا سب ہنر تو بھی

سماج کو درپیش بے شمار مسائل میں ایک بڑا مسئلہ سیاست اور جمہوری نظام پر فریبی، نااہل، دھوکے باز اور مکار لوگوں کا قبضہ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ بھولے بھالے عوام ایسے لوگوں کے دام فریب میں آجاتے ہیں جن کا مقصد تعمیر نہیں تخریب ہے اور جو سماج کی اصلاح کی بجائے اسے گمراہی کی سمت لے جا رہے ہیں۔ راحت کی شاعری میں سیاست اور سیاست دانوں کی فریب کاریوں پر مختلف انداز میں بہت تیکھے طنز ملتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیں،

جب جی چاہے موت بچھا دو بستی میں
لیکن باتیں پیاری پیاری کیا کرو
پھولوں کی خوشبو لوٹی ہے تتلی کے پر نوچے ہیں
یہ رہزن کا کام نہیں ہے رہبر کی مکاری ہے
بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پہ بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہو گئے

اس نااہل سیاست کا پیدا کیا ہوا ایک بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات ہیں جو ہمارے سماج کو تقسیم کی سمت لے جا رہے ہیں اور ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ راحت کی شاعری میں اس مسئلے پر کہے گئے طنزیہ اشعار ان کی فکرمندی اور دردمندی دونوں ہی کا ثبوت ہیں۔

چوراہوں پر وردی والے بیٹھے ہیں
موسم پھر تیوہاروں کا ہے مولیٰ خیر
سڑک پر وردیاں ہی وردیاں ہیں
کہ آمد پھر کسی تیوہار کی ہے

راحت فرقہ پرستی اور فسادات کی پشت پناہی کرنے والوں کو ان کے اس سنگین جرم کے خطرناک نتائج سے یہ کہہ کر آگاہ کرتے ہیں کہ،

لگے گی آگ تو آئینگے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

سماج میں انتشار پھیلانے کے لیے راحت سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ میڈیا کو بھی ذمہ دار مانتے ہیں جو اپنے جمہوری فرائض سے غافل ہو چکا ہے اور جمہوریت کو مضبوط کرنے کی بجائے محض سیاست دانوں یا اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اسے کمزور کرنے کا کام کر رہا ہے۔ راحت نے میڈیا اور اس میں بھی خاص طور پر اخبارا کو اپنے بہت سے اشعار میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

لفظ گونگے ہو چکے تحریر اندھی ہو چکی
جتنے مخبر تھے وہ اخباروں کے مالک ہو گئے
دہشت کا ماحول ہے ساری بستی میں
کیا کوئی اخبار نکلنے والا ہے
ہر ایک لفظ سے چنگاریاں نکلتی ہیں
کلیجہ چاہیے اخبار دیکھنے کے لیے

راحت کے یہ اور ان جیسے بے شمار اشعار درحقیقت حالات حاضرہ کا مرثیہ ہیں۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ،

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں
ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے

لیکن راحت کی شاعری صرف حال کا ہی مرثیہ نہیں ہے بلکہ ان کے سنہرے ماضی کا تصور بھی انھیں خون کے آنسو رلاتا ہے۔ وہ ماضی کی یادوں کے سہارے حال کی شکست خوردگی کے احساس سے باہر آنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال سمیت ہمارے کئی بڑے شعرا نے ماضی کا سہارا لیکر ہی ملت کی نئی نسل کو بیداری اور عمل کا پیغام دیا ہے۔ ماضی کو صرف احساس تفاخر پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا جانا چاہیے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اپنی کھوئی ہوئی جنتوں کے حصول کا جذبہ ہر انسان کو نئے حوصلے کے ساتھ حالات سے لڑنے کے لیے توانائی بخشتا ہے۔ راحت نے بھی ماضی کا تذکرہ حال کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی غربت و افلاس اور ان کی کمزوری پر طنز کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں،

ہمارے جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیصیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں

اسی طرح کے چند اور اشعار دیکھیں،

حاشیے پر کھڑے ہوئے ہیں ہم
ہم نے خود حاشیے بنائے تھے

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہیں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائی دینگے
آج اک دانہ گندم کے بھی حقدار نہیں
ہم نے صدیوں انہی کھیتوں پہ حکومت کی ہے

بابری مسجد کی شہادت ہندوستانی مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سیکولر روایات کے لیے بھی ایک بڑا نقصان ہے ۔مسجد کے انہدام نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر کئی اعتبار سے کاری زخم لگائے ہیں۔ہندوستانی ادب میں بھی اس کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔راحت اندوری جیسے شاعر کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس زخم کی اذیت کومحسوس نہ کرتے۔ان کی شاعری میں بابری مسجد کی شہادت ایک شعری استعارہ اورمسلمانوں کے خلاف ظلم کی ایک علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔گنبد اور مینار جیسی علامتوں کا تعلق بھی اسی سے ہے۔اس موضوع پر بھی چند اشعار ملاحظہ فرمالیں۔

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے
یہ مٹی مٹیوں سے کیوں الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے
پچھلے دنوں کی آندھی میں گنبد تو گر چکا
اللہ جانے سارے کبوتر کہاں گئے
طاق میں بیٹھا ہوا بوڑھا کبوتر رو دیا
جس میں ڈیرہ تھا اسی مسجد میں تالے پڑ گئے

لیکن یہ تمام اشعار راحت کی شاعری کے صرف ایک رخ کی عکاسی کرتے ہیں۔یہ اشعار آج کی غزل کا وہ پہلو پیش کرتے ہیں جس کی طرف خود راحت نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ،

مسائل، جنگ، خوشبو، رنگ، موسم
غزل اخبار ہوتی جا رہی ہے

ظاہر ہے اگر اخبار اپنا جمہوری فرض بھول کر اقتدار کے حاشیہ بردار بن جائیں تو پھر ادیب وشاعر کی ذمہ داری ہے کہ وہ حق گوئی و بیباکی کے ساتھ سماج کی گندگی اور اس کے منفی پہلوؤں کو سامنے لائے ۔اردو غزل نے اور عصر حاضر میں راحت جیسے شعرا نے یہ فرض نبھایا ہے اور اپنے احتجاجی لہجے کے اشعار سے اقتدار کے ایوانوں کو متزلزل کرنے کا کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ راحت اندوری کی شاعری کا مرکز ومحور بڑی حد تک عصری مسائل ہیں۔انھوں نے سیاسیات،سماجیات اور اس سے وابستہ موضوعات کو اپنی شاعری میں خاص جگہ دی ہے۔ظاہر ہے کوئی بھی حساس فنکار ان حالات سے چشم پوشی کر بھی نہیں سکتا،لیکن ماضی اور حال کی مرثیہ خوانی کے باوجود انھوں نے اپنے اندر کی جمالیات کو مرنے نہیں دیا۔وہ جمالیاتی احساس جو ہماری روائتی غزل کی جان ہے اور جس کے بغیر کسی غزل گو شاعر کی تکمیل نہیں ہوتی۔راحت کی غزل میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں کہ جو بیحد سادہ اور دل نشیں ہیں اور جن میں غزل کے روائتی محبوب کا چہرہ نظر آتا ہے۔راحت کے ان اشعار میں حسن کے اشارے اور کنائے ہیں،دل میں اتر جانے والا شائستہ لہجہ ہے۔محبت کے لیے دھڑکنے والے دل کی صدا ہے۔ہجر و وصال کے لمحوں کا تذکرہ ہے اور وہ وارفتگی بھی جو محبت کا جزولاینفک ہے۔

یہ دیکھو کرچیاں ہیں آئینوں کی
سلیقے سے سنورنا چاہیے تھا
وہ گزرتا تو ہوگا اب تنہا
ایک اک رہگزر سے پوچھتے ہیں

فنی لوازمات کے اعتبار سے اگر راحت اندوری کے شعری محاسن کی بات کریں تو ان کے یہاں بہت سی نئی بحروں،قافیوں اور ردیفوں نے ان کی شاعری کو ایک انفرادیت عطا کی ہے۔روزمرہ کے الفاظ ومحاورات،قصباتی زندگی کی اصطلاحات،محاورے اور تلمیحوں نے ان کی اشعار کی عام آدمی تک ترسیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔

مضمون کے آغاز میں راحت کی مشاعروں میں مقبولیت اور شعر پڑھنے کے ان کے منفرد لہجے کا ذکر کیا گیا تھا۔اب بات ختم کرنے سے قبل پھر اس موضوع پر لوٹتے ہیں۔مشاعروں کے اس بیحد مقبول شاعر کی شخصیت کا خاص پہلو یہ بھی ہے کہ یہ مشاعرے ہی ان کے تحقیقی مقالے کا بھی موضوع رہے ہیں اور اسی پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگرہ بھی تفویض ہوئی ہے۔مشاعروں میں اپنی بیحد کامیابی کے باوجود راحت اس بات کے شاکی ہیں کہ آج کے مشاعرے خصوصاً ہندوستان کی روائتی بستیوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں کا معیار مسلسل گر رہا ہے۔راحت کی یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے۔راحت مشاعروں میں 'تالی کلچر' کے رواج پانے کے خلاف ہیں اور اس پر بھی انھوں نے ایک مضمون میں کھل کر تنقید کی ہے کہ 'اب تو شاعر خود تالیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔اس تالی کلچر نے مشاعرے کی تہذیب کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔'ان کے بہت سے اشعار بھی مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار کے موضوع پر ہیں۔اسی طرح کا ایک شعر دیکھیں:

ادب کہاں کا کہ ہر روز دیکھتا ہوں میں
تماشے روز مداریوں والے

بہرحال راحت اندوری کی شاعری جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ ایسا جام جم ہے جس میں عصر حاضر کی بہت سی تصویریں نظر آتی ہیں۔ان میں بہت سی تصویریں خوشنما اور جاذب نظر ہیں تو کچھ ایسی بھی ہیں کہ جس میں ادبی،سیاسی اور سماجی تعفن سے پُر چہرے بھی نظر آتے ہیں۔سماج کے یہ دونوں منفی اور مثبت رخ ہمیں روزازل سے ہی نظر آتے ہیں۔یہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور راحت کی شاعری اس حقیقت کا موثر اظہار ہے۔

''حرم میں نہ شوالوں میں''

اسلم چشتی
(پونے،بھارت)

ڈاکٹر راحت اندوری کا شُمار عصرِ حاضر کے خوش نصیب شعراء میں ہوتا ہے جن کی مقبولیت عوام میں بھی ہے اور خواص میں بھی ۔ یہ جہاں مُشاعروں میں واہ واہ سے نوازے جاتے ہیں وہاں اخبارات ، اور رسائل پر کتابوں کے قائین سے بھی داد پاتے ہیں۔ساری اُردو دُنیا میں انہیں شوق سے پڑھا اور سُنا جاتا ہے۔اس کی ایک نہیں کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔اُن وجوہات پر بات بھی ہوسکتی ہے لیکن فی الحال ان کے کلام پر اظہار مقصود ہے۔

اصل میں راحت اندوری کا نام مُشاعروں کے حوالے سے زیادہ مقبول ہو گیا ہے جبکہ یہ صرف مُشاعروں کے شاعر نہیں، یہ بھی سچ ہے کہ مُشاعرون میں یہ جب سے دلچسپی لینے لگے ہیں مُشاعرے کے تقاضوں کو پورا کرنے والے اشعار بھی یہ کہنے لگے ہیں اور ان performens بھی اسٹیج پر شاعر سے زیادہ اداکار سا ہوگیا ہے ۔ یہ ان کی ضرورت ہے یا مجبوری کچھ کہا نہیں جاسکتا چونکہ یہ ایک سنجیدہ اور ذمہ داری شاعر ہیں اس لئے کبھی کبھی ان کے ضمیر کی آواز بھی شعر کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔کچھ شعر مُلاحظہ فرمائیں۔ ؎

لے تو آئے شاعری بازار میں راحت میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

کہاں تک کھوٹے سکّوں میں بکے گا
کسی دن خوبئ بازار ہو جا

کاغذ کو سب سونپ دیا یہ ٹھیک نہیں
شعر کبھی خود پر بھی طاری کیا کرو

اونچے داموں پہ بکا کرتے ہیں بازار میں خواب
یہ وہ شئے ہے جو خریدار کی محتاج نہیں

ادب کہاں کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مُشاعرے میں تماشے مداریوں والے

مُشاعروں کے تماشوں کے تماشائی تو اَنگنت ہیں لیکن تماشا کرنے والے ہاتھوں کی اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔راحت اندوری بھی ان تماشوں کی زینت ہیں۔اس بات کا انہیں خود احساس ہے اس لئے موقع دیکھ کر یہ اپنی شاعری کے خاص رنگ بکھیرتے بھی نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں عام اور عوام پسند شعر بھی ہیں اور خواص پسند اشعار کا وقار بھی۔

راحت اندوری کا نیا مجموعۂ کلام بعنوانِ (کلام) شائع ہُوا ہے ۔ اس میں تازہ کلام کے علاوہ ان کے اُن مجموعوں کے کلام کا انتخاب بھی ہے جو پہلے شائع ہوچکے ہیں۔اس طرح ''کلام'' کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس میں راحت اندوری کی معیاری غزلوں کا بتدریج ارتقاء بھی نظر آتا ہے اور اسٹیج سے سُنائی جانے والی شاعری کے اشعار کے وہ رنگ بھی مل جاتے ہیں جس سے سامعین نہال ہوجاتے ہیں ایسے کچھ اشعار مُلاحظہ فرمائیں۔ ؎

مجھے خبر نہیں مندر جلے ہیں یا مسجد
مری نگاہ کے آگے تو بس دھواں ہے میاں

صلح کرتے ہیں کہ جینے کا ہُنر جانتے ہیں
ورنہ ہم جنگ کے میدان کو گھر جانتے ہیں

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مُجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

میں اپنی لاش لئے پھر رہا ہوں کاندھے پر
یہاں زمین کی قیمت بہت زیادہ ہے

عدالتیں نہ سہی جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں مراحل ضرور نکلے گا

کوڑیوں کے مول لے لی میں نے ساری کائنات
سب مری پوشاک کے پیوند گنتے رہ گئے

مُجھے قریب سے پڑھ سرسری نظر سے نہ دیکھ
میری کتاب میں دلچسپیاں بھی آئیں گی

تیرے ہاتھوں میں ہے تلوار، مرے لب پہ دعا
سورما، آ، مُجھے میدان سے باہر کردے

راحت اندوری نے شعر گوئی میں راست رُخ اپنایا ہے۔اشارے، کنائے ،استعارے ان کے پاس کم کم ہی ہیں جو بھی ہیں خوب ہیں یہ طریق کار بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔رُموزِ شاعری اور زبان کے استعمال سے یہ خوب واقف ہیں اس لئے ان کی راست گوئی پُر مغز واقع ہوئی ہے ۔شعر کی اگر نشر کی جائے تو فرق معمولی سا ہی ہوگا ۔ یہ ہُنر میر مکتب کی دین ہے جو راحت اندوری کو خوب آتا ہے۔چھوٹی بحروں میں کہے ہوئے اشعار میں بڑی گہری بات کہہ دینا کوئی میر سے سیکھے لیکن آج کے شعراء کے پاس بھی یہ ہُنر ہے لیکن اس ہُنر کے استعمال کے باوجود بہت کم شعراء کامیاب ہو پاتے ہیں ۔راحت اندوری اُن شعراء میں سے ہیں جو چھوٹی بحر میں بھی کام کی بات کہہ جاتے ہیں۔مثلاً

ماضی ہو یا مُستقبل
اپنی وہی بے حالی ہے

سب لکیروں پہ چھوڑ رکھا ہے
آپ بھی کچھ کمال رکھا کرو

تقریروں میں سب کے جوہر کھُلتے ہیں

اندر جو پلتا ہے باہر آتا ہے
دل پر کس نے دستک دی
تُم ہو یا تنہائی ہے
ورنہ اوقات کیا تھی سایوں کی
دھوپ نے حوصلے بڑھائے تھے
شہرِ دل میں ہے عجب سنّاٹا
تیری یاد آئے تو ہلچل ہو جائے
آنسو باغی ہو سکتے ہیں
ہنستے رہنا ٹھیک نہیں ہے

راحت اندوری کسی مخصوص بحر میں شعر نہیں کہتے ان کے اشعار مُختلف بحروں میں ہوتے ہیں۔ بحر کا انتخاب مواد کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے یہ سُخن کا کمال ہے۔ بحُور سے واقف اور عروض داں شعراء بحر اور فن کا لُطف راحت اندوری کے کلام سے اُٹھا سکتے ہیں۔ سہل زبان کا استعمال انہیں خوب آتا ہے۔ جس سے ترسیل میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ بات ان کی ساری شاعری پر صادق آتی ہے۔

'' کلام'' کے سارے کلام میں درد بھی ہے غم بھی ہے۔ چھپے دبے جذبات کا اظہار بھی ہے صدی کا مشترکہ درد بھی ہے انسانی مسائل کی غمازی بھی ہے۔ شخصی خیالات کا بیباک اظہار بھی ہے اس مجموعہ کے کلام میں یکسانیت نہیں ورائٹی ہے، اُسلوب بھی مُختلف ہے۔ لفظیات خیال کو واضح کرنے کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کے انتخاب میں تھوڑی سی سختی کی جاتی اور غزلیں مُنتخب کرتے وقت ردّوقبول کے مراحل سے گزرا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ راحت اندوری کا شُمار آج کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے چاہنے والے (fans) کی بھی کمی نہیں ہے ایسے شاعر کا ایک ایک مصرع غور سے پڑھا جاتا ہے۔ اشعار یاد رکھ کر لوگ ایک دوسرے کو سُناتے ہیں۔ شائقین کا یہ عمل شاعر کا اعتبار بڑھاتا ہے اور اس کے مقام کا تعیّن کرتا ہے۔ اور یہی بات ہم خالص ادبی حلقوں، شاعرو، نقّادوں اور اسکالروں کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ '' کلام'' کی ساری غزلیں اہلِ نظر لوگوں کو امتحان میں ڈال دیتی ہیں۔ جہاں تک میرے ذوقِ سُخن کی بات ہے مجھے ان کے کلام سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ میں انہیں ہمیشہ غور سے سُنتا اور پڑھتا رہا ہوں ان کے کچھ شعر ازبر بھی ہیں۔ اکثر گفتگو کے دوران کبھی کبھی میں ان کے نام کا حوالہ دے کر ان کے شعر سُناتا بھی ہوں جیسے۔

مسجدوں کے صحن تک جانا بہت دُشوار تھا
دیر سے نکلا تو میرے راستے میں دار تھا
خانقاہوں میں حرم میں نہ شوالوں میں ملے
وہ فرشتے جو کتابوں کے حوالوں میں ملے

خوشی سے دور علم سے قریب لگتے ہیں
تمہارے شہر کی انساں عجیب لگتے ہیں
انصاف ظالموں کی حمایت میں جائے گا
یہ حال ہے تو کون عدالت میں جائے گا

اب میں راحت اندوری کی خُمریاتی شاعری کی بات کرنا چاہوں گا دراصل بات یہ ہے کہ اُردو شاعری میں ابتداء سے ہی شراب لفظ کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ شراب کو شعراء نے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ استعاروں سے کئی مفہوم نکالے ہیں۔ یہ آج کے شاعروں میں بھی کچھ کلاسک انداز کی غزلیں کہنے والے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن راحت اندوری اُن شاعروں میں سے ہیں جو شراب کو حقیقی شراب کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

تجربہ اپنا اسد سے کچھ الگ ہے دوستوں
مئے ضروری شئے ہے یک گونا خُماری کے لئے
وہ دیکھو میکدے کے راستے میں
کوئی اللہ والا جا رہا ہے
میکدہ ظرف کے معیار کا پیمانہ ہے
خالی شیشوں کی طرح لوگ اُچھلتے کیوں ہیں
شریف لوگ تو مسجد میں جا کے بیٹھ گئے
وہ جانتے تھے کہ راحت شراب مانگے گا
شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے

مجموعۂ کلام '' کلام'' کی غزلوں میں عصرِ حاضر کے انسان کی زندگی کی گونج نُمایاں طور پر سُنائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے زندگی مجموعی طور پر پوری طرح قابلِ فہم نہیں ہوتی۔ جس کی جتنی عقل، جتنی فہم اُتنی ہی نظر آتی ہے۔ راحت اندوری پر اسکالروں نے بھی کام کیا ہے۔ کررہے ہیں اور نقّادوں نے بھی لکھا ہے لکھ رہے ہیں۔ '' کلام'' کا سُخن مُستقبل میں کھُل کر سامنے آئے گا۔

'' لُچّے''

مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں۔۔۔ چہل قدمی کے دوران چند دن میں ایک محترمہ سے تعلق ہوگیا، اس نے پوچھا آپ کیا کرتے ہیں؟

میں نے کہا، کتابیں لکھتا ہوں، چنانچہ انہوں نے کتابیں لے کر پڑھیں۔ اگلے ہفتے میں نے پوچھا کتاب کیسے لگی؟

بولیں: شکل سے تو آپ اتنے لچے نہیں لگتے۔

''شیشے کا بدن''

(جناب راحت اندوری کے غزلیہ کلام کا نکھار)

اُفق دہلوی (لاہور)

☆

ندی نے دھوپ سے کیا کہہ دیا روانی میں
اجالے پاؤں پٹکنے لگے ہیں پانی میں
یہ کوئی اور ہی کردار ہے تمہاری طرح
تمہارا ذکر نہیں ہے مری کہانی میں
اب اتنی ساری شبوں کا حساب کون رکھے
بڑے ثواب کمائے گئے جوانی میں
چمکتا رہتا ہے سورج مکھی میں کوئی اور
مہک رہا ہے کوئی اور رات رانی میں
یہ موج موج نئی ہلچلیں سی کیسی ہیں
یہ کس نے پاؤں اتارے اداس پانی میں
میں سوچتا ہوں کوئی اور کاروبار کروں
کتاب کون خریدے گا اس گرانی میں

○

☆

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے
ہمیشہ سر پہ رہی اک چٹان رشتوں کی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اٹھایا ہے
مری غلیل کے پتھر کا کارنامہ تھا
مگر یہ کون ہے جس نے ثمر اٹھایا ہے
یہی زمیں میں دبائے گا ایک دن ہم کو
یہ آسمان جسے دوش پر اٹھایا ہے
بلندیوں کو پتہ چل گیا کہ پھر میں نے
ہوا کا ٹوٹا ہوا ایک پر اٹھایا ہے
مہا بلی سے بغاوت بہت ضروری ہے
قدم یہ ہم نے سمجھ سوچ کر اٹھایا ہے

○

☆

کہیں اکیلے میں مل کر جھنجھوڑ دوں گا اسے
جہاں جہاں سے وہ ٹوٹا ہے جوڑ دوں گا اسے
مجھے وہ چھوڑ گیا یہ کمال ہے اس کا
ارادہ میں نے کیا تھا کہ چھوڑ دوں گا اسے
بدن چرا کے وہ چلتا ہے مجھ سے شیشہ بدن
اسے یہ ڈر ہے کہ میں توڑ پھوڑ دوں گا اسے
پسینے بانٹتا پھرتا ہے ہر طرف سورج
کبھی جو ہاتھ لگا تو نچوڑ دوں گا اسے
مزہ چکھا کے ہی مانا ہوں میں بھی دنیا کو
سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا اسے

...... ○ ......

☆

اچھی سے اچھی آب و ہوا کے بغیر بھی
زندہ ہیں کتنے لوگ دوا کے بغیر بھی
سانسوں کا کاروبار بدن کی ضرورتیں
سب کچھ تو چل رہا ہے دعا کے بغیر بھی
برسوں سے اس مکان میں رہتے ہیں چند لوگ
اک دوسرے کے ساتھ وفا کے بغیر بھی
اب زندگی کا کوئی بھروسہ نہ رہا
مرنے لگے ہیں لوگ قضا کے بغیر بھی
ہم بے قصور لوگ بھی دلچسپ لوگ ہیں
شرمندہ ہو رہے ہیں خطا کے بغیر بھی
چارہ گری بتائے اگر کچھ علاج ہے
دل ٹوٹنے لگے ہیں صدا کے بغیر بھی

○

☆

جب کبھی پھولوں نے خوشبو کی تجارت کی ہے
پتے پتے نے ہواؤں سے شکایت کی ہے
یوں لگا جیسے کوئی عطر فضا میں گھل جائے
جب کسی بچے نے قراں کی تلاوت کی ہے
جائے نمازوں کی طرح نور میں اجلائی سحر
رات بھر جیسے فرشتوں نے عبادت کی ہے
سر اٹھائے تھیں بہت سرخ ہوائیں پھر بھی
ہم نے پلکوں سے چراغوں کی حفاظت کی ہے
مجھے طوفانِ حوادث سے ڈرانے والوں
حادثوں نے تو میرے ہاتھ پہ بیعت کی ہے
آج ایک دانۂ گندم کے بھی حقدار نہیں
ہم نے صدیوں انہیں کھیتوں پہ حکومت کی ہے

○

☆

روز تاروں کو نمائش میں خلل پڑتا ہے — چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے
میں سمندر ہوں کلہاڑی سے نہیں کٹ سکتا — کوئی فوّارہ نہیں ہوں جو اُبل پڑتا ہے
کل وہاں چاند اُگا کرتے تھے ہر آہٹ پر — اپنے راستے میں جو ویران محل پڑتا ہے
نا تعارف ، نا تعلق ہے مگر دل اکثر — نام سنتا ہے تمہارا تو اُچھل پڑتا ہے
اسی یاد آئی ہے سانسوں، ذرا دھیرے چلو — دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

...... ○ ......

☆

رات کون وہاں جائے جہاں آگ لگی
صبح اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی
آگ سے آگ بجھانے کا عمل جاری تھی
ہم بھی پانی لیے بیٹھے تھے جہاں آگ لگی
وہ بھی اب آگ بجھانے کو چلے آئے ہیں
جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہاں آگ لگی
کس کو فرصت تھی جو دیتا کسی آواز پہ دھیان
چیختا پھرتا تھا آوارہ دھواں آگ لگی
صبح تک سارے نشانات مٹا ڈالیں گے
کوئی پوچھے گا تو کہہ دیں گے کہاں آگ لگی

○

☆

جو میرا دوست بھی میرا ہمدم بھی ہے
وہ شخص صرف بھلا ہی نہیں، بُرا بھی ہے
میں پوجتا ہوں جسے اُس سے بے نیازی بھی ہے
میری نظر میں وہ پتھر بھی ہے، خدا بھی ہے
سوال نیند کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
ہمارے سامنے خوابوں کا مسئلہ بھی ہے
جواب دے نہ سکا اور بن گیا دشمن
سوال تھا کہ تیرے گھر میں آئینہ بھی ہے
ضرور وہ میرے بارے میں رائے دے لیکن
یہ پوچھ لینا مجھ سے کبھی وہ ملا بھی ہے

○

☆

سفر کی حد ہے وہاں تک کی کچھ نشان رہے
چلے چلو کہ جہاں تک یہ آسمان رہے
یہ کیا اُٹھائے قدم اور آ گئی منزل
مزہ تو تب ہے کہ پیروں میں کچھ تھکان رہے
وہ شخص مجھ کو کوئی جعلساز لگتا ہے
تم اُس کو دوست سمجھتے ہو پھر بھی، دھیان رہے
مجھے زمیں کی گہرائیوں نے دبا لیا
میں چاہتا تھا میرے سر پہ آسمان رہے
اب اپنے بیچ مراسم نہیں عداوت ہے
مگر یہ بات ہمارے ہی درمیاں رہے
ستاروں کے فصلیں اُگا نہ سکا کوئی
میری زمیں پر کتنے ہی آسمان رہے
وہ اک سوال ہے پھر اُس کا سامنا ہوگا
دعا کرو کہ سلامت میری زبان رہے

...... ○ ......

☆

ساتھ منزل تھی مگر خوف و خطر ایسا تھا
عمر بھر چلتے رہے لوگ سفر ایسا تھا
جب وہ آئے تو میں خوش بھی ہوا شرمندہ بھی
میری تقدیر تھی ایسی مرا گھر ایسا تھا
حفظ تھیں مجھ کو بھی چہروں کی کتابیں کیا کیا
دل شکستہ تھا مگر تیز نظر ایسا تھا
آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں اک تنہا شجر ایسا تھا
لوگ خود اپنے چراغوں کو بجھا کر سوئے
شہر میں تیز ہواؤں کا اثر ایسا تھا

○

☆

چمکتے لفظ ستاروں سے چھین لائے ہیں
ہم آسماں سے غزل کی زمین لائے ہیں
وہ اور ہوں گے جو خنجر چھپا کے لاتے ہیں
ہم اپنے ساتھ پھٹی آستین لائے ہیں
ہماری بات کی گہرائی خاک سمجھیں گے
جو پربتوں کے لیے خوردبین لائے ہیں
ہنسو نہ ہم پہ کہ ہر بد نصیب بنجارے
سروں پہ رکھ کے وطن کی زمین لائے ہیں
مرے قبیلے کے بچوں کے کھیل بھی ہیں عجیب
کسی سپاہی کی تلوار چھین لائے ہیں

○

☆

کشتی تیرا نصیب چمکدار کر دیا — اس پار کے تھپیڑوں نے اُس پار کر دیا
افواہ تھی کہ میری طبیعت خراب ہے — لوگوں نے پوچھ پوچھ کے بیمار کر دیا
راتوں کو چاندنی کے بھروسے نہ چھوڑنا — سورج نے جگنوؤں کو خبردار کر دیا
رُک رُک کے لوگ دیکھ رہے ہیں میری طرف — تم نے ذرا سی بات کو اخبار کر دیا
اِس بار ایک اور بھی دیوار گر گئی — بارش نے میرے گھر کو ہوادار کر دیا
بولا تھا سچ تو زہر پلایا گیا مجھے — اچھائیوں نے مجھے گنہگار کر دیا
دو گز سہی یہ میری ملکیت تو ہے — اے موت تُو نے مجھے زمیندار کر دیا

...... ○ ......

''خوشبوئے دَہن''

حمد باری تعالیٰ

نسیم سحر (راولپنڈی)

اُور کوئی بھی کہاں ہے بیکنار و بیکراں
خالقِ کون و مکاں ہے بیکنار و بیکراں

یہ تو اس کی بیکرانی کا فقط اک جزو ہے !
کائناتی کہکشاں ہے بیکنار و بیکراں

بیکرانی، بے کناری کی کوئی حد ہی نہیں
ایں کراں تا آں کراں ہے بیکنار و بیکراں

بیکرانی کی حدوں سے ماورا بھی ہے وہی
وہ جو اِن کے درمیاں ہے بیکنار و بیکراں

اُن زمینوں کی بھی کوئی حد نہیں جو اُس کی ہیں
صاحبِ ہفت آسماں ہے بیکنار و بیکراں

'کُن' سے پہلے بھی وہی تھا، بعد میں بھی ہے وہی
از مکاں تا لامکاں ہے بیکنار و بیکراں

اُور تو کوئی نہیں جائے پنہ اپنے لیے
ایک اُس کا سائباں ہے بیکنار و بیکراں

ہر گھڑی کرتے ہیں وہ اللہ کی حمد و ثناء
حلقۂ کرّ و بیاں ہے بیکنار و بیکراں

روشنی ہے سلسلہ در سلسلہ در سلسلہ
نور کا اک کارواں ہے بیکنار و بیکراں

کب سمٹ پائی بڑائی اُس کی لفظوں میں نسیم
داستاں در داستاں ہے بیکنار و بیکراں

نعت مبارکہ

مشکل مری آساں ہوئی، صدقے درودؐ کے
قرآں سے ہے عیاں ہوئی، صدقے درودؐ کے

سُن لی جو عجز و زاری سے کہتی چلی گئی
میری دُعا زباں ہوئی، صدقے درودؐ کے

جو کیفیت تھی اپنی کسی سے چھپنی نہ تھی
ہر حرف سے بیاں ہوئی، صدقے درودؐ کے

لہریں ہوا کی تیزی سے بڑھتی چلی گئیں
کشتی تھی بادباں ہوئی، صدقے درودؐ کے

سفر حجاز کی تھی تمنا تو روز و شب
پوری وہ بے گماں ہوئی، صدقے درودؐ کے

جو آج تک نہ مل سکا تھا، مل وہی گیا
قسمت تھی مہرباں ہوئی، صدقے درودؐ کے

شب تو کٹی تھی گریۂ و زاری سے نازلی
رو کر وضو، اذاں ہوئی، صدقے درودؐ کے

شگفتہ نازلی (لاہور)

نعتِ رسول مقبول ﷺ

اعزاز سخن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''
خوشبوئے دَہن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''

ہر سمت ہے اک گونج سی بس! صلِّ علیٰ کی!
تقدیسِ چمن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''

ہے تازگی روح و بدن ذکر نبی سے!
تزئین زمن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''

سرکار کے دربار پہ جانا ہے عبادت
روضے کی لگن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''

خورشید و قمر اور ستاروں کے مزّین!
تابندہ گگن ''سرورِ عالم کی ثنا ہے''

الفاظ سے ہوں کیوں نہ معطّر یہ فضائیں!
''عنوانِ سخن سرورِ عالم کی ثنا ہے''

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

لَو جہاد

(LOVE JEHAD)

شموئل احمد

(حیدرآباد، دکن)

نیلما خوب صورت نہیں تھی اور کاشف بھی کوئی یوسف نہیں تھا۔ کاشف کی آنکھیں گول اور چھوٹی تھیں۔اس کی ہنسی مدھم تھی۔وہ ہاہاہا کر کے ہنستا تھا۔نیلما کی ہنسی مترنم تھی۔اس کا جسم فربہ تھا اور کولہے ابھرے ہوئے تھے۔اس کے ہونٹوں کے ٹھیک اوپر دائیں طرف تل تھا۔شروع شروع میں کاشف نے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن یہ تل اب کاشف کو اپنے وجود کا احساس دلانے لگا تھا۔نیلما جب مسکراتی تو تل بھی مسکراتا اور کاشف کو اشارے کرتا۔کاشف کا جی چاہتا تل کو انگلیوں سے چھو کر دیکھے۔

ایک شمبھو ہے جو خشمگیں آنکھوں سے گھورتا ہے۔یہ اجگری ہیرو ہے اور معافی نامہ لے کر پیدہ ہوا ہے۔یہ کسی بھی ملیچھ کو سڑک سے اٹھا سکتا ہے اور کچل سکتا ہے۔یہ دیش بھکتی کا نیا نام ہے۔پچھلے سال اجگری ہیرو کی زد میں اخلاق آیا تھا۔پھر جنید، پہلو خاں، افرازل، اورا کبر اس کے شکار ہوئے تھے۔اور نیلما بے خبر تھی کہ آسمان کا رنگ سرخ ہے۔۔۔

نیلما کو اسلام سے دلچسپی تھی۔وہ ذاکر نائک کے وی ڈی او دیکھتی تھی۔اس کو اس بات کا قلق تھا کہ نائک ہندوستان سے باہر چلے گئے۔یہاں ہوتے تو ان سے ملتی اور سوالات پوچھتی۔مثلاً مساوات کیا ہے اور یہ کہ دادا کی زندگی میں باپ کے مرنے پر بیٹا مجوب کیوں ہو جاتا ہے۔؟ وہ اس طرح کے سوال کاشف سے بھی کرتی تھی۔کاشف کی مذہبیات سے دلچسپی نہیں تھی۔وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتا تو نیلما کوفت محسوس کرتی اور ٹھنک کر کہتی'' آخر کس سے پوچھوں؟'' اور کاشف مسکراتا۔اس کو نیلما کی یہ ادا پسند تھی۔وہ جان بوجھ کر بھی اپنی لاعلمی ظاہر کرتا۔لیکن ایک بار اس نے پوچھا تھا کہ جہاد کیا ہے تو کاشف نے حضرت علی کا واقعہ سنایا کہ ایک بار جنگ میں انہوں نے حریف کو زمین پر پٹخ دیا اور خنجر کھینچا کہ سینے میں پیوست کر دوں۔حریف سے کچھ بن نہیں پڑا تو اس نے منھ پر تھوک دیا۔حضرت کو غصہ تو بہت آیا لیکن برداشت کیا اور خنجر پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا'' اب نہیں ماروں گا۔'' حریف حیران تھا کہ اتنی بے عزتی کے باوجود بھی معاف کر دیا۔حضرت علی نے فرمایا کہ اسی لیے تو نہیں ماروں گا۔ابھی مارتا تو یہ جہاد نہیں ہوگا۔یہ انتقام ہوگا۔انا کی تسکین ہوگی۔نیلما بول اٹھی کہ یہ تو حضرت عمر کا واقعہ ہے۔کاشف نے پوچھا کہ اسے کیسے پتہ ہے تو بتایا کہ رجنیش نے کہیں لکھا ہے۔کاشف نے کہا وہ کنفیوژ ہو گیا ہے۔اب صحیح معلومات حاصل کرنی ہوگی۔نیلما نے لفظ کنفیوژ کو دہرایا اور زور سے ہنس پڑی۔اس کی ہنسی میں جھرنے کا ترنم تھا۔

یہ ہنسی اجگر نے سنی۔

''پتہ کرو کہاں رہتی ہے؟''

نیلما اس دن دفتر سے نکلی تو ایک شخص کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا۔وہ بائک پر سوار تھا۔رفتار دھیمی تھی۔اس نے نیلما سے ایک فاصلہ بنائے رکھا تھا۔وہ ایک دکان میں داخل ہوئی تو اس شخص نے بھی رفتار روک دی۔نیلما نے مڑ کر دیکھا۔وہ بائک پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔اس نے چہرہ اخبار سے ڈھک رکھا تھا۔نیلما نے دکان سے نکل کر آٹو کیا اور ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔وہ اب بائک اسٹارٹ کر رہا تھا۔نیلما کو خوف محسوس ہوا۔لیکن وہ دور تک پیچھا نہیں کر سکا۔آٹو چوک کا سگنل کراس کر گیا لیکن بائک ٹریفک کی بھیڑ میں سگنل پر رکی رہ گئی۔

نیلما نے دوسرے دن کاشف سے ذکر کیا۔

''اجگری تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔یہ لوگ لڑکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔لڑکی کب گھر سے نکلتی ہے کہاں جاتی ہے، کس سے ملتی ہے کتنا وقت کہاں گذارتی ہے سب کی خبر رکھتے ہیں۔لڑکی جہاں سے موبائل ری چارج کراتی ہے وہاں سے نمبر حاصل کرتے ہیں۔ہر شہر میں ان کا نٹ ورک ہے۔مختلف جگہوں پر سنگٹھن کا نام مختلف ہے لیکن مقصد ایک ہے۔

کاشف نے کتاب''لو جہاد لاپتہ عورتیں'' کے متعلق بھی بتایا جو کیرل میں شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں والدین کے لیے ہدائت ہے۔لڑکیوں کے موبائل پر نظر رکھو۔بیٹی کا ای میل پاس ورڈ پتہ ہونا چاہیے۔اور کمپوٹر ایسی جگہ ہو جو سب کو پتہ ہو۔بیٹی کے سب دوستوں پر بھی نظر ہونی چاہیئے۔

''بہت جلد تمہارے گھر میں یہ دھاوا بولینگے۔''

''میرے بارے میں انہیں کسی نے بتایا ہوگا'' نیلما فکر مند ہو گئی۔

''خطرہ تم کو نہیں مجھے ہے۔یہ لوگ لڑکیوں کو سختی سے سمجھاتے ہیں۔والدین سے بھی باتیں کرتے ہیں کہ لڑکی کو قابو میں رکھو۔لیکن لڑکی نہیں مانتی اور ملنا جلنا جاری رہتا ہے تو لڑکے کو لنچنگ کا نشانہ بناتے ہیں۔''

'' دلچسپ بات یہ ہے کہ ایم ایچ کو بڑھاوا دیتے ہیں'' ۔کاشف مسکرایا۔

''ایم ایچ یعنی مسلم لڑکی اور ہندو لڑکا۔ایسی شادی کے لیے انعام بھی مقرر کر رکھا ہے۔ان کا آرگنائزیشن بہت مضبوط ہے۔یہ ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ان کی پشت پر اہل عمارت ہیں۔اجگر منڈلی ان کی مدد کرتی ہے۔اس لیے بے خوف لنچنگ کرتے ہیں اور وی ڈی او وائرل کرتے ہیں''

نیلما شام کو دفتر سے نکلی تو وہ آدمی پھر نظر آیا۔ایک دکان کے قریب بائک روک کر کھڑا تھا۔نیلما الٹے پاوں واپس ہوئی۔کچھ دیر رکی رہی۔پھر عقبی دروازے سے نکلی اور گلی میں گھس گئی۔وہاں رکشہ پکڑا اور گھر پہنچی۔اسی دن نیلما کو

واٹس اپ پر کسی سنتوش کا میسج ملا کہ غلط راستے پر چل رہی ہو۔انجام برا ہوگا۔نیلما نے جوابی میسج کیا کہ اسے اسلام پسند ہے۔سنتوش نے میسج کا اسکرین شارٹ لیا اور سوشل میڈیہ پر وائرل کر دیا۔

لو جہاد اجگر کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ان کا رویّہ اب قبائلیوں جیسا ہے۔کچلنے کا عمل ان کا پسندیدہ کھیل بن چکا ہے۔اس کھیل میں مقابل کی پہچان مذہب ذات پات اور نسل کی بنا پر ہوتی ہے اور اس منظر نامے میں آدمی سرکار کی جگہ لے لیتا ہے۔خود قانون بن جاتا ہے اور فیصلہ کر لیتا ہے کہ سامنے والے کو کب اور کہاں کچلنا ہے۔

اجگر گھر میں گھس آئے۔

''کہاں ہے ری تیری بیٹی؟'' بوڑھے باپ کی کمر پر ایک ڈنڈا جمایا۔

''بھرشٹ ہوگئی ہے۔''

''میاں کے ساتھ آنکھ مٹکّا کرتی ہے۔''

''بیٹی کو سمجھا دو نہیں تو کاٹ کر رکھ دینگے....'' کمر پر اور دو چار ڈنڈے۔۔۔

گھر کا قیمتی سامان بھی توڑا..

''سارا گھر پھونک دینگے۔''

نیلما نے تھانے میں سانحہ درج کرایا۔

نیلما یہ سوچ کر حیران تھی کہ ۱۹۵۴ کے اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت دو مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں شادی کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔۔۔؟

''تم نہیں کر سکتیں''

''کیوں؟''

''عمارت' نے اسے لو جہاد کا نام دیا ہے۔''

''میں تجدید اسلام کرونگی۔''

کاشف نے اس کی پلکیں چومیں

نیلما نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔۔۔

اور کاشف کی نگاہوں میں دھند چھانے لگی۔۔۔ دھند سے ابھرتا ہے شمبھو ناتھ ۔۔۔اجگری ہیرو۔۔۔جینس اور گلابی قمیض میں ملبوس۔۔۔آنکھوں میں کالا چشمہ، پاؤں میں سفید جوتے اور ہاتھ میں کلہاڑی۔۔۔اور کاشف کو نظر آتی ہے. ایک پیٹھ جس پر مسلم حکمرانوں سے وابستہ بیمار ہسٹری کے اوراق چسپاں ہیں۔یہ پیٹھ کسی مزدور کی نہیں ہے جو بنگال سے چل کر آیا ہے۔۔۔یہ مسلمان کی پیٹھ ہے جس نے بہت سے مندر توڑے ہیں۔۔۔سومنات کو لوٹا ہے۔۔۔جو ہندو لڑکیوں کو اپنی محبت کے جال میں پھنساتا ہے۔جو کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنا چاہتا ہے۔۔۔اس پر وار کرو۔۔۔یہ ملیچھ ہے۔۔۔ملیچھ کو مارنے کی اتنی ہی سزا ہے جتنی کتّے یا بلّی کو مارنے کی ہو سکتی ہے۔ہیرو کلہاڑی سے وار کرتا ہے۔۔۔مسلمان گر جاتا ہے۔۔۔ہیرو دوسرا وار کرتا ہے۔۔۔اور پے در پے وار کرتا ہے۔پھر جھک کر اطمنان کرتا ہے کہ مرا یا نہیں۔۔۔مرنے کے باوجود بھی کئی بار کلہاڑی چلاتا ہے۔پھر کیمرے کی طرف مڑتا ہے اور لو جہاد پر تقریر کرتا ہے۔لاش پر کراسن تیل چھڑکتا ہے اور آگ لگا دیتا ہے۔کیمرے کے سامنے آتا ہے اور اپنی فتح کا علان کرتا ہے۔۔۔

یہ اعلان مغلوں پر ہندووں کی فتح کا اعلان ہے۔

یہ شمبھو ناتھ نہیں ہے۔یہ اہل عمارت کا رانا پرتاپ ہے۔

ایسے ہزار رانا سڑک پر آ جاتے ہیں۔اپنے ہیرو کی جے جے کار کرتے ہیں اور ہائی کورٹ کی چھت پر بھگوا جھنڈا لہراتے ہیں۔۔۔

کھیا خاموش ہے۔اور کاشف حیران ہے کہ شمبھو ناتھ کو کس نے یہاں تک پہنچایا۔۔۔؟ اس کے وجود کو اجگر منڈلی نے ممکن بنایا ہے۔۔۔عمارتی سکّے کا دوسرا پہلو۔۔۔تصویر کا دوسرا رخ۔۔۔واٹس اپ گروپ سے شمبھو کو تعاون مل رہا ہے۔شمبھو کے اعزاز میں نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔کھاتے میں پیسے جمع کیے جا رہے ہیں ۔ جب تک شمبھو ناتھوں کی اکثریت ہے اہل عمارت اقتدار میں رہیں گے۔شمبھو اہل عمارت کی نفرت کا استعارہ ہے۔یہ فاشسزم کی مہر ہے جو عمارت نے لگائی ہے۔

لیکن نیلما اور کاشف خوف زدہ نہیں تھے۔وہ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔نیلما نے کاشف کو مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جائے۔کاشف کا جواب تھا کہ تب وہ اپنی لڑائی لڑ نہیں سکے گا۔وہ لوگ اسے کہیں نہ کہیں ڈھونڈ لیں گے اور وہ کتّے کی موت مارا جائے گا۔اقلیت پر ایک جنگ تھوپی جا رہی ہے ۔ جنگ لڑی جائے گی ۔اس نے ایک بندوق خریدی اور نیلما کی آنکھوں میں دھنک کے تمام رنگ لہرا گئے۔

''مجھے تم پر فخر ہے۔''

کاشف نے نیلما کی پلکوں پر ستارے ثبت کیے۔

نیلما نے تجدید اسلام کیا۔نیا نام پڑا 'زینب کاشف'۔

امارت شرعیہ میں ہی دونوں کا نکاح ہوا۔نکاح نامہ لے کر کورٹ میں اپنی شادی کا حلفیہ بیان درج کرایا اور گھر آ گئے۔

رات حسین تھی۔چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔درختوں کے پتّے ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔دونوں دنیائے مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں ضم تھے۔رات مقدّس لمحوں کو اپنے دامن میں جذب کر رہی تھی۔۔۔

اچانک شور سنائی دیا۔ فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔کاشف نے بندوق سمبھالی۔دروازہ کھول کر باہر آیا۔اژدہوں کا ہجوم بڑھتا آ رہا تھا۔

کاشف نے پوزیشن سنبھالی۔

جنگ شروع ہو چکی تھی۔۔۔

فٹ پاتھ جج

آغا گل
(کوئٹہ)

والدِمحترم کا خیال تھا کہ دن بھر پڑھتا رہوں۔ سقراط بقراط بن جاؤں میرا دل زیارت میں پڑا رہتا۔ جہاں صنوبر ہوٹل کا کمرہ نمبر چار میری راہ دیکھتا۔ ہوٹل کے مالک ملک مومن خان کا بیٹا میرا دوست تھا۔ بچپن میں جب ہم زیارت پرائمری سکول میں ٹاٹ پر بیٹھ کر علم حاصل کرتے تو ہماری ایک ٹاٹیرین جماعت بن گئی۔ جیسے کہ لاہور کی راوین لہٰذا ہماری گہری دوستی تھی جس کے باعث ادھار بھی چلتا۔ سر زیرِ بار مومن کیے ہوئے خوشگوار دن صنوبر کی وادیوں میں گزارتا۔ کچھ عرصہ سرزنش کرنے کے بعد ایک روز جلال اکبری میں آ گئے۔ نام جو اکبر خان تھا۔ حکم ہوا کہ چلو میرے ساتھ پہرے پہ جلال تھا۔ ماں نے اشارہ کیا کہ چپت ہو جاؤ کیا خبر رسم ابراہیمی کے لیے ہی لیتے جا رہے ہوں۔ مگر ان کے ہاتھ میں چھری نہ تھی، انگلیوں میں سگریٹ تھی اور سگریٹ سے کسی کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے حسرت بھری نظر ماں پہ ڈالی اور گنگناتا ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا'' ساتھ ہولیا۔ خلافِ توقع بلدیہ ہوٹل کے لان میں لے گئے۔ بکرے کو بھی کھلا پلا کر ہی قربان کیا جاتا ہے۔ میں نے وقتِ آخر سمجھ کو خوب سموسے کھائے۔ اتنے میں ان کا دوست اکبر خان چلا آیا، علیک سلیک ہوئی۔ والد نے کہا اکبر یہ نالائق میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اسے تعلیم دو کردار سکھاؤ کئی کئی روز پہاڑوں میں رہتا ہے۔ شکار کے لیے غائب ہوتا ہے تو بالکل لاپتہ ہو جاتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس کا سر اتار دوں لیکن تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اسے انسان بنا دو۔ والد نے بل ادا کیا اور مجھے بابا کے حوالے کرتے ہوئے چلتے بنے اور فضا میں نصیحت اچھالتے گئے کہ ''علم سیکھنا ہے کردار سیکھنا ہے تو اکبر خان سے سیکھو'' انہیں رخصت کر کے ہم دوبارہ بیٹھ گئے۔ لان میں ملا جلا شور تھا۔ بابا یوں گویا ہوئے ''بیٹا دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ آئے مگر انسان پھر بھی انسان نہ بن سکا۔ میں تمہیں کیسے انسان بنا دوں؟ اور رہا کردار سیکھنا۔ اس ملک میں کردار نہیں ہونا چاہیے جن کا کردار ہو ان کا بُرا حشر ہوتا ہے۔ میرا حال ہی دیکھ لو۔ لہٰذا صاحبِ کردار بننے کی کوشش نہ کرنا۔ رہا علم تو جو تھوڑا بہت علم ہے وہ تمہیں سکھاتا رہا ہوں۔ سب سے بہتر طریقہ سوال و جواب کا ہے۔ تم سوال کرو میں جواب دوں گا اور ہاں میں سہ پہر میں واک کرتا ہوں۔ اسی دوران تم مجھ سے پڑھ سکتے ہو۔ باقی تو میری اپنی مصروفیات ہیں۔''

اگلی سہ پہر میں کاپی بدست بلدیہ ہوٹل کے لان میں موجود تھا۔ بابا نے چائے پلائی اور چھاؤنی کی سڑکوں پہ ہولیے۔ مغرب کے قریب ہم واپس لوٹے۔ ان دنوں کمپیوٹر نہ تھا۔ بابا کا ذہن کمپیوٹر کی طرح سوالوں کے جواب دیا کرتا۔ بحث مباحثہ بھی ہوا کرتا۔ مشکل الفاظ میں کاپی پہ چلتے پھرتے لکھ لیا کرتا۔ جن دنوں بلوچستان میں مڈل پاس بھی نہ ملتا اور برٹش بلوچستان کے پرائمری سکولوں میں بچوں کو دو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جاتا کہ تعلیم پہ راغب ہوں۔ بابا اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج گئے۔ ان دنوں وہ مسلمانوں کا آکسفورڈ تھا۔ فیوڈل کلچر مسلمانوں میں زوروں پہ تھا۔ طلباء کے ساتھ ان کے ملازمین بھی علی گڑھ میں آن رہتے۔ وہاں مشاعرے ہوا کرتے، بحث مباحثہ علمی ماحول رہتا جس کے باعث کئی طلباء تواتر سے فیل ہونے کو ترجیح دیتے تا کہ ہاسٹل کی دلربا زندگی سے باہر نکل نہ پائیں۔ علی گڑھ میں سیاست اور سیاسی سرگرمیوں پہ پابندی تھی۔ جو طلباء یہ حکم نہ مانتے انہیں نکال باہر کیا جاتا۔ بعض طلبا میں زنانہ پن ہوا کرتا، آنکھوں میں دنبالوں والے سرمے لگاتے اور ریختی کی مجسم تصویر بنے پھرتے۔ مگر معیارِ تعلیم کچھ اتنا بلند نہ تھا۔ پالیسی تھی کہ مسلمان نوجوانوں کو پاس کر کے سرکاری ملازمتوں کے لیے مہیا کیا جائے۔ بابا کی زندگی کے بھی بہت ہی سنہری دن تھے۔ جنہیں دہرا دہرا کے وہ خوش ہوا کرتے۔ ان کا اپنا ہی نظریۂ حیات تھا۔ اس عمر میں وہ کچھ بھی بدلنے پہ آمادہ نہ ہوتے۔ علی گڑھ سے گریجویشن اور قانون کی ڈگریاں لیں۔ واپس آئے تو انگریز بہادر نے انہیں تحصیلدار لگا دیا۔ تقسیم سے قبل کا تحصیلدار وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی مانند مطلق العنان شہنشاہ ہوا کرتا مگر بابا سخت ایماندار اور صاحبِ کردار تھے۔ محض تنخواہ پہ ہی گزارہ کرتے۔ شوق البتہ ان کے عمر خیام والے تھے جس کے باعث زیادہ تنخواہ اسی شوق کی نظر ہو جاتی۔ شرٹ نیکر پہن کر جو باہر نکلتے تو سپاہی نہ جانتے ہوئے بھی ادب سے سلیوٹ کرتے کہ کوئی افسر جا رہا ہے۔ شلوار کلچر بعد میں آیا۔ شلوار قمیض نہایت ہی غیر شاعرانہ لباس ہے ایک بوری گلے میں پہن لی جاتی ہے۔ دو بوریاں کمر سے باندھ لی جاتی ہیں۔ یہ ہوئی قمیض شلوار۔ بابا ہمیشہ سوٹ پہن ٹائی لگا باہر نکلتے۔ شام میں سیر کے لیے Casual Smart پہن کر چلتے۔ لباس اور ٹرن آوٹ کا بہت خیال رکھتے کیونکہ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں پلے بڑھے تھے۔ انگریز تو سبھی وڈھادر کی گرمی میں بھی سوٹ پہن کر ہی میٹنگ کیا کرتے۔ لباس کا قومی مزاج سے بھی گہرا تعلق ہے۔ یہی ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض قومی مزاجوں کو بھی تھیلوں کی مانند بے ڈھنگا بنا گئے۔ بابا کے ساتھ میں چھاؤنی کی سڑکوں پہ اتنا چلا پھرا کہ خطِ مستقیم میں چلتا تو چاند تک جا نکلتا۔ بابا کا تعلق اس خالص معاشرے اور پھر Commune نظام سے تھا لوگ باگ باہم مل جل کر رہتے۔ دو نمبر کی اصطلاح بھی نہیں تھی۔ ہر چیز بمعہ انسانوں کے اصلی ہوا کرتی تھی۔ جس کے باعث ستر برس کی عمر میں بھی بابا طویل واک کرتے۔ ہمیشہ خوش رہا کرتے۔ خاندان سے الگ رہنے کے باعث ان کے فلیٹ میں عجب سی سوگواری دیواروں سے لپٹی رہتی۔ دروازی قبرستان جیسا سناٹا طاری رہا کرتا۔ بابا کبھی بیمار نہ ہوتے ایک بار وہ ڈھیر ہوئے تو میں نے پہلی بار فلیٹ میں قدم رکھا۔ حسبِ معمول چہک رہے تھے بولے میں کسی کو بھی زیادہ لفٹ نہیں کرواتا۔ حتیٰ کہ

بیماری کو بھی منہ نہیں لگاتا۔ دیوار پہ گدھے کا پورٹریٹ تھا۔ لوگ تو دیواروں پہ اپنی پسندیدہ شخصیات کی تصویریں فریم کروا کر لگاتے ہیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی گدھے کا فریم دیکھا تھا۔ یوں تو میں نے گدھوں کو حکومت کرتے ملک کی پالیسی بناتے بھی دیکھا۔ ان کی ماتحتی بھی کی مگر ایسی محبت کسی دانشور کی کبھی نہ دیکھی تھی۔ رنگیلا کی فلم انسان اور گدھا میں گدھوں سے محبت کا جو درس ملتا ہے وہ بابا کی دیوار پہ دیکھا۔ چونکہ علم سیکھنے کا شوق تھا۔ بابا سے ہی سوال کیا۔

بابا مسکرائے ''گدھا ایک غیرت مند جانور ہے، مرد سے برتر ہے۔ یہی احساس برتری ہے جس کے باعث وہ مرد کے آگے چلتا ہے۔ جبکہ تمام مویشی مردوں کے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ مرد بھی جانتے ہیں کہ گدھے ان سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ لہٰذا وہ گدھوں سے نفرت کرتے ہیں ساری گالیاں گدھوں سے وابستہ ہیں۔ مثلاً خرژو (گدھے کا بچہ) وغیرہ۔ بابا نے درست ہی کہا ہوگا کیونکہ خر ایک Superlative Degree بھی ہے، جیسے خر بزدل، خرکنجوس۔ اور اعلیٰ ترین ڈگری کے لیے خرناٹ کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ باوجود بیماری کے بابا دروازے تک رخصت کرنے آیا، میں نے مذاقاً کہا کہ بابا اس گون کے نیچے بھی کچھ ہے یا کہ خالی گون ہی پہن رکھا ہے۔ بابا نے گاؤن کھول کر دکھایا۔ ''نہیں صرف یہی گاؤن ہے'' مجھے چرچل کا واقعہ یاد آیا جو جنگ کے دوران اس نے ایک جرنیل سے کہا تھا کہ:

I have nothing to hide from my friends.

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ شام میں وہ اکثر اپنے دوست کے ہاں جایا کرتے جو خیر سے خاندانی نواب تھے۔ تحصیلداری کے دنوں سے دوستی تھی۔ پھر بابا جج بن گئے مگر دوستی میں کمی نہ آئی۔ اس کے بعد عدلیہ میں کرپشن آنے لگی۔ عدلیہ خود مال پانی بنانے لگی۔ بابا نے انگریزوں کا دور دیکھا تھا جب جج کو ہر سہولت دینے کے باوجود گھر پہ ٹیلی فون نہ مہیا کیا جاتا کیونکہ نظام کا تقاضہ تھا کہ جج لوگوں سے تعلق نہ رکھیں۔ اب ان کے سیاسی تعلقات ہی ترقی کا زینہ بنتے چلے جا رہے تھے۔ عدلیہ میں انتظامیہ والا چلن آ رہا تھا۔ جج بھی بیوروکریٹ بنتے جا رہے تھے۔ سونے پہ سہاگہ ون یونٹ بنا دیا گیا۔ جس کے باعث پنجاب سے افسروں اور سرکاری ملازمین کے زمینی حملے شروع ہو گئے۔ چوکیدار، ڈرائیور، استاد، پولیس افسر۔ غرضیکہ ہر رنگ ہر طرح کے سرکاری ملازمین میڈ ان پنجاب کی چھاپ لیے ہوئے چلے آئے۔ اس پہ ایک کتاب پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی نے ''لٹ خانہ'' (بیکاؤں کا گھر) بھی لکھی ہے۔ بابا نے بطور احتجاج اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا ورنہ وہ ہائی کورٹ کے جج بنتے بلکہ چیف جسٹس بن سکتے تھے۔ بہت سے افسروں نے ون یونٹ کے خلاف احتجاجاً استعفے دیئے تھے۔

بابا نے وکالت شروع کر دی لیکن عدلیہ میں رشوت اور سفارش کا چلن در آیا تھا بعض اوقات عدالت میں بابا کی مجسٹریٹ یا جج سے جھڑپ بھی ہو جایا کرتی کہ قانون یہ کہتا۔ ثبوت گواہ بھی سبھی موجود ہیں تو تم بری کیسے کر سکتے ہو؟ جج تو بابا کے مرتبہ سے آگاہ تھے۔ کھسیانی ہنسی میں کہتے کہ اپیل میں چلے جائیں۔ چند بار بابا نے اپنے خلاف فیصلہ آنے پر دبنگ کہا کہ تم نے پیسہ پکڑ لیا ہے۔ نوٹوں نے تم سے فیصلہ لکھوایا ہے۔ وہ توہین عدالت بھی نہ لگا پاتے۔ بس اِدھر اُدھر کی ہانکا کرتے۔ بابا سیاہ ماتمی کورٹ پہن کر سیاہ ٹائی لگا کر عدالت جایا کرتے۔ عدلیہ خود ہی انصاف کے جنازے اٹھانے کے لیے وکلا کو کالا سوٹ کالی ٹائی کے پابند رکھتے ہیں جبکہ یورپ وغیرہ میں سیاہ سوٹ جنازے کا لباس Funeral Dress ہوا کرتا ہے۔ بابا اپنے کیسز پہ بہت محنت کرتے، خود بھی جج رہ چکے تھے۔ مگر اُن کے پاس مقدمے کم ہوتے چلے گئے۔ یہ نوبت بھی آئی کہ مجسٹریٹ یا جج خود ہی درخواست کرتا کہ خدارا اس وکیل کو تو نہ لائیں۔ یوں بابا کے منشی بھی پٹو لہراتے ہوئے فرار ہو گئے۔

بابا کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بے تکلف دوست نواب کے پاس شام میں جاتے تو یہ شرط رکھتے کہ اوّل اس کے مئے نہیں پیئے گے، دوئم اس کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ بابا سے بے تکلفی دو برس میں بڑھی تو میں شام میں اسکوٹر پہ نواب کے درِ دولت پہ چھوڑ آیا کرتا۔ بابا کوئٹہ کا بنا اپنا پووہ جیب میں ڈال کر لے جاتے۔ نواب کے دستر خوان پہ شہر کے اکثر صحافی موجود رہتے۔ بابا کے مالی حالات مخدوش تھے وہ چونکہ نواب کو مدعو نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا خود بھی مہمان نہ بنتے کہ وہ برابری کی سطح پہ دوستی نبھاتے۔ ایک بار تندور والوں نے ہڑتال کر دی تو بابا بسکٹوں پہ گزارہ کرتے رہے۔ مجھے بعد میں خبر ہوئی تو شکوہ کیا کہ میرے ہاں آ جاتے۔ بابا کو غصہ آیا ''کیوں آ جاتا؟ کھانا کھانے کیوں آتا۔'' ایک بار ہم واک کر رہے تھے کہ مغرب کی اذان فضا میں بلند ہوئی۔ بابا نے رک کر اذان سنی اور کہا یہ دیکھو مولوی میرا نام اکبر لے رہا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر چلیں مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے ہیں۔ بابا عقیدوں سے بالکل ہی لاتعلق تھے۔ انہیں یقین تھا کہ دنیا میں سب کچھ طاقت ہی ہے۔ پشتو محاورہ بھی ہے کہ طاقت علم کا دھڑن تختہ کر دیتی ہے۔ بابا کی زندگی بے حد اکیلی تھی جب لورالائی پوسٹنگ تھی تو کسی منڈوے والی پہ مرمٹے تھے یہ خفیہ خبر مجھے میرے والد نے اچھے موڈ میں دی تھی۔

ایک شام وہ Stoic اور Indifferent ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ ہم بلدیہ میں چائے پی رہے تھے۔ نومبر اتر آیا تھا۔ موسم قدرے سرد تھا۔ میں نے بابا کے قول کی تردید کی۔ وہ اور مصر ہوئے تو میں نے کہا کہ ''آپ بھی تو بالی پہ مرمٹے تھے'' بابا کا چہرہ تورہ بورا بن گیا۔ وزیرستان بن گیا بلوچستان کی مانند ویران اور لاوارث ہو گیا۔ آنکھوں میں قبرستان پھیل گئے۔ چائے کا پیالہ تھرتھرا اُٹھا۔ بہت دیر بعد بابا سنبھلے اور محض اتنا کہا کہ ''چلتا ہوں۔ کل ملیں گے۔'' مجھے سخت تاسف ہوا۔ محمود غزنوی کی طرح مولوی بھی بلوچستان پہ حملے کیے جا رہے تھے۔ قراردادِ مقاصد تو گویا ان کی پہلی قلعہ بندی تھی۔ منڈوے۔ گیت۔ ڈرامے سبھی ہوا ہوئے۔ ایک دو روز میں غائب رہا۔ بابا سے ملا تو بالکل نارمل سے تھے میں بھی صلیبی جنگوں کے بارے میں سوال کرتا ان کے ساتھ واک کرتا رہا۔ یوں

بہت سے سال بیت گئے۔ بابا مزید کمزور اور اکیلے ہوتے چلے گئے۔ میں نے ایم۔اے کے بعد لیکچرار کی ملازمت اختیار کی کیونکہ والد کا اصرار تھا کہ ان کے بعد ان کا کوئی بیٹا محکمہ تعلیم میں آئے کیونکہ تعلیم ہی معاشرے کو بدل سکتی ہے۔ مجھے مست توکلی (بلوچی رومانی شاعر) کی طرح مار دھاڑ سے دلچسپی نہ تھی۔ بڑا بھائی فوج میں گیا۔ اس کی کلاس ہی بدل گئی۔ میں علم کی صلیب اٹھائے مستونگ کی بسوں میں سفر کرتا رہا۔ بار بار مارشل لاء لگ جایا کرتا جس کے باعث لوگ بڑے بوٹ کی چاپ سے ہی ڈر جایا کرتے۔ یوں لگتا تھا زندگی مستونگ کی بسوں میں ہی گزر جائے گی کہ بلوچستان یونیورسٹی میں استاد طلب کیے گئے۔ میں نے بھی درخواست دی، وزیر تعلیم مگسی سے ایک ذاتی خط حاصل کیا ایک جعلی سٹاف افسر تیار کیا۔ جس نے وائس چانسلر کو خط پیش کرتے ہوئے تاکید کی کہ علم کا یہ موتی یونیورسٹی میں سجایا جائے۔ وائس چانسلر پروفیسر کرار حسین کا میں اسٹوڈنٹ رہا تھا وہ میری نالائقیوں سے بخوبی آگاہ تھے مگر اچھے استاد کی مانند خاموش رہے۔ سنڈیکیٹ کے ممبر ڈاکٹر مالک کاسی بھی تھے۔ بلدیہ ہوٹل میں ان سے طویل مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ان کا در کھٹکھٹایا۔ بابا کو بھی روداد سنائی۔ دعاؤں پہ انہیں یقین نہ تھا ورنہ ان سے روحانی امداد کا طالب ہوتا۔ انٹرویو کے روز بابا کو یونیورسٹی میں دیکھ کر حیرت ہوئی ’’بابا! دیدار بازی رب راضی۔ پرانی عادت نہیں گئی؟‘‘ وہ مسکرا کے چپ ہو لیے۔ جب انٹرویو کے لیے اندر گیا تو دیکھا کہ بابا بھی بورڈ کے ممبر ہیں۔ یونیورسٹی کی ملازمت راس نہ آئی یوں لگا کہ سیٹھ کی نوکری کر لی ہے۔ ایک صدر شعبہ گویا سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ روز آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ کجا صدر شعبہ کی نازبرداریاں۔ یونیورسٹی چھوڑ میں دوبارہ مستونگ کی بسوں میں آن بیٹھا۔ پھول بہتر ہے گلستان میں رہے۔

نواب رئیسانی بلوچستان کے گورنر لگے تو اپنے دیرینہ دوست کو مشیر لگا لیا۔ بابا ہر لحاظ سے موزوں ترین تھے۔ مگر درویشی کا وہی عالم تھا مجھ سے مبارکباد بھی قبول نہ کی۔ ’’یہ آدھی رات کا بستر ہے ایسی بھی کیا بات‘‘ ہماری واک البتہ جاتی رہی۔ ان کی سرکاری مصروفیات ختم ہونے میں ہی نہ آتیں۔ سرکاری طور پر ترکی گئے تو ایک تقریب میں امریکی سفیر نے بابا سے دریافت کیا کہ بلوچستان کی سیاست کا اب کیا رُخ ہوگا۔ بابا نے دھڑ سے جواب دیا کہ بلوچستان اور سرحد دو گولیاں ہیں، اصل تو پنجاب ہے جہاں وہ مڑے گا ان دونوں کو بھی وہیں مڑنا ہو گا۔ یہ دونوں یوں بھی اس کے نیچے ہیں۔ چونکہ یہ تبصرہ جعفر زٹلی کی مانند جنسی زبان میں تھا۔ بابا کو فوراً ہی فارغ کر دیا گیا۔ واپس وطن پہنچے تو ایک بار پھر میرے ساتھ واک کرنے لگے، نواب سے دوستی بدستور رہی کیونکہ گورنر بن کے بھی بھائی پھیروں کے ہی ماتحت تھے۔ سنا ہے کہ شیو بھگوان کا ایک تباہی والا انٹز (مردانہ انداز رقص) ہے جسے ٹانڈ ونرت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کے لیے سچ ہی ٹانڈ ونرت ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ایک قابل ترین جج کوئٹہ کی سڑکوں پہ اسرار الحق مجاز کی نظم بنا پھرتا تھا۔ برف کی طرح پگھلے جا رہا تھا۔ انگریز بھی جا چکے تھے اور ہندو بھی۔ ان کے ہاں ماتا، گروجیؒ کہ گائے تک کا احترام تھا۔ وہ پیانوں، ہارمونیم، بانسریاں چھوڑ گئے۔ ہم نے کرشن بھگوان کی بانسریوں کو مسواک بنا لیا۔

میں نے مقابلے کا امتحان دیا تو مجھے محکمہ ڈاک ملا، پولیس اور اچھے محکمے جعلی ڈومیسائل لے گئے۔ بابا ناخوش تھے بقول ان کے یہ ایک پسماندہ اور Primitive معاشرہ ہے۔ یہاں صرف اسی کی عزت ہے جس کے پاس نیوسنس ہو فائدہ دے سکے یا نقصان۔ لیکن Beggars can not be choosers ہمارے پاس پسند و ناپسند کا مزاج بھی نہیں ہوتا۔ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔

بابا کو میرے جانے کا بھی غم تھا۔ جس کا وہ اظہار نہ کرتے۔ تقاریب میں وہ میرا یوں تعارف کراتے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اگر کوئی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کرتا تو میں فوراً تصدیق کر ڈالتا ’’زے اکبر خان زوئے ایم‘‘ (میں اکبر خان کا بیٹا ہوں) یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا میرے والد کا نام بھی اکبر خان ہی تھا۔ ان دو اکبر خانوں کے بیچ میں مختلف تربیت لیتا رہا۔ ایک سب آگ ایک سب پانی۔

بابا جناح روڈ پہ سوٹ ڈانٹے گھومتے پھرتے رہے۔ اکثر لائبریریوں میں چلے جاتے۔ جہاں دوپہر تک کا وقت کٹ جایا کرتا۔ ریلوے پلیٹ فارم بسوں کے اڈے اور لائبریریاں تنہائی کے بھوت سے چھٹکارہ پانے کے اچھے اڈے ہیں۔

ابتدا میں تو ہم سبھی دوست خوش تھے کہ ہمیں علم کا مینار کہا جاتا ہے پھر اِدھر اُدھر دوسرے محکموں میں کھسکنے لگے۔ مجھے بھی لاہور سے کال کا انتظار رہتا۔ بابا نے یوں تو اظہار نہ کیا مگر جانے کی خبر سے قدرے دلبرداشتہ سے تھے۔

ایک روز میں سوال کر بیٹھا کہ ہم سارے علم کے مینار محاورے کے مطابق Hand to mouth کیوں رہتے ہیں۔ لوگ کیسے امیر کبیر بن جاتے ہیں۔ بابا کو جواب دینے میں دیر ہی نہ لگتی۔

’’سوال ہے کہ کوئی کتنا بے غیرت بن سکتا ہے، جتنا بے غیرت ہوگا اسی قدر امیر ہوگا۔ بے غیرتی اور دولت مند کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔‘‘ میں نے امیروں کو بابا کے انکشاف پہ ہمیشہ پورا اترتے دیکھا۔

ایک روز اچانک بابا بیمار پڑ گئے۔ بستر سے ہی جا لگے تیمارداری کے لیے تنہائیاں ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھل اٹھے۔ مرزا غالب کی طرح موت کی پیشن گوئی بھی کر ڈالی اور عجیب سی فرمائشیں کی کہ ان کا جسد خاکی کسی دشت میں چھوڑ آؤں تا کہ جانور پرندے انہیں کھالیں۔ جاتے جاتے بھی مخلوق خدا کا بھلا تو کرتے جائیں۔

بابا سچے انسان تھے، پیش گوئی بھی سچی ثابت ہوئی مجھے لاہور سے کال آ چکی تھی، میں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا مر گئے کیا کرتے بھلا اکیلے اس شہر میں!

☆

''دردکی زنجیر''

سیماپیروز (لاہور)

یوں تو انیقہ کی زندگی المیوں سے عبارت تھی۔ پر وہ آج تک یہ نہ جان پائی کہ اس کی زندگی کا سب سے بڑاالمیہ کون سا ہے۔

چھوٹی سی عمر میں ماں باپ کا چلے جانا۔۔۔غریب گھر میں پیدا ہونا۔۔۔اس کی خوبصورتی یا پھرامیر گھرانے میں شادی۔

انیقہ تین سال کی تھی جب بھرے بازار میں بم دھماکے میں ماں باپ چل بسے اور وہ زندگی بچ گئی (اسے اپنے زندہ رہ جانے پر ہمیشہ افسوس رہا) سرکاری کوارٹر سے وہ اسی طرح کے کواٹر میں چچا کے گھر چلی آئی۔ چچا کے اپنے چارعدد چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔اسے دیکھ کر چچی کے منہ کا زاویہ ہی بگڑ گیا۔

''اسے کیوں اٹھالائے ہو؟اس کی نانی یاماموں لے جاتے''فرخندہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''وہ میرے بھائی کا خون ہے۔اصولی طور پر اسے پالنے پوسنے کا حق میرا ہی بنتا ہے۔''

''پہلے کون سا ہن برس رہا ہے جو ایک جان اور آ گئی کھانے والی''

''اللہ تعالٰی رازق ہے۔کیوں خوامخواہ پریشان ہوتی ہو؟''

''ارے پریشان کیسے نہ ہوں۔مجھ سے اپنے بچے ہی نہیں سنبھلتے اوپر سے ایک اور ذمہ داری آن پڑی ہے۔تم نے کون سے مجھے نوکر رکھ کر دیئے ہوئے ہیں''فرخندہ تنک کر بولی۔

''گھر سے کوئی قیمتی سامان نہیں ملا۔اس کی ماں کے کانوں میں سونے کی بالیاں ہوتی تھیں۔تولے بھر کی تو ہوں گی۔وہ کدھر گئیں۔''

''خدا کا خوف کرو۔جب جسم کے چیتھڑے اڑ گئے تو بالیاں بچی ہو گی؟''چچا آزردہ ہو گئے۔فرخندہ نے طوعاً کرہاً انیقہ کا گھر میں رہنا تو قبول کرلیا پردل سے قبول نہ کیا۔اس نے کبھی بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔جب وہ اپنے بچوں کو لاڈ پیار کرتی،کھلاتی پلاتی تو انیقہ حسرت سے تکتی رہتی۔اس پر اگر چچا گھر میں نہ ہوتے تو چچی سے دو چار دھمو کے ضرور پڑتے۔ورنہ زبان کی کاٹ سے انیقہ کا دل زخمی کرنے سے باز نہ آتی۔

''ندیدی کمینی۔۔۔میرے بچوں کے کھانے کو نظر لگاتی ہے۔ہائے اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔مربھکوں کی طرح ہر وقت کھاتی ہی رہتی ہے۔''ہر آئے گئے کے سامنے اس کا فضیتا کیا جاتا۔حالانکہ وہ قسمیہ کہہ سکتی تھی کہ چچی نے کبھی اسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیا تھا۔کپڑے،جوتے بھی وہ ہمیشہ اپنی کزنز کے ہی پہنتی۔

عید پر اگر چچا کبھی خیال ظاہر کرتے کہ''بیچاری انیقہ کے لیے بھی نیا جوڑا لے لو''تو فرخندہ پنجے جھاڑ کر چچا کے پیچھے پڑ جاتی۔

''رباب کا جوڑا بالکل نیا ہی ہے۔جو اسے دے رہی ہوں۔دو چار بار ہی پہنا ہے رباب نے''حالانکہ ڈھل ڈھل کر وہ اپنی آب کھو چکا ہوتا۔چچا بیچارے دکھی سے انیقہ کو دیکھتے رہ جاتے۔

''میں کہاں سے لاؤں اتنا روپیہ؟میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔تمہاری تنخواہ میں ہی تو مجھے گزارہ کرنا ہے۔''

چچا نے ایک کام بہت نیکی کا کیا کہ چچی سے لڑ جھگڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ انیقہ کو بھی سرکاری سکول میں داخل کروادیا۔انیقہ پڑھائی میں بہت لائق تھی۔ آٹھویں میں اس نے وظیفہ لیا اور پھر دسویں کلاس میں بھی وہ اپنے سکول میں فرسٹ آئی اور وظیفہ لیا۔اس پر فرخندہ اسے جلی کٹی سناتی رہی۔''اللہ کی شان بھک منگوں کو وظیفہ مل رہا ہے اور ہمارے بچے ویسے ہی رہ گئے۔''

اس پر چچا نے طنز کیا''سرکار یتیموں مسکینوں کو ہی وظیفہ دیتی ہے۔تمہیں تو شکر کرنا چاہیے کہ تمہیں اس کی پڑھائی پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔''

جب سے انیقہ ذرا بڑی ہوئی تھی وہ اپنے آپ صبح سویرے اٹھ جاتی۔سکول جانے سے پہلے بستر سنبھالتی،جھاڑو پوچا کرتی اور صبح کا ناشتہ بھی بناتی۔سکول سے آ کر بھی وہ کام میں جتی رہتی تا کہ فرخندہ کی قہر آلود نظروں اور زبان کے زہر سے پناہ میں رہے۔

فرخندہ اسے کسی طور کالج بھیجنے پر رضا مند نہیں تھی کیونکہ ان کی اپنی بیٹی کے نمبر اتنے کم آئے تھے کہ کسی کالج میں اس کا داخلہ نہیں ہو سکا تھا۔اس معاملے میں بھی چچا نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔کالج سے آ کر اس نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔یوں ہر مہینے اچھی خاصی رقم جب فرخندہ کی ہتھیلی پر رکھی جانے لگی تو ان کے زہر میں کچھ کمی آئی۔ایف اے کے بعد بی اے میں اس کا داخلہ آسانی سے ہو گیا۔چچا ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتے۔

''بیٹا!انشاء اللہ تمہارے اچھے دن آئیں گے۔پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جانا۔میں شرمندہ ہوں کہ تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔''

انیقہ کے سر پر رکھا ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور آواز بھرّا سی گئی تھی۔

''آپ نے میرے لیے بہت کیا ہے۔میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔''انیقہ نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی بھیگی آنکھوں سے لگا لیے۔ بی۔اے فائنل کے امتحان سر پر آ گئے تھے اور ابھی تک داخلہ فیس کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔چچی سے ڈرتے ڈرتے داخلہ فیس کا ذکر کیا تو وہ چراغ پا ہو گئیں۔

''شاباش ہے بھئی تم پر۔ہر ماہ چند ٹکے دے کر تم کیا سمجھتی ہو کہ قارون کا خزانہ بخشتی ہو مجھے گھر میں ہی خرچ ہوتے ہیں سارے۔''

انیقہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

چچا سن رہے تھے بہت افسردہ اور پریشان ہوئے اور چپکے سے اسے تسلی دی۔''فکر نہ کرو میں کہیں سے بندوبست کرلوں گا۔''

پرنسپل اس کے حالات جانتی تھی اور اس کی بہت قدر کرتی تھی۔انیقہ

کواور تو کچھ نہ سوجھا۔ پرنسپل صاحبہ کے پاس جا کر صورت حال بتانے کا سوچا۔اس نے دستک دی اور اندر چلی گئی۔ وہاں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔

''سوری'' کہہ کر واپس مڑنے لگی تو پرنسپل صاحبہ نے روک لیا۔

''کہو انیقہ ! کیسے آنا ہوا؟''

''جی میں پھر حاضر ہو جاؤں گی۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ خاتون اس کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ انیقہ گھبرا سی گئی۔

اس کے جانے کے بعد خاتون پرنسپل سے کرید کرید کر اس کے حالات معلوم کرتی رہی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ چچا نے کہیں سے داخلہ فیس کا بندوبست کر لیا تھا۔

امتحانوں کے بعد فراغت تھی پر انیقہ دن بھر گھر کے کام دھندوں میں لگی رہتی اور شام میں ٹیوشن پڑھاتی۔اس کی زندگی میں فرصت، سکون اور خوشی کا کوئی لمحہ نہیں تھا۔ چچی کبھی خوش ہی نہیں ہوتی تھی۔ انیقہ کی ہزار کوششوں کے باوجود چچی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس کے فضیحتے کرتی رہتی۔ رات بستر پر لیٹتی تو اپنے ماں باپ کو یاد کر کے چند آنسو بہا لیتی۔

ایک دن اچانک شام ڈھلے ایک لمبی سی گاڑی ان کے دروازے پر آ کر رکی۔اس میں سے ایک بجی بنی عورت اتری۔انہیں دیکھ کر سب لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔

''کیا مجھے بیٹھنے کو نہیں کہیں گے آپ۔۔۔؟''

چچا ہڑبڑا کر انہیں بیٹھک میں لے آئے اور بیوی کو کچھ ٹھنڈا بھجوانے کو کہا۔

خاتون نے اپنا تعارف کروایا ''میں مسز شہباز خان ہوں۔ پانچ برس پہلے میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ میرے دو بچے ہیں۔ بیٹی کرن وہ شادی شدہ ہے۔اور ایک بیٹا ہے وہاج۔ ماشاءاللہ پڑھا لکھا اور سمجھدار بیٹا ہے۔ باپ کے بعد سارا بزنس وہی چلا رہا ہے۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ہمیں کچھ نہیں چاہیے،بس میں آپ کی بیٹی انیقہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگنے آئی ہوں۔''

''یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ آپ بہت اونچی شان والے۔۔۔ کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔''

''بھائی صاحب! ان باتوں کو چھوڑیں یہ سب پرانی باتیں ہیں۔''

''نہیں بیگم صاحبہ! ہمارا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔ ہماری بچی جس ماحول میں پلی بڑھی ہے وہ آپ کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔ آپ کی جگ ہنسائی ہو گی ہم آپ کے برابر نہیں ہو سکتے۔''

''یہ سب آپ مجھ پر چھوڑیں۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف انیقہ کا ہاتھ چاہیے۔ یہ بچی ماشاءاللہ اتنی پیاری اور سلجھی ہوئی ہے کہ مجھے تو یہ پہلی نظر میں ہی اپنے وہاج کے لیے بالکل موزوں لگی تھی۔ اس کی پرنسپل نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔''

''ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دیں۔''

''ٹھیک ہے سوچ لیں۔ بچی سے بھی پوچھ لیں۔ میں تین چار روز کے بعد دوبارہ آؤں گی اس یقین کے ساتھ کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔''

مسز شہباز تو چلی گئیں پر چچی کو وہ تپتنے لڑے کہ حد نہیں۔ انہوں نے انیقہ کئی نازیبا باتیں کہہ ڈالیں۔

''ارے اس کا یارانہ ہو گا اس بڑھیا کے بیٹے کے ساتھ۔ ورنہ وہ یوں ہی منہ اٹھا کر کیسے چلی آئی؟''

''چچی میں قسم کھا کر کہتی ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ان خاتون کو جانتی تک نہیں'' انیقہ چچی کو روتے ہوئے یقین دلا رہی تھی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟ شرم نہیں آتی بہتان باندھتے ہوئے'' چچا نے انہیں ڈانٹا۔

چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔

بارات کا ریسپشن کسی ہوٹل میں تھا۔ سارا خرچہ مسز خان نے برداشت کیا تھا۔ سارا محلّہ دانتوں میں انگلیاں دبائے کھڑا تھا۔ ہر کوئی انیقہ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ کچھ حسد میں بھی جل رہے تھے۔

دلہن بنی انیقہ پر ایسا روپ آیا تھا کہ نظر نہیں ٹک رہی تھی۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ دولہا بھی خوبصورت تھا۔ ہر کوئی تعریف کر رہا تھا ''ماشاء اللہ بڑی خوبصورت جوڑی ہے۔ لگتا ہے یہ بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے۔''

مسز خان خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

چچا نے اسے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

''بیگم صاحبہ! یہ بن ماں باپ کی بچی ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔ اگر اس سے کوئی خطا ہو جائے تو درگزر کر دیجئے گا'' اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''بھائی صاحب! آپ بالکل فکر نہ کریں آج سے یہ میری بیٹی ہے۔ انشاءاللہ یہ بہت خوش رہے گی۔'' مسز خان نے تسلی دی۔

رخصت ہو کر وہ محل نما بنگلے میں چلی آئی۔ رات دیر تک عزیز رشتہ دار دلہا دلہن کو گھیرے رہے۔ مختلف قسم کی رسمیں ہوتی رہیں۔ پھر کسی نے ٹائم کا احساس دلایا ''ارے دو بج گئے۔''

دو تین لڑکیوں نے انیقہ کو دائیں بائیں سے پکڑا۔ وہ جیسے خواب میں پھولوں کی دھرتی پر پاؤں رکھتی چل رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ آنکھ کھولے گی تو یہ جادوئی ماحول یک دم غائب ہو جائے گا۔

سجے سجائے کمرے میں انہوں نے ہولے سے چھپر کھٹ پر بٹھا دیا۔

''لیں بھابھی۔۔۔ اب آپ انتظار کریں اپنے شہزادے کا۔ ہم اب جاتے ہیں۔۔۔ صبح آپ سے ملاقات ہو گی'' وہ ہنستی کھلکھلاتی چلی گئیں۔

اُن کے جانے کے بعد اس نے کھل کر سانس لیا۔ گھونگھٹ سرکا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پلنگ پر اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف گلاب ہی گلاب

تھے۔ کیا شاندار کمرہ تھا۔ خوبصورت صوفہ سیٹ اسی طرح کا بھاری پلنگ۔ کھڑکیوں پر نہ جانے کون سے کپڑے کے پردے لٹک رہے تھے (اس کی جانے بلا) سائیڈ ٹیبل پر کرسٹل کے دودھیا روشنی دیتے ہوئے حسین لیمپ۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے دیدہ زیب آرائشی گلدان، صراحیاں اور نہ جانے کیا کیا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگ۔ وہ اپنے مجازی خدا کے ذوق کی داد دیئے بغیر رہ نہ سکی۔

''یاالٰہی کیا اتنے امیر لوگ بھی ہیں پاکستان میں۔ ان کے ایک کمرے کی سجاوٹ پہ جتنا خرچ ہوا ہوگا وہ شائد ہماری زیست کے لیے کئی سالوں تک کافی ہوگا'' ذراسی آہٹ پر وہ گھونگھٹ گرا کر بیٹھ جاتی۔

گھڑی کی ٹک ٹک سے زندگی کے آثار معلوم ہو رہے تھے۔ ہر گھنٹے کے بعد وہ گھڑی پر نظر ڈالتی۔ رات کے تین بجے پھر چار بج گئے اور پھر نہ جانے کس وقت نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔ ہلکے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے سرہانے ایک ڈبہ رکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ گھڑی صبح کے آٹھ بجا رہی تھی۔

''اف میں اتنی دیر سوتی رہی۔ نماز بھی نہیں پڑھی۔'' ڈبہ کھول کر دیکھا اس میں بہت خوبصورت جڑاؤ کنگن تھے۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔

''یقیناً انہیں میں پسند نہیں آئی۔ ان کی والدہ نے زبردستی اپنی پسند ان پر ٹھونسی ہے۔ مجھ جیسی بے مایہ لڑکی انہیں کیسے پسند آسکتی ہے؟ ممکن ہے وہ کسی کو پسند کرتے ہوں۔ بھلا ان کی والدہ نے ایسا کیوں کیا؟ میری کون سی ان کے ساتھ رشتہ داری تھی۔ خوامخواہ میں اپنے بیٹے کو دکھی کیا۔ ان کی اپنی کلاس کی ایک سے ایک حسین اور ماڈرن لڑکی ہوگی۔ مجھ جیسی جاہل کو وہ کیسے پسند کر سکتے ہیں؟ انیقہ وہاج کے لیے دکھی ہوگئی۔

''میں انشاء اللہ اپنی محبت اور خدمت سے ان کا دل جیت لوں گی'' دل میں یہ عہد کر کے جیسے مطمئن ہوگئی۔

ڈریسنگ روم میں ایک ہلکے کام والا جوڑا رکھا تھا۔ اس نے زیور اور کپڑے اتار کر سلیقے سے تہہ کر کے رکھ دیئے۔ وہ جوڑا پہن کر وضو کیا اور قضا نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ دعا مانگ رہی تھی کہ رات والی لڑکیوں کی ٹولی چلی آئی۔ انیقہ سے ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ جواب میں وہ شرما کر سر جھکا لیتی۔

''چلیں جی۔۔۔ ممی اور بھائی ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں'' غالباً اس کی نند تھی۔ میز رشتہ داروں اور انواع واقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ میز کی دوسری طرف اس کے بالکل سامنے وہاج بیٹھا تھا۔ اس کے حلق میں ٹوسٹ جیسے پھنس رہا تھا۔ اس نے ایک سلائس لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں بھئی یہ کیا بات ہے۔۔۔؟ اور لو کچھ۔۔۔ یہ حلوہ پوری بالکل گرم ہے یہ لو۔۔۔'' مسز خاں نے اس کی پلیٹ میں پوری ڈال دی۔

''نہیں! پلیز مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں منمنائی۔

''اچھا! چلو دو نوالے لے لو'' انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ اسے پوری لینی ہی پڑی۔ وہاج بالکل لاتعلق سا بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کسی اور نے محسوس کیا یا نہیں۔ البتہ انیقہ نے اس کی خاموشی اور لاتعلقی کو محسوس کیا اور اس کا دل بجھ سا گیا۔

مہمان رخصت ہوئے تو نوکروں کے علاوہ چار نفوس رہ گئے۔ ساس، وہاج، ان کی بوڑھی اناّ اور وہ خود۔ سب کے بیچ وہاج سے تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی تھی لیکن اکیلے میں وہ اس سے ایک لفظ نہیں بولتا تھا۔ اول تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ کمرے میں اس وقت آئے جب انیقہ سو چکی ہو یا پھر وہ کمرے میں موجود نہ ہو۔ اگر وہ موجود ہوتی تو گونگے کا گڑ کھا کر آتا اور تیزی سے اپنی چیزیں لے کر چلا جاتا۔

ایک روز انیقہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''آپ اگر اپنے کمرے میں میری موجودگی برداشت نہیں کر سکتے تو میں کسی اور کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ آپ اپنا کمرہ کیوں چھوڑتے ہیں۔ مجھے ویسے بھی اتنے پرآسائش بستر پر نیند نہیں آتی۔''

''نہیں۔۔۔ نہیں آپ اسی کمرے میں رہیں۔ دراصل مجھے عادت نہیں کسی کے ساتھ بیڈروم شیئر کرنے کی۔ میں ادھر کمپیوٹر روم میں سوتا ہوں۔ ویسے بھی میں نے دیر تک کام کرنا ہوتا ہے۔''

''دیکھیں۔۔۔ میری وجہ سے آپ دربدر ہو رہے ہیں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آنٹی کو اگر معلوم پڑ گیا تو انہیں بھی برا لگے گا۔ آپ اپنے بستر پر سو جایا کریں میں ادھر صوفے پر آرام سے سو سکتی ہوں۔ ویسے تو قالین بھی میرے لیے پھولوں کا بستر ہوگا۔ آپ کو کیا پتہ۔۔۔ گرمیوں میں اکثر میں فرش پر پرانی چادر بچھا کر سوتی تھی۔'' وہ یہ سب کچھ بول کر جیسے شرمندہ سی ہوگئی۔

اگلی رات شائد ماں کے ڈر سے وہاج کمرے میں آیا اور ایک لفظ بولے بغیر بستر پر لیٹ کر تکیے میں منہ گھسا کر سوتا بن گیا۔ انیقہ حسب وعدہ صوفے پر سو گئی۔ صبح وہ نماز کے لیے اٹھی تو وہاج کا بستر خالی تھا۔ غالباً وہ رات ہی کسی وقت جا چکا تھا۔

وہ جو سوچے بیٹھی تھی میں وہاج سے اس بے رخی کی وجہ پوچھ کر رہوں گی۔ آہستہ آہستہ اس کے دل سے پرانی محبت کی یاد مٹا کر رہوں گی۔ اس کا امکان دور دور تک نہیں تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہاج کی زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دونوں دو مختلف سیاروں کے لوگ ہیں جو اپنے اپنے مدار میں الگ الگ زندگی بتا رہے ہیں۔

صبح ناشتہ کر کے آنٹی اور وہاج آفس چلے جاتے۔ دوپہر میں آنٹی گھر آ جاتیں تھوڑا آرام کرتیں اور پھر شام میں کلب یا پھر دوستوں کے ہاں چلی جاتیں وہاج کے آنے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ کب آتا ہے کب جاتا ہے۔

گھر میں سارا دن نوکروں اور بوڑھی اناّ کے ساتھ وہ رہ جاتی۔

چچا جان دو تین بار آکر مل گئے تھے۔ چچی نے تو مارے حسد اور نفرت کے اس سے ملنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

اس روز چچا آئے تو دیر تک اس کی صورت دیکھتے رہے۔

''بیٹی۔۔۔تم خوش تو ہو۔''
''جی۔۔۔بہت خوش ہوں۔''
''وہاج اچھا ہے نا؟ تمہارا خیال رکھتا ہے۔''
''جی۔۔۔ چچا بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آنٹی بھی مجھے ماں کی طرح چاہتی ہیں۔'' کمال ضبط سے وہ یہ سب کہہ رہی تھی۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چچا کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رو پڑے۔ انہیں کہے مجھے واپس لے جائیں اسی غریب گھر میں۔ بھلے چچی مجھے ڈانتی تھی برا بھلا کہتی تھی لیکن اس میں ایک تعلق تھا۔ یہاں تو سرے سے میرے ساتھ کوئی واسطہ ہی نہیں۔ میرا وجود۔۔۔اس گھر میں رکھے قیمتی فرنیچر۔۔۔تصویروں۔۔۔کرسٹل کے لیمپوں، چینی کے گلدانوں اور سجاوٹ کے بے شمار سامان سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ ان کی روزانہ جھاڑ پونچھ کی جاتی ہے۔ نوکروں کو خاص ہدایت ہے اگر ان میں سے کچھ ٹوٹا تو انہیں نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا۔

لان میں سجی کیاریوں میں لگے پھولوں سے بھی کم تر ہوں۔ ان کی تراش خراش وقت پہ پانی دینے اور دھوپ چھاؤں سے بچانے کے لیے مالی مقرر ہیں اور میں کیا ہوں؟ پر وہ یہ سب بولی نہیں۔

کہا تو صرف اتنا۔۔۔''کسی روز سب بچوں کو لے کر آئیں۔ میں اُن کے لیے اداس ہوں۔ خاص طور پر بنٹی اور رباب کے لیے۔''

''اچھا بیٹی۔۔۔اب میں چلتا ہوں۔ کسی روز سب کو لے کر آؤں گا۔ سلامت رہو۔۔۔خوش رہو۔۔۔بیٹے وہاج اور بیگم صاحبہ کو میرا اسلام کہہ دینا۔''

وہاج اور آنٹی۔ وہ دونوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ آنٹی تو جیسے بھولا کر بھول چکی تھی وہاج سے ناشتے پر اور رات کے کھانے پر اکثر ملاقات ہوتی۔ ماں کے سامنے ہلکے پھلکے انداز میں دو چار باتیں کر لیتا۔

''یہ انڈوں کا حلوہ لیا تم نے۔۔۔ بہت مزے کا ہے۔'' انیقہ کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی چمچ بھر کر اس کی پلیٹ میں ڈال دیتا۔

''مرید حسین آج تم نے کوفتے بہت عمدہ بنائے ہیں۔ کیوں انیقہ پسند آئے؟''

''جی بہت مزیدار پکے ہیں۔''

سارا دن وہ بیکار ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔ کبھی کمرے میں کبھی لان میں اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنا وقت کیسے کاٹے۔

ایک روز ناشتے پر اس نے ساس اور وہاج سے کہا۔

اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کچن میں مرید حسین کا ہاتھ بٹا دیا کروں۔

''ہرگز نہیں۔'' وہاج کے بولنے سے پہلے مسز خان بول پڑیں۔

''ہمارے ہاں آج تک کبھی کسی نے کچن میں کام نہیں کیا۔ نوکر کیا سوچیں گے کہ بہو اپنا ماضی نہیں بھولی ابھی تک۔''

انیقہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔۔۔تم کوئی ملازمہ ہو۔ بہو ہو اس گھر کی''

''جی بس اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے۔''

وہاج نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''گاڑی ڈرائیور گھر پر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جایا کرو۔ ادھر اُدھر گھوم پھر آیا کرو۔''

''کس کے ساتھ اور کہاں؟'' اس کی زبان پہ یہ جواب آتے آتے رہ گیا۔

شادی کے شروع دنوں میں دو چار بار وہاج کے ساتھ ضرور گئی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں اور دوستوں نے کھانے پر بلایا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے وہاج نے اس کے ساتھ کہیں جانے کی قسم کھا لی تھی۔

خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ روزانہ ہی آندھی آ جاتی اور باغیچے میں پتوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ وہ کسی بینچ پر بیٹھ جاتی اور اڑتے پتوں کو دیکھتی رہتی۔ مختلف سوچیں اس کا گھیراؤ کیے رہتیں۔ آنٹی نے کیوں مجھ جیسی بے مایہ لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کی جبکہ انہیں ایک سے ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی مل سکتی تھی اور پھر وہاج نے انکار کیوں نہیں کیا۔

یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ''کون بتائے گا مجھے۔ کس سے پوچھوں؟'' کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ وہاج کو جھنجھوڑ کر پوچھے کہ ''اس کا قصور کیا ہے؟'' اگر مجھ سے اتنی نفرت ہے تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔

اس خیال سے اس کا کلیجہ منہ کو آ جاتا۔ ''اگر وہ مجھے طلاق دے دے گا تو اس بھری دنیا میں میں کس کے در پر جاؤں گی۔ اول تو چچی مجھے گھر میں گھسنے نہیں دے گی۔ اگر چچا کے زور زبردستی پر مجھے رکھ بھی لیا تو طعنوں کے مارے میرا جینا دوبھر کر دے گی۔''

کبھی سوچتی وہاج سے کہتی ہوں تم جسے چاہتے ہو اس سے شادی کر لو۔ آنٹی کو میں منا لوں گی۔ میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ پرانے کاٹھ کباڑ کی طرح کسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ یہ ساری سوچیں الفاظ بن کر زبان پر کبھی نہ آ سکیں۔ وہاج اس کے پاس ٹکتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے دل کی باتیں اس سے کہہ سکتی۔

مشرق کی سمت سے کالی گھٹا اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔ دوپہر کے سمے جیسے شام سی ہو گئی۔ وہ باہر لان میں بیٹھ گئی۔ خیال تھا خوب بارش برسے گی لیکن قدرت کے رنگ نرالے۔ اچانک تیز آندھی چلنے لگی۔ لگتا تھا جیسے آج ہر چیز اڑا کر لے جائے گی۔ کوٹھی کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگے اشوک اور املتاس ایسے دوہرے ہو رہے تھے جیسے ٹوٹ ہی جائیں گے۔ طوفان سے بے خبر نہ جانے وہ کب سے بیٹھی تھی۔ اماّ اسے ڈھونڈتی ہوئی چلی آئی۔

''ہائے اللہ! اس طوفان میں یہاں بیٹھی ہو۔ میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئی ہوں۔''

''جو طوفان میرے دل کے اندر ہے وہ اس سے بھی شدید ہے''

زبان خاموش تھی پر دل سے ہوک اٹھی۔

''چلو اٹھو۔۔۔اندر چلو۔۔۔ساری مٹی آنکھوں اور ناک میں گھسی جارہی ہے۔''

''نہیں بُوا۔۔۔آپ جائیں میں ادھر ہی بیٹھوں گی۔''

''ہائے کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اس طوفان میں کیسے چھوڑ دوں تمہیں۔۔۔خدانخواستہ کوئی چیز اڑ کر نہ آ لگے۔''

''چل میری بچی اٹھ۔''بُوا اس کا بازو پکڑ کر لے آئی۔

''چل پہلے نہا کر کپڑے بدل۔ بالکل بھوت لگ رہی ہو۔ مٹی سے اَٹی پڑی ہو۔''انیقہ نہا کر نکلی تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ برآمدے میں بچھی کرسی پر بیٹھ کر بارش کی بوندوں کو گرتا دیکھتی رہی۔

بُوا چائے کی ٹرالی برآمدے میں ہی لے آئی۔

''بیٹی! ایک بات پوچھوں۔ پر وعدہ کرو کہ بیگم صاحبہ اور وہاج بیٹے سے کوئی بات نہیں کرو گی۔''

''نہیں بُوا۔۔۔میری کون سی ان کے ساتھ بے تکلفی ہے۔ اگر ہوتی بھی تو میں پھر بھی کوئی بات نہ کرتی۔ آپ بلا جھجک پوچھیں۔''

''تم دونوں میاں بیوی آپس میں خوش تو ہو۔''

''جی خوش ہیں۔''انیقہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''جھوٹ مت بولو میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ جو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں شائد تم سمجھ رہی ہو۔''

''بُوا۔۔۔جب میں انہیں پسند نہیں تھی تو کیوں کی شادی مجھ سے۔ انکار کر دیتے۔ میں کہاں ان بڑے لوگوں کے لائق تھی۔ میں اپنی دنیا میں مگن تھی۔ میں نے تو کبھی سپنے میں بھی ایسے گھر کی تمنا نہیں کی تھی۔ وہاج مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔''انیقہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا۔''بُوا جیسے کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

''نہ رو بیٹی''وہ انیقہ کو تاسف سے دیکھ رہی تھیں۔

''میں آج تک یہی نہیں سمجھ پائی کہ مجھ یتیم لڑکی میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے جو آنٹی نے زبردستی بیٹے کے سر منڈھ دیا۔''

بُوا خاموشی سے سر ہلاتی رہی۔

''آپ یقیناً جانتی ہوں گی۔ مجھے اس بات کا سچ سچ جواب دیں۔ کیا وہاج اس شادی پر رضامند نہیں تھے؟''

''ہاں بیٹی۔۔۔لگتا تو کچھ ایسا ہی تھا۔ شادی کے معاملے میں کئی مہینوں سے ماں بیٹے کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ شادی سے کچھ روز پہلے تو بند کمرے میں کافی جھگڑا ہوا تھا۔ وہاج دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا۔''

انیقہ کے آنسوؤں میں شدت پیدا ہو گئی۔

''رونا بند کرو۔۔۔اور میری بات دھیان سے سنو۔ وہ تمہارا شوہر ہے اگر وہ تمہارے کمرے میں نہیں سوتا تو اس کے کمرے میں چلی جاؤ۔''

''میں کیسے جاؤں؟ وہ کیا سوچیں گے میرے بارے میں''

''جو بھی سوچے۔ تم اس کی بیوی ہو۔ اگر کوئی حق نہ دے تو چھین کر لینا پڑتا ہے۔ آج رات میں خود تمہیں تیار کروں گی خوب سج بن کر جانا اس کے کمرے میں۔''

''نہیں بُوا یہ مجھ سے نہیں ہو گا میں کیوں زبردستی اُن کے گلے پڑوں۔ جب انہیں میری چاہ نہیں تو مجھے بھی پرواہ نہیں۔''

''نہیں بیٹی ایسا مت سوچو۔ آپسی رشتوں میں انا نقصان دیتی ہے۔''

''اگر آنٹی کو پتہ چلا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی۔''

''بیگم صاحبہ کے سونے کے بعد تو وہاج کے کمرے میں جاؤ گی۔ انہیں کون بتائے گا؟ اور اگر انہیں پتہ چل بھی گیا تو اچھا ہے بلکہ تمہیں انہیں بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ ویسے بھی خدا اور اس کے رسول نے تمہیں یہ حق دیا ہے۔ وہ بیاہ کر لایا ہے تمہیں۔ تم بھاگ کر تو نہیں آئی ہو۔''

رات کو کھانے کے بعد جب سب نوکر اپنے کوارٹروں میں اور مسز خان اپنے کمرے میں چلی گئیں تو بُوا نے انیقہ کو زبردستی وہاج کے کمرے میں بھیجا۔

''بلا جھجک کمرے میں چلی جانا۔ اجازت لو گی تو شائد منع کر دے۔''

''بُوا۔۔۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ کہیں بے عزت کر کے مجھے اپنے کمرے سے نکال نہ دیں۔ اگر ایسا ہوا تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا''

''ڈرو نہیں۔۔۔وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ وہ ایسا بداخلاق نہیں ہے۔''

''میرے لیے دعا کرنا بُوا''

''ضرور بیٹی میں تیرے لیے دعا کرتی رہوں گی۔ پریشان مت ہو۔''

''بُوا اگر دروازہ لاک ہوا تو؟''

''تو پھر آہستہ سے کھٹکھٹا لینا۔''

انیقہ نے ڈرتے ڈرتے آہستگی سے بولٹ گھما کر دروازے کا پٹ دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

ٹیبل لیمپ کی نیم روشنی میں اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔

اور پھر جیسے خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

وہاج اور اس کا ڈرائیور۔۔۔۔

انیقہ کی چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ مسز خان، بُوا، ملازم سب بھاگے آئے۔

وہ وہاج کے کمپیوٹر روم کے باہر بیہوش پڑی تھی۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا اور بولا:

''انہیں ہسٹیریا کا دورہ پڑا ہے۔''

''کیوں؟''مسز خان حیران پریشان بے ساختہ بولیں۔

''کنواری لڑکیوں کو بعض اوقات ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ آپ ان کی شادی کر دیں انشاءاللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

مفاہمت کا عذاب

اسرار گاندھی

(الہ آباد، بھارت)

دفتر سے برآمد ہونے والا وہ آخری شخص تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ اپنا تمام کام روز کے روز پورا کر ڈالے۔ جبکہ آفس کے دوسرے، بہت سے لوگ معمولی معمولی کاموں کو ہفتوں ٹالتے رہتے۔ ہاں اگر انھیں کام کرنے کے پیسے ضرورت مند سے مل جاتے تو ان میں تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔

آفس سے باہر نکل کر وہ جب سڑک پر آیا تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔ آسمان پر گہرے بادل اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھے اور ہوا میں کانٹوں کی سی چبھن تھی جو اس کے وجود کو زخمی کر رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی بس اکا دکا راہگیر کبھی کبھی نظر آجاتے۔

اس نے اپنی موٹر بائک کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سنسان راستے سے جلد از جلد نکل کر شہر کے بارونق علاقے میں پہنچ جائے۔

اس کا رخ سول لائنز کی طرف تھا۔

سول لائنز شہر کا سب سے بارونق شاپنگ سینٹر۔ یہاں ہر چیز اپنی انتہا پر نظر آتی۔ وہ فیشن ہو، حسن ہو، مہنگائی ہو یا پھر لوگ۔ نوجوان زیادہ موجود ہوتے۔ وہ ہر طرف خوبصورت پرندوں کی طرح ادھر سے ادھر پھدکتے پھرتے۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی جینس اور سلیولیس ٹاپ میں اپنے پرانے جمال کو واپس دکھانے کی کوشش میں لگی ملتیں۔ خواتین کی اس بھیڑ میں اچانک کسی کسی وقت ایسے چہرے بھی روشن ہو جاتے جو دنوں تک حواس پر چھائے رہتے۔

یہ شاپنگ سینٹر اپنے مہنگائی کے لئے مشہور تھا۔ لیکن پھر بھی یہاں ہر وقت خریداروں کا مجمع اکٹھا رہتا۔ یہاں سے خریداری کرنا اسٹیٹس سمبل تھا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو پنسلیں، کچھ سستی ٹافیاں اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خرید لیتے باقی وقت ونڈو شاپنگ میں ہی گزار کر اپنا معیار ظاہر کرنے کی کوشش کرتے۔

اس نے سول لائنز پہنچ کر ایک جگہ اپنی بائک کھڑی کی اور ایک خوبصورت سی کافی شاپ کی طرف چل پڑا، جو اس کی پسندیدہ سچویشن تھی۔ خوبصورت سے ہال میں قرینے سے سجی ہوئی میزیں، کرسی پر بیٹھے ہوئے نفاست پسند لوگ، دھیمی دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آتے۔ بےحد پرکشش ماحول تھا یہاں پر۔ اس نے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے ہال کا جائزہ لیا۔ بہت سے جانے پہچانے چہرے اپنے خاص رویوں اور اداؤں کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ کئی لوگوں نے اسے وش کیا جس کا جواب اس نے اپنی گردن کو ہلکا سا خم کر کے دیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے اکثر لوگوں سے اس کی شناسائی پرانی تھی۔ وہ سبھی سے بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

یہ سب لوگ تقریباً روزانہ بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں بیٹھے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مقابل میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ کورٹ شپ کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ یہیں اسے ریناشفرڈ ملی تھی۔ لیکن نہیں! ریناشفرڈ سے بھی کافی پہلے وہ اسی کافی شاپ میں شافعہ سے مل چکا تھا۔ شافعہ اسے پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی۔

پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا اور ہر بار وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے تھے۔ وہ تقریباً ہر شام اسی گوشے میں آکر بیٹھ جاتا۔ سڑک کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی میں لگے کلرڈ ونڈو پین کے اس پار اسے سب کچھ خواب جیسا محسوس ہوتا۔

سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں، نوجوانوں کی بھیڑ، ہاتھ میں ہاتھ، روشنی سے منور دوکانیں اور خرید و فروخت۔ کیا کچھ یہاں سے نہیں دکھائی پڑتا تھا۔ ہال کے ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازیں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ سب کچھ خوابیدہ خوابیدہ سا لگتا اور اسی سحر زدہ ماحول کے بیچ سے جب شافعہ اسے کافی شاپ کی طرف آتی ہوئی دکھائی پڑتی تو اس کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ پھیل جاتی۔

شافعہ جو نہایت جاذب نظر تھی۔

شافعہ جس کے جلد پر نگاہیں ایسی ہی پھسلتیں جیسے اسکیٹنگ ہال میں اسکٹ کرنے والوں کے پیر پھسلتے۔

شافعہ جس کی نگاہیں کسی کو بھی گھائل کر دینے پر قادر تھیں۔

شافعہ جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتی تھی اور جس نے اپنے آپ کو رجعت پسندی کے بہت سے قید و بند سے آزاد کر لیا تھا۔

اس دن شافعہ کو کافی شاپ پہنچنے میں قدرے دیر ہو گئی تھی۔ اس تاخیر سے وہ نہایت بے چین ہو گیا تھا۔

شافعہ جب آئی تو اس نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''ویری ساری! مجھے ذرا دیر ہو گئی، میں آفس سے نکلنے والی ہی تھی کہ باس نے ضروری کام سے روک لیا۔ ملٹی نیشنلز کا کلچر تو تم جانتے ہی ہو۔ اپنا وقت کب اپنا وقت ہوتا ہے۔ اس پر کمپنی کا اختیار ہو جاتا ہے۔ ذرا بھی پروٹسٹ کرو تو نوکری سے باہر اور باہر نوکری کا انتظار کرنے والوں کی ایک لمبی کیو۔'' وہ ایک جھٹکے میں اپنی باتیں کہتی چلی گئی۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکرائی۔ ایک دلفریب مسکراہٹ، اس کی جھنجھلاہٹ ہوا ہو گئی۔

''تم اپنے دیر سے آنے کی اطلاع تو دے ہی سکتی تھیں۔'' وہ ٹھہر کر بولا۔

''ہاں مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی، آئندہ خیال رکھوں گی۔''

پھر وہ دیر تک سرگوشیوں میں گم رہے۔ ہال کے باہر کی دنیا اب بھی اسی طرح جوان تھی، خوابیدہ خوابیدہ سی۔ خوابوں میں چلتی پھرتی پرچھائیاں جیسی، ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہوئے جوڑے اور دوکانوں کی وہی چکاچوند۔

اچانک ہال میں ایک چھناکا ہوا۔ شاید کوئی گلاس میز پر سے گر کر ٹوٹا تھا۔ چھناکے کی آواز سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح چونکے جیسے نیند سے

اچانک جاگ پڑے ہوں۔ زیادہ تر نگاہیں اسی جانب اٹھ گئیں جس میز پر سے گلاس گرا تھا۔ اس جگہ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھینپ نمایاں تھی۔

''چلو چلتے ہیں، آج کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی ہے۔'' شافعہ بولی۔

''چلو۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ ابھی اور بیٹھنا چاہتا ہو، لیکن بادل ناخواستہ وہ اٹھ ہی گیا۔ پھر جلد ہی وہ وقت آیا جب کافی شاپ میں روز بیٹھنے والے اس کے واقف کار اسے مس کرنے لگے۔

شافعہ سے شادی کے بعد وہ ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

کتنے خوبصورت تھے وہ دن۔ نرم گرم جذبات کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے۔ نہ ان کے لئے زمین سخت تھی اور نہ آسمان دور۔ دنیا کی تمام عیاریوں سے بے نیاز آزاد پرندے کی طرح ادھر سے ادھر پرواز کرتے ہوئے۔ پھر وہ اڑتے اڑتے تھک گئے اور اچانک انہیں زمین کی طرف ڈائیو مارنا پڑا۔

ان کا پہلا تصادم اس وقت ہوا جب ایک دن شافعہ نے اسے اپنی پرگنینسی کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ اس مصیبت کو اپنی کوکھ میں نہیں رکھ سکتی۔ وہ اباِرشن کرادے گی۔

''مگر کیوں؟'' اس نے شافعہ کو حیرت سے دیکھا۔

''آفس کی زندگی میں ان جھمیلوں کے لئے گنجائش کہاں نکل پاتی ہے۔ آفس میں کام کرنا پھر بچے پالنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے تم سے احتیاط کرنے کو کہا تھا لیکن تم نے خیال نہیں کیا۔''

''تم چاہو تو سروس چھوڑ سکتی ہو، میری تنخواہ میں زندگی اطمینان سے گزر جائے گی۔''

اس کی بات سن کر شافعہ زور سے ہنسی پھر بڑے تیکھے لہجہ میں بولی۔

''تاکہ تم آسانی سے اپنی مرضی مجھ پر تھوپ سکو۔ کیسے کیسے خواب دیکھتے ہیں یہ بے چارے مرد۔''

وہ تلملا گیا۔ بات تلخ ہوگئی تھی لیکن شافعہ اپنے خیال پر جمی رہی پھر اس نے جلد ہی اپنی کوکھ میں موجود سانس لیتی ہوئی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرلیا۔

شافعہ سے اس کا دوسرا جھگڑا اس وقت ہوا، جب اس کے ماں باپ شافعہ کے مسلسل ردعمل سے بیزار ہوکر اپنے بڑے بیٹے کے یہاں چلے گئے۔

یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ انا کے ٹکراؤ نے دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار تعمیر کردی تھی۔

کافی شاپ میں اس کے واقف کار اسے مسلسل مس کررہے تھے۔

پھر ایک دن کافی شاپ میں بیٹھنے والے لوگوں نے اسے اپنی جگہ لیتے ہوئے دیکھا۔ لیکن چند ہی دنوں بعد اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں، چہرے پر پھیلی ہوئی بے چینی اور اس کے عجیب سے رویے نے انھیں بتا دیا کہ اس کی زندگی کسی منجدھار میں پھنس چکی ہے۔

انھیں اس کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوئی۔ انھوں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ گھر سے اس کا تعلق اب صرف اتنا ہی رہ گیا تھا کہ جب وہ صبح سو کر اٹھتا تو میز پر رکھا ہوا ٹھنڈا ناشتہ اس کا انتظار کرتا ہوتا اور رات گئے جب گھر واپس آتا تو کھانا میز پر رکھا ہوا ملتا۔

وہ اکثر سوچتا کہ اس سے کیا بھول ہوگئی۔ غالباً کئی برس چلنے والی کورٹ شپ کے درمیان اس نے اسے پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ شافعہ کے بانہوں کا سہارا لے کر صرف خواب دیکھتا رہا تھا۔

اسے اپنے بچپن کے دوست عابد قادری اور ان کی بیوی سائرہ یاد آئے۔ کتنی خوشگوار زندگی تھی ان کی، ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار۔ عابد کے رومانٹک مزاج ہونے کے باوجود سائرہ کتنے خوبصورت طریقوں سے اسے اپنی زندگی میں ایڈجسٹ کرتی تھی۔

ایک بار اس نے عابد سے پوچھا تھا ''یار یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بیگم میں خوبصورتی کے علاوہ اور کیا کیا دیکھا تھا کہ تمہاری زندگی کا موسم کس قدر خوشگوار ہوگیا''

عابد مسکرا کر بڑے سنجیدہ لہجہ میں بولا۔ ''میں نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ سائرہ بڑی Submissive ہے اور وہ بہت اچھے طریقہ سے میری لائف اسٹائل میں ایڈجسٹ کرسکے گی۔ شادی کے بعد یہ بات سچ ثابت ہوئی، وہ میری باہر والی زندگی میں کبھی دخل نہیں دیتی، وہ جانتی ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا واپس لوٹ کر اسی کے پاس آؤں گا۔ اسے مجھ جیسا چاکلیٹ کریم سولجر ہر صورت میں بے حد پسند ہے۔'' عابد ٹھہر کر مسکرایا اور پھر دوبارہ بولا۔

''حالانکہ وہ اپنے آفس میں ایک بڑی پوسٹ سنبھالے ہوئے ہے۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور عابد نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ اس ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا ہو۔

عابد کے پاس سے لوٹتے وقت اس نے سوچا تھا کہ کاش اس نے شافعہ میں بھی سائرہ جیسی کچھ خوبیاں تلاش کرلی ہوتیں مگر یہاں تو صورت حال ہی برعکس تھی۔ اسے کئی باتیں یاد آئیں۔

''چلو اٹھو ذرا بازار چلنا ہے، کچھ خریداری کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں جاؤں گی، بس میرا موڈ نہیں ہے۔''

اسے وہ وقت بھی یاد آیا کہ جب اس کے کئی اچھے دوست آئے ہوئے تھے، اس نے شافعہ سے چائے بنانے کو کہا تھا، جواب میں شافعہ بولی تھی۔

''دوست آپ کے ہیں آپ خود بنا لیجئے، میں تھکی ہوں۔ یہ سب کام میں نہیں کروں گی۔''

وہ اس طرح کی باتوں پر کچاچا کے رہ جاتا، لیکن کیا کرتا کہ اس کی ازلی شرافت مانع آتی تھی۔

اچانک کسی نے اس کی پیٹھ پر دھپ جمائی۔ وہ چونک پڑا اور

خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو پیچھے اشوک گانگولی کھڑا تھا۔

''ارے کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ میں دیر سے تمہارے پیچھے کھڑا تمہیں گم سم دیکھ رہا ہوں۔'' اشوک کی بات سن کر اسے دھیان آیا کہ وہ واقعی نہ جانے کب سے یادوں کے کٹیلے جنگل میں بھٹک رہا ہے۔ اشوک نے اس کے ساتھ ایک کپ کافی پی تھوڑی سی گپ لڑائی اور نکل گیا۔

اس نے رنگین شیشوں کے اس پار پھر دیکھا۔ بھیڑ چھٹ گئی تھی، دوکانوں کے شٹر گرائے جا رہے تھے، بچے کھچے لوگ اور روڈ پر بھاگتی دوڑتی کاریں اب بھی اسے خوابناک پرچھائیاں ہی لگ رہی تھیں۔

اس نے گھڑی دیکھی 9 بج رہے تھے۔ لاشعوری ردعمل کے طور پر اس نے سوچا کہ گھر چلا جائے لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ وہ گھر جا کر کیا کرے گا؟ وہاں کون منتظر ہوگا؟ شافعہ سے بات چیت ٹوٹے ہوئے کئی مہینے بیت گئے ہیں۔ اب وہ ان چیزوں کا کتنا عادی ہو گیا ہے۔

وہ کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں سے کافی شاپ کے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ سردی شدید ہے، اتنی ہی سردی کا احساس اسے اس رات بھی ہوا تھا جب وہ گھریلو انتشار کے عالم میں اسی شاپنگ سینٹر پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ پھر جب ٹہلتے ٹہلتے تھکان اس کے وجود کو نگلنے لگی تھی تو وہ اس کافی کارنر پر کھڑا ہو گیا تھا جہاں اس کی ایک واقف کار خاتون کسی دوسری عورت کے ساتھ کھڑی کافی پی رہی تھیں اور بڑے منہمک انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی جان پہچان والی عورت کو وِش کیا تو اس نے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

'' اکیلے کیوں کھڑے ہو، ہم لوگوں کے ساتھ ہی کافی پیو۔'' وہ عورت بولی۔

اس کے اشارے پر بیرا اسے بھی ایک کپ کافی دے گیا۔

''دیکھو یہ میری دوست رینا شیفرڈ ہیں۔ کالج میں انگریزی پڑھاتی ہیں اور تمہیں حیرت ہوگی کہ یہ اردو اچھی جانتی ہیں۔'' واقف کار خاتون نے رینا سے اس کا تعارف کرایا۔ متناسب ناک نقشے اور کھلتے سانولے رنگ والی یہ عورت اسے خاصی پرکشش معلوم ہوئی۔ اس نے بغیر سوچے ہوئے اپنا ہاتھ رینا کی طرف بڑھا دیا جو گرم جوشی سے قبول کر لیا گیا۔

''آپ؟'' رینا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں عامر ہوں اور ایک آفس میں جونیئر آفیسر۔'' وہ رک رک کر بولا۔

''خاصی انکم والی پوسٹ ہوگی؟'' رینا ہنستی ہوئی بولی۔

''ہے تو لیکن میں ایسی انکم پر خوش نہیں ہوتا۔''

دونوں نے اسے حیران ہو کر دیکھا پھر وہ مسکرائیں جیسے انھیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

رینا سے پہلی ملاقات کے بعد ملنے کا سلسلہ بن گیا۔ اب رینا اس کے قریب آ گئی تھی۔ وہ اکثر اس کے فلیٹ کا رخ کرتا جو ایک بے حد پاش کالونی میں تھا۔ ایسی کالونی جہاں زندگی کا محور صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔

رینا تنہا رہتی تھی۔

''تمہارے والدین کہاں ہیں۔'' ایک بار اس نے پوچھا۔

''وہ اس شہر میں نہیں رہتے۔ میں سروس کرنے کے لئے یہاں آ گئی ہوں۔'' رینا نے اسے بتایا۔

''اوہ اچھا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

پھر یہ کبھی کبھی کی ملاقاتیں کچھ ہی دنوں میں روزروز کی قربتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ آفس سے نکل کر سیدھے رینا کے فلیٹ پر پہنچ جاتا اور دیر تک اس کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا۔

وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔ باتوں ہی باتوں میں چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی۔ لیکن اسے اس وقت بڑی گھٹن محسوس ہوتی جب ہنسنے ہنسانے کے دوران اسے چپ سی لگ جاتی۔ اس نے کئی بار اس خاموشی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن رینا نے ہمیشہ ٹال دیا تھا۔ پھر بھی وہ اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ رینا کے ساتھ کوئی ایسی ٹریجڈی ہے جو اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔

اس کی زندگی بے آواز بہنے والے دریا کی طرح رواں دواں تھی۔ وہ تھا، رینا تھی، جذباتی لمحے تھے اور سکون۔ وہ گھریلو زندگی کی اذیتوں سے بہت دور نکل آیا تھا۔ یہ ایک طرح کا فرار تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رینا اس سے شادی کر لے لیکن وہ راضی نہیں ہوئی تھی۔

''دیکھو میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ میری اپنی آزادی ہے۔ ہاں لیونگ ٹوگیدر کی طرح سے میرے یہاں آ کر رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔''

رینا کے انویٹیشن کو اس نے محسوس کیا، لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اسے اپنے خاندانی وقار کا پاس تھا۔

اسے اپنے والدین یاد آ گئے کہ جنہیں شافعہ کی وجہ سے بیٹے کی خوشیاں میسر نہ ہو سکی تھیں۔ یہ بات اس کو ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی تھی۔ رینا کے ساتھ رہ کر اپنے والدین کو مزید تکلیف دینا اس کے ضمیر کو گوارا نہ تھا۔

زندگی کی اس سطح پر اچانک ایک دن بھونچال سا آ گیا۔

اس دن رینا کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے وجہ پوچھی تو رینا بے حد جذباتی انداز میں اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''ڈیرسٹ میں پانچ برسوں کے لئے امریکہ جا رہی ہوں مجھے وہاں بہت اچھی پوزیشن مل گئی ہے۔ میں اس کے لئے کافی دنوں سے کوشش کر رہی تھی۔''

''کیا؟ تم امریکہ جا رہی ہو؟''

وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں اور کیا ایسا چانس کہاں ملتا ہے۔''

''یہاں تمہیں اچھی خاصی تنخواہ مل رہی ہے۔وہاں جا کر کیا کروگی؟''

''دیکھو انڈیا انڈیا ہے اور امریکہ امریکہ۔امریکہ ایک خواب ہے اور یہ خواب ہر روز لاکھوں لوگ دیکھتے ہیں۔میں بھی یہ خواب بہت دنوں سے دیکھ رہی تھی۔مگر اب جا کر سچ ثابت ہوا۔'' وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔اسے محسوس ہوا کہ جیسے چکر سا آرہا ہو۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' رینا نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی کو دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں رینا۔'' وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا بولا۔

''دیکھو عامر میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ سکتی ہوں۔کسی نہ کسی دن تو یہ سلسلہ ٹوٹنا ہی تھا،تم میرے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔میں امریکہ نہ جاتی تو بھی ہمارے راستے الگ الگ تھے۔'' رینا نے اپنی بات ایسے لہجے میں کہی جیسے وہ شاندار مستقبل کا خواب دیکھ رہی ہو۔وہ کچھ بولا نہیں بس اسے ایک لخت دیکھے جا رہا تھا۔جیسے اس کا ذہن بلینک ہو گیا ہو۔وہ پھر بولی۔

''عامر ہم دونوں نے جو لمحے ساتھ گزارے وہ بے حد خوبصورت تھے، میں تمہیں یا ان لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔دراصل ہم دونوں زندگی کی سچائیوں سے بھاگ کر ایک دوسرے سے بلا سوچے سمجھے آملے تھے۔''

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر قوس وقزح کی مانند جھکی اور اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ہوا کے ایک بے حد سرد جھونکے نے اس کی سوچ کو تار تار کر دیا۔اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دیر سے اپنی موٹر بائک سے ٹکا ہوا کھڑا ہے۔

سول لائنز تقریباً سنسان ہو چکا تھا۔اس نے سر پر ہیلمٹ جمائی اور اپنی بائک کو کک لگانے لگا۔بائک بھی سردی کے زد میں تھی۔وہ کئی ککوں کے بعد اسٹارٹ ہوئی۔اچانک اسے رینا شفرڈ پھر یاد آ گئی۔ایک خاص موقع پر اس نے کہا تھا۔''عامر مجھ میں اور تمہاری موٹر بائک میں ایک بڑا فرق ہے، میں تمہاری موٹر بائک نہیں ہوں۔'' رینا کا طنز اس کے دل میں چبھ گیا تھا۔

اِس یاد نے اس کے اندر ایک عجیب سا ہیجان پیدا کر دیا۔اسے محسوس ہوا کہ اچانک جیسے سردی کم ہو گئی ہو اور اس کا جسم متحرک اور گرم ہو گیا ہو۔اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں بائک کی رفتار تیز کر دی۔یخ بستہ ہواؤں کے جھونکوں نے اسے جلد ہی نارمل کر دیا۔

اس کا گھر اب بھی کافی دور تھا۔

اس نے سوچا کہ شافعہ تو حسب معمول اب سو چکی ہو گی اور میز پر رکھا ہوا ٹھنڈا کھانا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔اس خیال سے اسے بڑی کوفت محسوس ہوئی۔اسے رینا پھر یاد آ گئی۔رینا کے ساتھ ہی اسے وہ لمحے بھی یاد آ گئے جب وہ اس کی نظروں سے نہ جانے کب تک کے لئے اوجھل ہونے والی تھی۔اس نے جدائی کے آخری لمحوں میں اس سے کہا تھا۔

''عامر اگر ممکن ہو تو شافعہ کے ساتھ تعلقات ٹھیک کر لینا۔کوفت بھری زندگی گزارنے سے کیا حاصل۔اچھا ہے کہ انسان بہتری کا کوئی راستہ نکال لے۔یہ زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔''

رینا شفرڈ چلی گئی لیکن اس کے آخری جملے اسے بار بار جھنجھوڑتے رہتے۔ اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ شافعہ کے ساتھ مفاہمت کا کوئی راستہ نکل سکے، لیکن ان کوششوں کے بعد بھی شافعہ اس کے وجود کو منتشر کرنے لگتی اور وہ پھر بدک جاتا۔اس کے خیال نے پلٹا کھایا اور اس نے سوچا کہ کیا ساری غلطی شافعہ کی ہی ہے؟ کیا عورت مرد کی مخالفت میں جو کچھ بولتی ہے وہ اس کا عندیہ نہیں ہوتا؟ اور کیا وہ خود بالکل فرشتہ ہے؟

کہیں اندر ہی اندر اسے احساس ہوا کہ یہ سچ نہیں ہے۔اس سے بھی نہ جانے کتنی بار سہو ہوئے ہیں، کتنی بار اس نے معمولی معمولی باتوں کو بلاوجہ بڑھایا ہے۔ہر لمحہ اپنے مرد ہونے کے احساس نے کتنی بار حالات خراب کئے ہیں۔اس کی انا ہمیشہ سبک روی سے زندگی گزارنے میں آڑے آئی ہے۔اسے معلوم تھا کہ وہ بھی قصوروار ہے مگر مرد ہونے کا کامپلکس اسے ہر لمحہ اس کی سوچ سمجھ پر اثر انداز ہوتا۔

گھر پہنچا تو دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا۔اس نے بائک کھڑی کی اور دروازہ بند کر کے بیڈروم کی طرف آہستہ آہستہ سے بڑھا تو اسے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔شافعہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس کی نظریں ٹیلی ویژن پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے ٹی.وی.کی طرف نظریں گھمائیں تو دیکھا کہ ایک جوڑا ایک نہایت ہی فحش قسم کے رقص میں مصروف ہے۔اس نے بیوی پر نظر ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی طرح کی بے چینی میں مبتلا ہو۔

وہ قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کر رقص دیکھنے لگا۔

رقص ختم ہوا تو اشتہار دکھائے جانے لگے۔پہلا اشتہار کنڈوم سے متعلق تھا۔اشتہار میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بندر کیلے پر کنڈوم چڑھا رہا ہے۔ اشتہار ختم ہونے کے بعد دونوں کی نظریں ملیں تو وہ ہنس دیئے۔

وہ کرسی سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں آ کر کپڑے بدلنے لگا۔ جب وہ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا تو کھانا ندارد تھا۔وہ بیڈروم میں واپس آ کر لیٹنے لگا تو شافعہ بولی۔

''ابھی نہ لیٹیے میں کھانا گرم کر کے میز پر لگائے دیتی ہوں۔''

''رہنے دو اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔میں ٹھنڈا کھانا ہی کھا لوں گا۔مجھے اس کی عادت پڑ چکی ہے۔''

''سیکڑوں تکلیفیں اٹھائی ہیں تو ایک اور سہی۔'' شافعہ کے جواب میں بھی تیکھا پن تھا۔شافعہ کی بات سن کر اس کے چہرے پر کانٹوں بھری ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ بیڈ سے اٹھا اور ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔

اس نے گرم کھانا میز پر چن دیا اور ایک کرسی پاس کھینچ کر بیٹھ گئی۔

کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولا۔''تمہیں تلنا اور بھوننا خوب آتا ہے۔''

باقی صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ کیجیے

''بانسری کی صدا''

مخدوم محی الدین
(●)

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم ، مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر، درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لَو، تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی ، سہانی صدا
یاد بن بن کے، آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند ، دل میں اترتے رہے
چاندنی ، جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ، گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز، آتی رہی رات بھر
○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

مرے مزار کے کتبے پہ کس نے لکھا ہے
فلک پہ جاگنے والا زمیں پہ سوتا ہے

مرے گمان سے تفریق ہو نہیں سکتی
بُرا ہے کون مرے گھر میں کون اچھّا ہے

عطائیں پردہ اٹھا کر ظہور کرتی ہیں
یہ برگِ سبز میں کن جوگیوں کا خیمہ ہے

کھڑا ہوں جھیل کی خاموشیوں کی حیرت میں
حجر کی اوٹ میں دل کو چرانے والا ہے

چلائے تیر مرے دل پہ اُس نے نظروں کے
وہ دیکھتا ہے مگر دیکھنے میں اندھا ہے

اسی بہانے سے اک ربط ضبط ہے تجھ سے
میرا حریف سہی پھر بھی میرا اپنا ہے

خیالِ یار کو آخر منا ہی لایا ہوں
ذرا سی بات پر ثاقب وہ روٹھ جاتا ہے
○

محمودالحسن
(راولپنڈی)

یہ کیا کہا کہ کڑا امتحان کتنا ہے
شعورِ زیست تجھے میری جان کتنا ہے

زمانہ بھر میں کھُلا ہے اِسی سے رازِ دروں
اگرچہ دیدہِ تر بے زُبان کتنا ہے

اگرچہ روزِ ازل ہی سے ہے وہ کج رفتار
بلندیوں پہ مگر آسمان کتنا ہے

کبھی بتائی نہیں وجہِ دُشمنی اُس نے
وہ تُند خُو ہی سہی بے زبان کتنا ہے

دل و نظر میں موجود فاصلہ پھر بھی
تمہارے اور مرے درمیان کتنا ہے

سکونِ دل میسّر نہ نقدِ جاں محفوظ
تمہارے شہر میں امن و امان کتنا ہے

ہمارے حال سے کر آپ اس کا اندازہ
نہ پوچھ ہم سے کہ وہ مہربان کتنا ہے

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

ہو کا عالم ہے گھر کی تنہائی
چاند نکلا تو آنکھ بھر آئی

چپ کا صحرا عبور کرنا ہے
کام آئے گی آبلہ پائی

جب بھی سورج تراشنا چاہا
میری دنیا میں تیرگی چھائی

ہر ستارہ ہے زخم کی صورت
خوب ہوتی ہے شب کی رسوائی

سچ اکیلا رہا زمانے میں
حرفِ حق کی کہاں پذیرائی

شاخِ لب پر نہ کوئی پھول کھِلا
گرچہ کہنے کو ہے بہار آئی

اس کا جانا بھی سانحہ ٹھہرا
میں تو کھو بیٹھا جیسے گویائی

رتجگا بھی حسنؔ مقدر ہے
یوں بھی سونے کی ہے قسم کھائی

○

واصف حسین واصف
(نیویارک)

شوقِ وارفتگی کی سنتا ہے
راستہ گمرہی کی سنتا ہے

ذہن کے پاس کچھ دلیلیں ہیں
دل مگر جسم ہی کی سنتا ہے

یہ بھی جبریل کو بتانا پڑا
آدمی آدمی کی سنتا ہے

شہر میں ہاؤ ہو کی باراتیں
شہر کب آگہی کی سنتا ہے

خال و خد کے سبھی خیال لیے
ہجر تیرہ شبی کی سنتا ہے

کھلنے لگتے ہیں لفظ، جب کوئی
میرکی، اور ولی کی سنتا ہے

پیٹ کے اک عذاب کے آگے
کون وارفتگی کی سنتا ہے

آپ کو کیا پتہ، یہ دل بد ذات
صرف اپنی لگی کی سنتا ہے

○

ناصر علی سید
(پشاور)

دل آنکھیں اور پتھر سائیں
اب ہیں ایک برابر سائیں

باہر پھول بہت ہیں لیکن
ویرانہ ہے اندر سائیں

اک اک کر کے کٹ گئے سارے
میرے سرو صنوبر سائیں

ابرِ کرم کا کوئی چھینٹا
جھلسے ہیں سب منظر سائیں

دھوپ آندھی بارش کی زد میں
شہر میں اک میرا گھر سائیں

میرے اندر شور مچائے
چُپ کا ایک سمندر سائیں

ہیرے موتی لوگ سمیٹیں
میرے حصے کنکر سائیں

یار نہیں تو واپس لے لے
جو ہے آج میسّر سائیں

○

غالب عرفان
(کراچی)

پروائی ہواؤں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے
جاگے ہوئے خوابوں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

دیواروں سے اترے نہ کہیں سایۂ آسیب
آنگن میں شعاؤں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

اب کوئی نہیں کوئی نہیں منظرِ شب میں
مانگے کے اجالوں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

اب حرف کی تحریک بدلتی ہے زمانے
آنکھوں کے اشاروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

تصویر جو ساکت تھی وہی بول رہی ہے
شیشے کے نظاروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

ٹوٹے ہوئے گنبد کا کلس گرنے سے پہلے
عظمت کے مزاروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

تاریخ بھی خود اپنے کو دہرانے لگی ہے
تہذیب کے دھاروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

دستار سلامت ہے نہ سالم میں قبائیں
لاکھوں میں ہزاروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

خوشبوئے تمدن ہو کہ رنگِ دلِ عرفاںؔ!
اخلاص کے ماروں کا فسوں ٹوٹ رہا ہے

○

عبدالرحمٰن عبد
(امریکہ)

مرے آس پاس ہجوم ہے، میرے ساتھ ساتھ کوئی نہیں
مرے دوستوں کا خیال ہے، مجھے دوستوں کی کمی نہیں

میں غلط سہی، میں بُرا سہی، مری سوچ سب سے جدا سہی
جسے میں سمجھتا ہوں دوستی، مجھے دوستوں میں ملی نہیں

مجھے کچھ کسی سے طلب نہیں یہاں بات ساری اَنا کی ہے
مرے دشمنوں کو خبر نہ ہو، مری دوستوں سے بنی نہیں

مجھے فصلِ گُل کی خبر بھی ہے میری گلستاں پہ نظر بھی ہے
میں بھری بہار کا کیا کروں، مرے دل کی شاخ ہری نہیں

وہی حسرتوں کا ہجوم ہے، وہی درد ہے وہی سوز ہے
مرے آنسوؤں کو خبر کرو، ابھی آگ دل کی بجھی نہیں

سبھی دے رہے ہیں یہ مشورہ، جو چلا گیا اُسے بھول جا
انہیں کیا خبر مرے حال کی، جنہیں چوٹ دل پہ لگی نہیں

کوئی خاص ہے کوئی عام ہے، یہاں سب کا اپنا مقام ہے
یہ تو اس جہاں کا نظام ہے، یہاں گود سب کی بھری نہیں

○

عارف شفیق
(کراچی)

تخیّل سے نئی دنیا بسانا شاعری ہے
جو دیکھوں خواب وہ سب کو دکھانا شاعری ہے

جدا مکان سے آگے بہت آگے نکل کر
زمیں پر چاند تارے کھینچ لانا شاعری ہے

مسافر لوٹ کر آئیں نہ آئیں پھر بھی ہر شب
منڈیروں پر چراغوں کا جلانا شاعری ہے

سناتا ہے کہانی چاند شب کو چاہتوں کی
پرندوں کا سویرے چہچہانا شاعری ہے

نہ ہو دیوار کوئی بیچ میں نام و نسب کی
ہر اک انسان کو سینے سے لگانا شاعری ہے

سہانی رات میں یہ مسکراتے چاند تارے
حسیں فطرت کی کیسی ساحرانہ شاعری ہے

مسافر کی دعائیں دے رہی ہیں یہ گواہی
کسی رستے سے پتھر بھی ہٹانا شاعری ہے

کبھی ٹوٹا ہے کیا تخلیق سے خالق کا رشتہ
مرا سجدے میں گر کے گڑگڑانا شاعری ہے

جمال اس کا ہی تو جلوہ نما ہے ہر غزل میں
میں عارف ہوں تو میری عارفانہ شاعری ہے

○

عظیم بخت
(بھکر)

جنت کی حور، حور کی پائل اٹھا کے رکھ
یوں نہ معاشرے کے مسائل اٹھا کے رکھ

صوم و صلوٰۃ اور تراویح زمین پر
محشر پہ زندگی کے وسائل اٹھا کے رکھ

غم سے نڈھال پھول مرے بے قرار ہیں
واعظ خدا کی صفت و فضائل اٹھا کے رکھ

اس تیرگی نے راستہ ہم کو دکھا دیا
اثرات روشنی کے ہیں زائل اٹھا کے رکھ

روٹی کا فلسفہ مرے ہاتھوں کے بیچ ہے
اپنے صحیفہ جات و رسائل اٹھا کے رکھ

دست دعا دراز کروں پھر ترے حضور
پہلے جو آسمان ہیں حائل اٹھا کے رکھ

اس میں صبا کا دوش نہیں نا طوفان کا
تیرا ہی بادبان ہے گھائل اٹھا کے رکھ

سر پنچ سو رہا ہے ذرا انتظار کر
ان مسئلوں کو حشر پہ سائل اٹھا کے رکھ

○

آخر کب تک

وحشی سعید

(سری نگر، کشمیر)

کولمبس نے پندرہویں صدی کے اواخر میں اپنی سرکردگی میں اُس زمانے کے جدید سمندری جہاز کو ایک نئی دنیا دریافت کرنے کے لئے تیار کیا۔ یہ نئی دنیا وہ دنیا تھی جو تاریخ کی کتابوں میں ''سونے کی چڑیا'' کے نام سے مشہور تھی۔اس سے پہلے کولمبس خانہ بدوشوں کی طرح یورپ کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا رہا۔اُس زمانے میں سارا یورپ خستہ حال معیشت کا شکار تھا۔کولمبس نے اپنے آخری پڑاؤ کے لئے اٹلی کو چنا۔اٹلی کے بادشاہ کے سامنے جب کولمبس نے ایک نئی دنیا ''سونے کی چڑیا'' کو دریافت کرنے کی تجویز رکھی اور اُسے یقین دلایا کہ اس نئے ملک کی دریافت سے نہ صرف اٹلی کو بلکہ سارے یورپ کی معیشت کو سہارا ملے گا، تو کولمبس کے اس سفر کا سارا خرچہ شاہی خاندان نے برداشت کیا۔

کولمبس ایک نئی دنیا کی دریافت کے لئے سفر پہ روانہ ہوا۔لیکن کولمبس کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایسے ملک کو دریافت کرے گا جو دنیا کا سب سے بڑا سامراج بنے گا۔کولمبس کے سمندری جہاز نے سب سے پہلے کیوبا کے ساحل کو چھولیا۔اس طرح براعظم امریکہ کے کئی علاقوں کو دریافت کرنے کا سہرا کولمبس کو ملا۔کولمبس نے اپنے آخری سمندری سفر میں وینزولا کو دریافت کیا۔کولمبس کے اس سفر پر بہت خرچہ ہوا،لیکن اس کے باوجود اٹلی کے شہنشاہ کے ہاتھ میں نہ سونا، نہ چاندی اور نہ جواہرت آئے۔اس کے باوجود یورپ کے تمام ملکوں نے اس نئے براعظم پر اپنی نظریں گاڑھ دیں۔ان سب ملکوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ یورپ اپنی اعلیٰ تہذیب کو برقرار رکھے گا اور تمام مجرم اور اوباش انسانوں سے اپنی زمین کو پاک وصاف کرکے اُنہیں اپنے ملکوں سے باہر نکال کر براعظم امریکہ بھیجے گا۔اس طرح براعظم امریکہ یورپ کے لئے کالا پانی کے طور پر استعمال ہونے لگا۔یورپ کے سارے ممالک اپنے قاتل، چور اور اُچکے شہریوں کو اس نئے ملک میں بھیجنے لگے۔اسی لئے تاریخ میں آج بھی امریکہ چوروں ، فتنہ بازوں اور قاتلوں کے ملک کے نام سے جانا جاتا ہے۔شومیِٔ قسمت دیکھئے کہ یہ ملک دنیا کا سب سے بڑا سامراج ہے۔

اُس زمانے میں عرب میں ایک مشہور شہنشاہ ہارون رشید ہوا کرتا تھا۔اس شہنشاہ کی راج دھانی دمشق ہوا کرتی تھی۔تاریخ میں ہارون رشید کی سلطنت کو عثمانیہ سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جہاں تاریخ میں ہارون رشید کا ذکر آتا ہے وہاں سند باد جہازی کا بھی ذکر آتا ہے۔قصوں اور کہانیوں میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ہارون رشید نے سند باد جہازی کے سمندری سفر کے لئے اپنے خزانے کھول دیے تھے۔سند باد جہازی نے اُس زمانے کا سب سے بڑا اور بہترین سمندری جہاز تیار کیا تھا۔یہ جہاز اُس زمانے کی تکنیک کا ایک نمونہ تھا۔سند باد اس جہاز کے ذریعے ایک نئے ملک کی دریافت کے لئے روانہ ہوا۔

قصہ گو اپنے قصوں میں لکھتے ہیں کہ ہارون رشید نے خود اس سمندری جہاز کو ہری جھنڈی دکھائی اور دعاؤں کے ساتھ سند باد کو سفر کے لئے روانہ کیا۔سند باد جہازی بھی اُن ہی راستوں سے گزرا جن راستوں سے کولمبس گزرا تھا۔وہ بھی ایک ایسے ہی ملک کی تلاش میں نکلا جو تاریخ میں ''سونے کی چڑیا'' کے نام سے مشہور تھا۔لیکن وہ ایک ایسے جزیرے کے پاس پہنچا جہاں دھوپ ہر وقت آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتی تھی۔اس جزیرے میں صاف وشفاف پانی کے دریا رواں دواں تھے۔یہاں کی جھیلیں میٹھے پانیوں سے آباد تھیں۔یہاں کے جھرنے اُچھل کر آسمان کو چھونے کی کوشش کررہے تھے۔سبزہ زاروں کے وسیع میدان، نہ ختم ہونے والے رنگ برنگے پھولوں کی قطاریں، اونچے اونچے پہاڑ، لاتعداد خوش رنگ اُڑان بھرتے پرندوں کے جھنڈ ایسا منظر پیش کررہے تھے کہ سند باد نے خود سے کہا کہ۔۔

اگر جنت کہیں ہے؟ تو یہیں ہے،یہیں ہے،ےےے

اس نامعلوم جزیرے کی لازوال خوبصورتی سند باد جہازی کی حیرتوں کو پار کرتے ہوئے ایک ایسی سوچ میں لے جارہی تھی کہ جہاں حقیقت بھی خواب لگتی تھی۔جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو سند باد نے اپنا جہاز اس جزیرے کے ساتھ لگادیا۔سند باد جہازی کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے ایک پہاڑی کو یوں جگمگاتے ہوئے دیکھا جیسے کہ زمین پر سورج اُتر آیا ہو۔رات کے اندھیرے میں اس نور کی پہاڑی نے سارے جزیرے کو اپنے نور سے منور کردیا۔اس جزیرے کے باشندے کوئلے سے بھی کالے تھے۔حبشیوں کی ایک بڑی تعداد سند باد جہازی کے طرف بڑھی۔اُن کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور سند باد ان نیزوں کے نرغے میں آگیا۔حبشیوں کے سردار نے ایک ایسی زبان میں محافظوں کے ساتھ بات کی جو زبان سند باد کی سمجھ میں اس لئے آئی کیونکہ وہ زبان اُن پرانی زبانوں میں سے ایک تھی جن سے سند باد واقف تھا۔

سند باد جہازی نے سمجھ لیا کہ سردار نے اپنے محافظوں سے کہا۔۔۔

''چلو اس آدم زاد کو بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کریں'

محافظوں کی اس ٹکڑی نے سند باد جہازی کو ایک بہت بڑے غار کے پاس لے جا کر روکا۔پھر سند باد جہازی کو اس غار کے اندر لے گئے۔

غار کے اندر بھی ایسی زبردست روشنی تھی جس سے غار کا اندرون جگمگا رہا تھا۔

سند باد جہازی نے اپنے آپ کو ایک نہایت مضبوط،قد آور اور چٹان سے

بھی سخت کالے دیو کے سامنے کھڑا پایا۔
بادشاہ سلامت ایک بڑی چٹان پر براجمان تھے۔
محافظوں کے سپہ سالار نے سندباد جہازی کو حکم دیا۔۔۔
''کم ظرف نظریں جھکاؤ''
بادشاہ سلامت نے سپہ سالار سے پوچھا۔۔۔
''اس عجوبے کو کہاں سے اُٹھالائے''
سپہ سالار نے جواب دیا۔۔
''عالی جناب! یہ کہاں سے آیا، کیوں آیا اور کیسے آیا معلوم نہیں؟''
بادشاہ سلامت سندباد سے مخاطب ہوئے۔۔۔
''ارے او عجوبے! کیوں آئے ہو ہماری دنیا میں خلل ڈالنے۔۔؟''
سندباد نے جواب دیا۔۔
''شہنشاہ عالم! میں وہاں سے آیا ہوں جہاں دن کی روشنی میں ریگستان آگ برساتے ہیں۔ وہی ریگستان رات میں خنک ہواؤں سے ہمارے جسموں کو سہلاتے ہیں۔ اُس ملک کا شہنشاہ ہارون رشید ہے، جس کے دل میں سب کے لئے کوٹ کوٹ کے محبت بھری ہوئی ہے۔۔۔ بے لوث خلوص اور اُنس بھرا ہوا ہے''
بادشاہ سلامت فرمانے لگے۔۔۔
''اے عجوبے! بولتے تو بہت اچھا ہو، لیکن تمہارا اصل ارادہ ہے کیا۔ تمہاری نیت میں پنہاں کیا ہے؟۔ ہمارے حفاظتی دستے کا سربراہ تم سے پوچھ تاچھ کرے گا اور معلوم ہوگا کہ تمہارا اصل ارادہ کیا ہے''
سندباد نہایت انکساری سے عرض کرنے لگا۔۔۔
''شہنشاہ عالم! میرے شہنشاہ نے آپ کے لئے تحفے بھیجے ہیں۔ اگر اجازت دیں تو میں وہ تحفے اپنے جہاز سے لاکر آپ کے حضور میں پیش کروں۔ شہنشاہ عالم! اُن تحفوں کو دیکھنے کے بعد آپ کا حکم سرآنکھوں پر''
بادشاہ سلامت کچھ دیر کے لئے خاموش رہے، پھر بڑی بڑی آنکھوں سے سندباد کو ٹٹول کر بولنے لگے۔۔۔
''جہازی! کہیں تمہارا شیطانی دماغ یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ تو نہیں بنارہا ہے۔۔۔؟''
جہازی کہنے لگا۔۔
''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ شیطان کتنے ہی جتن کرے، میرے دماغ میں بسیرا نہیں کرسکتا''
بادشاہ سلامت اپنے پہرے داروں سے کہنے لگے۔۔۔
''جاؤ، اس اللہ کے بندے کے ساتھ، اور دیکھو کہ اس نے اس ٹوٹے پھوٹے جہاز میں ہمارے لئے کیسے کیسے تحفے لائے ہیں''
پہرے داروں نے سندباد کو نیزوں سے گھیر کر جہاز کی طرف چلنے کو کہا۔

جہاز کے پاس پہنچ کر جہازی نے پہرے داروں کو تحفوں کے ڈبے سونپے۔ پہرہ داروں نے سندباد اور ان تحائف کے ڈبوں کو دربار میں پیش کیا۔
بادشاہ سلامت کہنے لگے۔۔۔
''اپنے ڈبوں سے اپنے انمول تحائف کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کرو''
سندباد نے پہلا ڈبہ کھولا۔۔
''شہنشاہ عالم! یہ ریشم سے بنا ہوا قالین ایران کے بڑے اور بہترین کاری گر نے ہارون رشید کے لئے بنایا ہے۔ شہنشاہ نے اپنے اس ریشمی قالین کو آپ کے تخت بلور کی سجاوٹ کے لئے بھیجا ہے''
سندباد نے دوسرا ڈبہ کھولا۔۔۔
اس دوسرے ڈبے سے باریک اور خوش نما کپڑا نکلا جس پر نازک ہاتھوں سے پھول، بوٹے اور شاہکار نقشوں کی کڑھائی کی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے کپڑے پر عمر خیام کی رُباعی لکھی ہو۔ اطلس کے کپڑے پر ایسی تصویر نہ آج تک بنی تھی اور نہ بنے گی۔
سندباد کہنے لگا۔۔۔
''حضور والا۔۔ یہ آپ کی ملکہ کی نذر''
بادشاہ سلامت کہنے لگے۔۔ خوب بہت خوب!
سندباد نے آخری اور تیسرا ڈبہ کھولا۔۔۔
کھجور سے بھرا ہوا وہ ڈبہ بادشاہ سلامت کے سامنے رکھا۔
بادشاہ سلامت پوچھنے لگے۔۔ یہ کیا ہے سندباد!
''شہنشاہِ عالم! یہ عرب کا وہ پھل ہے جو اللہ نے جنت سے ہم کو بھیجا ہے۔ ایسے لطیف پھل کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ شہنشاہ! اس پھل کو چکھئے اور لطف اندوز ہوجایئے''
بادشاہ سلامت نے اپنے محافظ کو اشارہ کیا۔ محافظ نے پھل کو طشتری میں پیش کیا۔ بادشاہ سلامت نے پھل کو چکھا اور خوشی سے جھومنے لگا۔
''بے شک سندباد بے شک! ایسا میوہ ہم نے آج تک نہیں چکھا ہے۔ سندباد! تم نے مابدولت کو بے حد خوش کردیا۔ بول تمہیں کیا چاہیے''
''شہنشاہ! آپ سے ملا، آپ جیسے قدآور سے ملنا میرے لئے ایک یادگار ہے۔ میں نے آپ کے اس جزیرے کا ذکر داستانوں میں سنا تھا لیکن آج آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے شہنشاہ ہارون رشید کو اس جزیرے کے انمول تحائف تفصیل سے پیش کروں گا''
بادشاہ سلامت کہنے لگے۔۔۔
''ہمارا ارادہ تمہیں صلیب پر لٹکانے کا تھا، لیکن تم نے جس انداز سے اپنے شہنشاہ اور اُن کے تحائف کو پیش کیا وہ ہمارے لئے اور اس جزیرے کے لئے عظیم سرمایہ کی طرح ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہوگیا۔ ہم بھی تمہارے شہنشاہ کے لئے ایک خاص تحفہ بھیجنا چاہتے ہیں''

بادشاہ سلامت نے محافظوں کے سردار کو اشارہ کیا۔
سردار پوچھنے لگے۔۔۔
''حکم شہنشاہ عالم۔۔!''
''سند باد کا، ہماری پروقار شاہی روایتوں کے مطابق شاندار سواگت اور ضیافتوں سے استقبال کیا جائے۔اس استقبال کے بعد اُس کو اپنے وطن عزت کے ساتھ واپس روانہ کیا جائے۔ ہماری متبرک نور کی پہاڑی سے ایک پتھر نکال کر ہماری طرف سے اُسے ایک تحفہ کے بطور دیا جائے تاکہ سند باد جہازی اسے اپنے شہنشاہ ہارون رشید کو پیش کرے اور شہنشاہ کو معلوم ہو کہ سند باد مابدولت سے ملاقی ہوا تھا''

تحفے میں ایک ایسا پتھر لایا گیا جو رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دن کی روشنی کی طرح جگمگا تا تھا

''جاؤ سند باد جاؤ''

جزیرے کے عوام ،محافظوں اور ان کے سردار نے سند باد جہازی کو اپنے پرسوز گیتوں سے الوداع کہا۔سند باد کے ہاتھوں میں نور کا پتھر تھا۔

سند باد ہاتھ ہلا ہلا کر رخصتی لے رہا تھا۔سند باد نے اپنے جہاز کو دمشق کی طرف موڑا۔کئی مہینوں کے سفر کے بعد اور تھکا ماندا سند باد جب دمشق پہنچا تو اپنے فرض منصبی کے تحت وہ سب سے پہلے ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہوا۔بادشاہ ہارون رشید کہنے لگے۔۔۔

''مبارک سند باد مبارک۔کون سا نیا ملک دیکھ کر آئے ہو اور ہمارے لئے اُس ملک سے کیا لائے ہو۔۔؟''

سند باد عرض کرنے لگا۔۔

''شہنشاہ عالم۔ایک ایسے جزیرے سے آیا ہوں جس کو دیکھ کر جنت کا گمان ہوتا ہے۔وہاں کا خادم قوم قد آور،قوی ہیکل،رات کے اندھیروں جیسا کالا ،لیکن دل کا واقعی شہنشاہ ہے۔عالی جناب! آپ کے لئے اُس نے تحفہ بھیجا ہے''

سند باد نے ایک بڑا صندوق بادشاہ کے سامنے رکھا۔

ہارون رشید فرمانے لگے۔۔۔

''بہت وزنی تحفہ ہے''

سند باد نے صندوق کھولا اور ایک بڑے پتھر کو ہارون رشید کے سامنے رکھا۔ہارون رشید نے غصے کے ساتھ سند باد سے کہا۔۔

''کیا مذاق ہے''

''حضور یہ ایسا پتھر ہے جو رات کو دن میں تبدیل کرتا ہے''

ہارون رشید فرمانے لگے۔۔۔

اگر یہ بات ثابت نہ ہوئی تو سند باد تمہاری باقی کی ساری زندگی قفس کی تنہائی میں گزرے گی''

پھر رات آگئی اور اُس پتھر نے دمشق کو دن کے اُجالے میں تبدیل کردیا۔

ہارون رشید بے ساختہ کہنے لگے۔۔۔

''اللہ! تمہاری قدرت میں ہزاروں راز سربستہ ہیں''

مورخین کہتے ہیں سلطنت عثمانیہ میں اس دن کے بعد کبھی سورج نہیں ڈوبا ۔جب یورپ کو یہ معلوم ہوا کہ ہارون رشید کی سلطنت میں سورج نہیں ڈوبتا تو تمام یورپ کے چھوٹے بڑے ممالک جمع ہوگئے اور پھر کولمبس کو بلایا گیا۔اُسے حکم دیا گیا کہ۔۔

''ایک سمندری جہاز بناؤ اور اُس ملک کا پتہ لگاؤ جہاں نور کا پہاڑ ہے۔اُس ملک کی دریافت کے بعد ہم اُس ملک کو غلام بنادیں گے تاکہ نور کے پہاڑ پر ہمارا قبضہ ہوجائے''

کولمبس نے بادشاہوں کے حکم کے سامنے سر جھکایا۔ جہاز تیار ہوا اور کولمبس اپنی زندگی کے آخری سمندری سفر پر روانہ ہوگیا۔کولمبس بہت سالوں تک ایک سمندر سے دوسرے سمندر کو پار کرتا رہا لیکن وہ جزیرہ اُس کو نہ ملا جہاں نور کا پہاڑ تھا۔آخر کار کولمبس اس سفر کے دوران ہی بوڑھا ہوگیا۔اس کے بعد وہ بیمار ہوگیا یہاں تک کہ اُس کی موت واقع ہوگئی۔

یورپ کولمبس کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا لیکن نور کا پہاڑ یورپ کے ہاتھ نہ آیا۔ وقت کے مورخین نے جزیرے کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کردیا کہ۔۔۔سند باد کے سفر کی واپسی کے بعد وہ جزیرہ صفحہ ہستی سے ہی غائب ہوگیا۔

ہارون رشید کی موت کے بعد سلطنت عثمانیہ کا سورج بھی غروب ہوگیا۔ کولمبس کا دریافت کیا ہوا ملک اور یورپ آج تک سند باد کے لائے ہوئے نور کے پتھر کی تلاش میں عرب کے ریگستانوں کو سالہا سال سے دہشت کا شکار بنا رہے ہیں۔۔۔!

''اُجڑا ہوا مکان''

یہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے کیسے کیسے مکان خراب ہوگئے اور کیسے کیسے جوان مرگئے کیسے باغ ویرانے ہوگئے کیسی محفلیں افسانہ ہو گئیں کیسے پھول کمہلا گئے کیسے جوان گزر گئے کیسی مجلسیں اکھڑ گئیں کیسے قافلے کوچ کر گئے کیسے عزیز خوار ہوئے اور کیسے لوگ بااختیار ہوئے اس عبرت بیں آنکھ نے کیا کیا دیکھا اور ان کانوں نے کیا کیا سن لیا ہر کاسہ سر کسی تاج سر کی کہانی کہہ رہا ہے اور ہر اجڑا ہوا مکان در و دیوار کی نشانی ہے یہ دنیا ایک کہانی ہے جس کا کچھ حصہ ہم نے بیان کردیا جو باقی رہ گیا وہ اب اور کوئی سنائے گا۔

(میر کی آپ بیتی سے اقتباس)

''اُف یہ برگرز''

رومانہ رومی
(کراچی)

میں دن کے قریب ۱۱ بجے ڈاکٹر ظفر کے کلینک میں داخل ہوا اردگرد نظر ڈالی تو اچھے خاصے لوگ موجود تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں استقبالیہ کی جانب بڑھا جہاں آمنہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی''ڈاکٹر صاحب کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں مسکرایا اور بولا''تم تو جانتی ہو کراچی کا ٹریفک کتنا خوفناک ہے بس اُسی میں پھنس گیا تھا۔'' ''اوکے۔۔۔آپ انتظار کریں ابھی ایک مریض اندر ہے وہ جیسے ہی آتی ہے میں آپ کو اندر بھیجتی ہوں''۔ پھر اُس نے ڈاکٹر ظفر کے روم کا نمبر ڈائل کیا اور اُنہیں میری آمد کی اطلاع دی۔

میں کوئی بڑا آدمی نہیں جس کے لیے ڈاکٹر صاحب بے چین ہیں میں تو بس معمولی سا ایک میڈیکل ریپ ہوں اور ڈاکٹر صاحب کی آرڈر کی ہوئی دوائیاں ان کو دینے آیا تھا جو آج کل مارکیٹ سے غائب تھیں۔۔۔میں نے وہ ساری دوائیاں مارکیٹ سے اُٹھالی تھیں اور ڈاکٹر ظفر کو دینے آیا تھا کیوں کہ اس کام میں مجھے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

آپ سوچ رہے ہونگے یہ ڈاکٹر ظفر کون ہے؟ جی بتاتا ہوں! ڈاکٹر ظفر کراچی کے ایک مشہور و معروف اسکن اسپیشلسٹ ہیں۔ مارننگ شوز کی جان اور دولت مند خواتین کا مان ہیں۔

ڈاکٹر ظفر کی زندگی کی کہانی میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا کیوں کہ میں اِس کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک ہوں۔۔۔ہم دونوں نے پری میڈیکل گروپ سے انٹر سائنس ایک ساتھ کیا مگر نمبر کم ہونے کی وجہ سے دونوں ہی کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملا اس کے علاوہ ہمارے والدین بھی اتنی حیثیت نہیں رکھتے تھے کہ ہم بھی کسی پرائیویٹ میڈیکل یونی ورسٹی سے پڑھ کر اپنی خواہش پوری کر سکتے۔ لہٰذا میں نے B.Sc کر کے ایک فارما کمپنی جوائن کر لی اور ترقی کرتے کرتے اِب ایک اچھی پوزیشن پر معقول تنخواہ اور سہولیات کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔۔۔رہی بات ڈاکٹر ظفر کی تو اِس نے اُس بات کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا اور والدین سے لڑ جھگڑ کر کچھ پیسوں کا انتظام کر کے ملک سے باہر چلا گیا۔۔۔۱۰ برس کے طویل عرصہ کے بعد اُس کی جب وطن واپسی ہوئی تو ڈاکٹری کی ڈگری کے ساتھ ساتھ بہت سارا پیسہ بھی وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا جس سے اُس نے کراچی کے سب سے پوش علاقے میں اپنا ذاتی کلینک کھول لیا۔۔۔آدمی تیز تھا لہٰذا مشہوری کے لیے پیسے خرچ کر کے مختلف ٹی وی چینلز کے مارننگ شوز میں بے حیثیت اسکن اسپیشلسٹ کے طور پر آنے لگا اور پھر جلد ہی بڑی بڑی بیگمات سے تعلقات بنا کر اب شہر کا مشہور و معروف اسکن اسپیشلسٹ بن چکا تھا۔

ویسے تو اُس کے کلینک کا ٹائم دوپہر ۲ بجے کے بعد شروع ہوتا تھا مگر آج ہفتہ کا دن تھا اور مارننگ شوز کی چھٹی کا دن بھی لہٰذا وہ صبح سے کلینک میں موجود تھا۔۔اُس کے مریضوں میں زیادہ تر عمر رسیدہ خواتین ہوتی تھیں جو اپنے چہرے پر پڑنے والی جھریوں اور چھائیوں سے پریشان ہوتی تھیں۔۔۔کچھ He She نما لڑکے بھی اپنی اسکن کی کیئر کے لیے ڈاکٹر ظفر کے پاس آتے تھے۔

اتنے عرصہ بعد جب ڈاکٹر ظفر کو پہلی بار میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تو یقین نہیں آیا۔ اتنے سالوں میں اس کی رنگت صاف، جسم تندرست اور شخصیت پُر اعتماد ہو چکی تھی۔۔۔میں نے خود ہی اُس سے رابطہ کیا اور تجدید دوستی کے ساتھ کاروباری تعلقات بھی استوار ہو گئے وہ مجھ سے ادویات خریدتا تھا جو ویسے تو مارکیٹ میں نہایت آسانی اور سستے داموں دستیاب تھیں مگر یہ اُس کا ایک راز تھا اور میں اب اس کا رازدار۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ظفر کے روم کا دروازہ کھلا اور ایک ۲۰،۲۲ سالہ نہایت نرو نازک سی گوری چٹی لڑکی اُس کے کمرے سے نکلی اور اُس کے پیچھے ہی ڈاکٹر ظفر بھی۔۔۔اُس نے باہر آکر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا ایک جائزہ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو بڑے اسٹائل سے نچا کر بولا''پلیز پلیز! میں بہت تھک گیا ہوں اگر چہ آپ لوگ انتظار کر رہے ہیں مگر مجھے ۱۵ منٹ کا بریک لینا ہو گا۔۔۔پلیز آپ لوگ مائنڈ نہ کیجئے گا بس میں ابھی آپ لوگوں کو اندر بلواتا ہوں''۔۔۔اور پھر بڑے اسٹائل سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا''اُف عمران! تم بھی نہ۔۔۔بہت wait کرواتے ہو۔۔۔آؤ اندر چلتے ہیں۔۔۔میں نے اپنا بیگ اُٹھایا اور اُس کے روم کی طرف چل پڑا۔

ویسے تو پورا کلینک ہی بہت شاندار اور خوبصورت بنا ہوا تھا مگر ڈاکٹر ظفر نے اپنے روم کو بہت ہی اسپیشل ڈیزائن کروایا تھا۔۔۔کمرے کی ڈیکوریشن، کلر اسکیم اور فینسی لائیٹنگ ماحول کو رومانٹک بنا رہی تھی۔۔۔ڈاکٹر ظفر کی میز کے پیچھے والی دیوار کو ایک قدرتی جھرنے کے انداز والے وال پیپر سے سجایا گیا تھا جو AC کی کولنگ کے سبب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کشمیر کی وادی۔۔۔ڈاکٹر ظفر نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ ۲ منٹ بعد ہی گرما گرم لذیز کافی کی دو پیالیاں آگئیں۔۔۔وہ کرسی پر آرام سے بیٹھا کافی کی چسکیاں لینے لگا۔۔۔میں بھی بہت ایزی تھا میں جانتا تھا کہ یہ اُس کا اپنے مریضوں پر اپنی اہمیت جتانے کا ایک حربہ تھا۔۔۔چونکہ وہ بچپن ہی سے احساس کمتری کا شکار رہا تھا لہٰذا اِس مقام پر پہنچ کر اُس نے اپنی فرسٹریشن کو مختلف حرکات سے نکالنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے دوائیاں اُس کے حوالے کیں جن کو اس نے بڑے سلیقے سے اپنی میز کی مختلف درازوں میں سیٹ کر دیا۔۔۔اُس کے ساتھ ہی میرے لائی

ہوئی چہرے کے پھنسیوں اورداغوں کوختم کرنے والی معمولی ٹیوب کواُس نے اپنی
کمپنی کی ٹیوب میں بھر دیا جس کو وہ اپنے مریضوں کو بڑے مہنگے داموں دیتا
تھا۔۔۔یہ ساراکام اُس نے ۱۵منٹ کے اندراندر کرڈالا کہ وہ مریضوں کو یہ بات
بھی جتانا چاہتا تھا کہ وہ وقت کا بے حد پابند انسان ہے۔۔۔ٹھیک ۱۵منٹ بعد
اُس نے گھنٹی بجائی۔۔۔ اگلے ہی لمحہ دروازہ کھلا اور ایک نازک اندام سے
خوبصورت دوشیزہ اپنے چہرے کے ایک حصّے کوٹشو پیپر سے چھپائے اندر داخل
ہوئی۔۔۔مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دیکھ کر ذرا ٹھٹکی مگر ڈاکٹرظفر نے بڑے
اعتماد سے اُسے آگے بڑھ کر ریسیو کیا۔۔۔اور پیار سے بولا''ہیلو بے بی! کیا ہوا
آپ کو؟ اُس نے اپنی آواز میں دنیا بھر کا پیاراورفکرسموتے ہوئے کہا۔۔۔''اُف
ڈاکٹر! کیا بتاؤں! یہ دیکھیں''۔۔۔اتنا کہہ کرلڑکی نے ٹشو پیپر کوگال سے ہٹایا جہاں
ایک معمولی نوعیت کا دانہ لڑکی کے حسین چہرے پرمنہ چڑاتا دکھائی دے رہا تھااور
لڑکی اِس معمولی سے دانہ کا اپنے چہرے پرنکل آنے پراِس قدر پریشان اورخوفزدہ
تھی جیسے خدانخواستہ اُس کے چہرے پر برص یا اُس سے بھی کوئی مہلک بیماری
نمودار ہوچکی ہو۔۔۔مگر ڈاکٹرظفر کا ردِّعمل تو اِس سے بھی زیادہ خوفناک اورفکر
مندانہ تھا وہ فوراً اپنی سیٹ چھوڑ کر اُٹھا اورلڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔۔۔اِس
دوران وہ اپنے ہاتھوں میں دستانے پہننا اور محدب عدسہ اُٹھانا نہیں بھولا
تھا۔۔۔''اُف مائی گاڈ! یہ کیا کرلیا تم نے بے بی؟ اُف ایسا کیسے کرسکتی ہو تم؟ اتنی
کیئرلیس! او مائی گاڈ! تم نے اپنی لاپروائی سے اپنے اتنے خوبصورت اورحسین
چہرے کو کیا بنا دیا ہے۔۔۔میں تو حیران ہوں بے بی! اتنا خوفناک Pimple او
مائی گاڈ!''ڈاکٹرظفر کا اترانا اوراس کے چہرے کو بار بار محدب عدسہ سے دیکھ کر
ایک ہی بات کہنا اورلڑکی کے چہرے کی معمولی سی پھنسی کو اتنا بڑا ایشو بنا کر اُس کے
سامنے پیش کرنے پر میں دل ہی دل میں اُس کی فنکاری کی داد دیئے بغیر نہ رہ
سکا۔۔۔لڑکی کی شکل بھی بس دیکھنے والی تھی۔۔۔اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ
ڈاکٹرظفر کے گلے لگ کر رونے لگے۔

میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر ظفرلڑکی کی اِس حالت سے دل ہی دل میں
لطف اندوز ہو رہا تھا مگر چہرے کے تاثرات پرکنٹرول کرنے پراُسے عبورحاصل
تھا۔۔۔اُس کی آنکھوں سے چھلکتی فکرمندی اور چہرے پر چھائی سنجیدگی۔۔۔
معصوم سی لڑکی کا دل ہولا دینے کے لیے کافی تھی۔۔۔حالانکہ لڑکی کی عمر ۲۰ سال
کے قریب تھی اوراِس عمر میں چہرے پر اِس قسم کے دانوں یا پھنسیوں کا نکلنا عام سی
بات ہوتی ہے مگر ڈاکٹرظفر اِس کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک
خطرناک بیماری کی طرف لے جا کر ہی تو پیسے چھاپ رہا تھا۔۔۔اِب اُس نے لڑکی
کو باقاعدہ ڈانٹنا شروع کر دیا۔۔۔''بے بی! تم اپنا بالکل دھیان نہیں رکھ رہی
ہو۔۔۔پلیز ڈیئر تم اپنے آپ کو اِس طرح برباد نہیں کرسکتی۔۔۔میں تمھیں اِس کی
اجازت بالکل نہیں دوں گا۔۔۔پلیز میری جان! کیئر کرو اپنی، اپنے خوبصورت
چہرے کی، اپنی بیوٹی کی'۔۔۔یہ باتیں وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم گھوم کر کر
رہا تھا۔۔لڑکی نے تقریباً روتے ہوئے کہا''میں کیا کروں ڈاکٹر صاحب! میں تو
اپنی ڈائیٹ کا بہت خیال کرتی ہوں اور میک اپ کا سارا سامان بھی ہمیشہ برانڈڈ
ہی استعمال کرتی ہوں مگر اُف میں کیا کروں! کہاں جاؤں! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں
آرہا! پلیز ہیلپ می! میں بہت ہوپ لے کر آئی ہوں آپ کے پاس۔۔۔آپ تو
جادوگر ہیں۔۔۔ایسی کوئی اسکن پرابلم ہو ہی نہیں سکتی جس کا آپ کے پاس کوئی
حل نہ ہو۔۔۔پلیز مجھے مایوس نہ کریں۔۔۔''

اِس درمیان ڈاکٹرظفر کمرے کا چکر لگا کر دوبارہ اپنی کرسی پر آبیٹھا تھا
جیسے ہی لڑکی کی بات ختم ہوئی وہ بولا۔۔۔''او مائی ڈیر! تم نے ٹھیک کہا ایسے کوئی
اسکن پرابلم پیدا نہیں ہوئی جس کا علاج میرے پاس نہ ہو۔۔۔ڈونٹ وری! میں
ہوں نا! کس لیے یہاں بیٹھا ہوں بے بی! آف کورس تمھارے لیے! تم فکر نہ کرو
۔۔۔پلیز مائی بے بی! ریلیکس کرو۔۔۔میں اپنی پوری کوشش کروں گا تمھارے
لیے اِسے ٹھیک کرنے میں'' وہ دونوں ہاتھ نچا نچا کر دھیمی آواز میں پیار بھرے
لہجے میں اُسے تسلی دیتا ہوا بولا۔۔۔''دیکھو میرے پاس ایک بہت ہی قیمتی اور
اسپیشل کریم ہے جو میں کسی کو نہیں دیتا مگر تمھاری خوبصورت آنکھوں میں آنسو نہیں
دیکھ سکتا۔۔۔اِس لیے تمھیں دے رہا ہوں اِس کے ساتھ کچھ اور دوائیاں بھی لکھ
رہا ہوں اوکے!''۔۔۔اور پھر اُس نے وہی دراز کھولی جس میں ابھی ابھی اُس
نے میری لائی ہوئی کریم کو اپنی ٹیوب میں منتقل کیا تھا۔۔۔ساتھ ہی دانوں پر
لگانے والی ایک اور دوا بھی نکالی اور اُن کو احتیاط سے مختلف لفافوں میں ڈال کر
لڑکی کو دیتے ہوئے انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بتانے لگا۔۔۔لڑکی نہایت توجہ
سے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتوں کو سن رہی تھی۔۔۔ڈاکٹرظفر نے اُسے بل کاؤنٹر پر
ادا کرنے کی ہدایت کر کے ۷روز بعد دوبارہ آنے کا کہا۔۔۔لڑکی کے باہر نکلتے ہی
اُس نے کاؤنٹر پر فون کیا اور ۸ہزار کا بل لڑکی سے وصول کرنے کی ہدایت دے کر
کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا اس کی لمبی لمبی گہری سانسوں نے میری روکی
ہوئی ہنسی کو بے لگام کر دیا اور میں زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور میرے قہقہوں
کے ساتھ ساتھ اب اِس میں ڈاکٹرظفر کے قہقہوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔۔۔!

تانپورہ

پطرس بخاری ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے ایک مرتبہ مولانا
ظفرعلی خان صاحب کو تقریر کے لئے بلایا تقریر کی ریکارڈنگ کے بعد
مولانا پطرس کے دفتر میں آکر بیٹھ گئے۔ بات شروع کرنے کی غرض سے
اچانک مولانا نے پوچھا۔ پطرس یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا
ہے۔ پطرس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر بولے۔ مولانا آپ کی عمر کیا ہوگی؟
اس پر مولانا گڑبڑا گئے اور بولے۔ بھئی یہی کوئی پچھتر سال ہوگی۔ پطرس
کہنے لگے۔ مولانا جب آپ نے پچھتر سال یہ فرق جانے بغیر گذار دئے
تو دو چار سال اور گذار لیجئے۔

دائرے کا سفر

محمد عالم اللہ
(دہلی، بھارت)

سورج دن بھر کی تھکن سے چور، دھیرے دھیرے پہاڑیوں کی اوٹ میں آرام کے لیے چلا جا رہا تھا۔ بچے شور مچاتے اچھلتے کودتے ادھر سے ادھر دوڑتے بھاگتے تھے۔ کچھ بچے ندی کے کنارے گول گول پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ اور میں اس ویران سی سڑک پر تن تنہا نکل پڑا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک پل نما بنا تھا، جہاں بہت ہی کم لوگ جاتے تھے۔ مگر خدا جانے کیوں مجھے یہ جگہ بہت اچھی لگتی تھی۔ میرے لیے اس پورے علاقہ میں شاید یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں عجیب قسم کا سکون ملتا تھا۔ میں یہاں آ کر اپنی تنہائی دور کرتا اور اکثر اس منظر میں کھو جاتا۔ اس دن بھی میں وہیں جا رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے، خیالات کی لڑیاں پروتے ہوئے۔

''اگر آپ اجازت دیں، تو میں آپ کی ایک تصویر کھینچنا چاہتا ہوں''۔

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا، اور مجھے بہت غصہ آیا۔ لیکن خدا جانے میں نے کیوں اس سے کچھ کہا نہیں۔ میں نے دیکھا، ایک پرانا سا کیمرا اس کی گردن میں جھول رہا تھا، اس کے بال لمبے لمبے اور بکھرے ہوئے تھے۔ جسمانی استقامت سے وہ نوجوان دِکھتا تھا، لیکن بے ہنگم لباس اور پہاڑی میں اگی ہوئی تراش خراش کو ترستی جھاڑیوں کی طرح بڑھی ہوئی داڑھی اور پھٹی پرانی جینز میں بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ ابھی میں اس کے سراپے کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اس نے اپنی بات دُہرائی۔

''میں آپ کی ایک تصویر کھینچنا چاہ رہا تھا''۔

اس کا لہجہ اور انداز کچھ ایسا تھا کہ میں غصہ ہونے کے باوجود بھی کچھ کہہ نہیں سکا۔ میں نے سوچا کہ اگر پاگل سمجھ کر اس سے الجھا تو اس ویرانے میں جانے کیا کر بیٹھے۔ میں نے کہا، ''ٹھیک ہے، کیوں نہیں! ہم تو فن کے قدر داں ہیں''۔ یہ کہتے ہوئے میں مسکرا دیا تھا۔ اس نے اپنا کیمرا سنبھالا، اور کسی پروفیشنل فوٹو گرافر کی طرح زرا جھک کر بیٹھ گیا۔

''جی سر ذرا مسکرائیے گا''۔

اس کے خشک مگر زندگی سے آراستہ ہونٹوں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، جسے میں ایک تخلیق کار یا دل دادہ تخلیق کار ہونے کے ناتے اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی جینز گرے کلر کی تھی اور اس کے پاس ایک کالے رنگ کا بیگ تھا، جس میں شاید وہ کیمرا رکھتا ہو۔

''جی سر! زرا ادھر دیکھیے گا! جی آگے!''

نہ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا، میں کہیں کھو گیا ہوں۔ یادوں کے دریچے میں یا اس مجذوب صفت شخص کی پراسرار شخصیت میں۔ تالاب میں کنکر پھینکیں تو اس میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور لہریں دور تک دائرہ بناتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ میرے اندر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت برپا تھی۔ میں یادوں کی دنیا میں کہیں دور چلا گیا تھا۔ اس کی بات سے میں چونک اٹھا تھا۔ میں کب مسکرایا، کب اس نے بٹن دبایا اور کب تصویر کیمرے میں قید کر لی، مجھے اندازہ ہی نہ ہوا۔ میں اس سے کچھ بات بھی نہیں کر سکا، وہ کئی قدم آگے نکل چکا تھا۔ اچانک میری زباں سے نکلا، ''سننا''۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''آپ نے مجھے بلایا؟''

''جی'' کہتے ہوئے خود ہی میرے قدم اس کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ میرے چہرے کے تاثر سے شاید اسے خوف آیا ہو یا ممکن ہے وہ میرے بلانے کے انداز سے سہم گیا ہو، بہر حال وہ اپنے لمبے پگ بڑھاتا ہوا میرے قریب آیا۔

''جی''۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، جواب میں وہ بھی مسکرایا۔ میں نے اجنبیت دور کرنے کے لیے کہا۔

''آیئے بیٹھ کر کچھ باتیں کرتے ہیں''۔

وہ مسکرایا اور ہم دونوں قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے پوچھا، ''تم تصویر کشی کیوں کرتے ہو؟''

وہ مسکرا دیا۔ ''بس یونہی پاگل پن سمجھ لیں''۔ اس نے ٹالنے کے انداز میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا!

''اچھا مجھ میں ایسی کیا بات نظر آئی جو تمھیں تصویر اتارنے کا خیال آیا؟''

ابھی وہ میرے سوال کا جواب بھی نہ دے پایا تھا، کہ اسی لمحے دو چھوٹے چھوٹے بچے ادھر سے گزرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک بچی تھی جو اپنے چھوٹے بھائی کو غالباً دوڑا رہی تھی۔ وہ اٹھا اور کھڑا ہو گیا، پھر کہنے لگا۔

''رکو میں زرا ان پھولوں کی تصویریں لے لوں''۔

اور پھر وہ ان بچوں کی تصویریں لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں سوچنے لگا آخر یہ ان تصویروں کا کیا کرتا ہے۔ کیوں وہ دل دادہ ہے، ان تصویروں کا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا، کہ وہ دوبارہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا، ''کتنا اچھا ہوتا ناں، اگر ہم ان تمام لمحوں کو سچ مچ پکڑ لیتے، واقعی اپنی مٹھی کی گرفت میں لے لیتے''۔

میں نے کہا، ''وہی تو کر رہے ہو''۔ تو وہ ہنسنے لگا اور کہا، ''کاش ایسا ہوتا۔ حالاں کہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں کچھ بھی ممکن نہیں مگر وہ بے وقوف ہیں۔ وہ خدا کے بھید کو نہیں جانتے، میں تو صرف اس کے چند لمحوں اور چند عکس ہی قید کر سکتا ہوں، سب کو نہیں''۔

اس دن مجھے اس سے بات کر کے بے حد سکون ملا، میری تنہائی کی ساری دیواریں جیسے ڈھ گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بات کرتا رہے لیکن وقت بہت ہو چلا تھا۔ اس لیے ہمیں واپس اپنے ڈیروں کو لوٹنا پڑا۔

اس دن کے بعد مجھے وہ ہر روز اسی جگہ ملتا۔ جہاں اس دن اس نے میری تصویر اتارنے کی اجازت طلب کی تھی۔ ایسے وہ زیادہ بولتا نہ تھا۔ میں نے اکثر محسوس کیا، وہ بات کرتے کرتے اچانک کہیں کھو جاتا۔ مجھے اس کے اس رویہ سے کبھی کبھی چڑ سی ہو جاتی۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا، کہ میں اس سے جھنجھوڑ کر پوچھوں کہ تم اس قدر خاموش کیوں رہتے ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ کچھ پوچھتے کیوں نہیں؟ میں کون ہوں؟ میں کیا کرتا ہوں؟ کہاں رہتا ہوں؟ مجھے کیا پسند ہے اور میں کیا ناپسند کرتا ہوں؟۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اس کو بے وجہ کی میری باتوں سے تکلیف نہ پہنچ جائے، زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

مگر ایک دن میں نے اس سے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ تمھارا گھر کہاں ہے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ کیا تمھارا کام محض تصویر کشی کرنا ہے یا کچھ اور بھی کرتے ہو؟ مگر اس نے جیسے خاموش رہنے کی قسم کھالی تھی۔ اس دن وہ مجھے یوں دیکھنے لگا، جیسے میں نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اور اس کی ٹیس سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی ہوں۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

پھر اچانک ہی وہ مڑا اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوں بھاگنے لگا۔

مجھے اس کی یہ حرکت عجیب سی لگی مگر اس کی حالت اور رویے کو دیکھ کر میری ہمت نہ ہوئی کہ میں اس سے کچھ کہتا یا روکنے کی کوشش کرتا۔ پتا نہیں مجھے کیا خیال آیا، میں نے اسے اس کی حالت ہی پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ میں اسے آواز بھی نہ دے سکا اور نا ہی وہ پلٹ کر واپس آیا۔ تھوڑی دیر تک میں وہاں کھڑا اسے تکتا رہا، لیکن وہ چلتا ہی چلا گیا اور میری نظروں سے دور ہو گیا۔

اس کے بعد وہ مجھے متعدد بار الگ الگ جگہوں پر مختلف لوگوں کی تصویریں اتارتا ہوا نظر آیا، مگر میں نے اس کی جانب توجہ مرکوز کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اس نے بھی میری جانب کوئی دھیان نہ دیا۔ اس طرح خاصا عرصہ گزر گیا۔ ایک شام میں اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں اس نے میری تصویر کھینچی تھی۔ اس دن موسم میں زرا خنکی تھی، ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ پتھروں پر پڑنے والی بوندا باندی اور ڈوبتے سورج کا منظر کچھ عجیب سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔ میں نے وہیں پتھر پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ یادوں کے دریچے کھلتے جا رہے تھے، میں نہ جانے کن وادیوں کی سیر کر رہا تھا، کہ میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں اسے بھی اپنی یادوں یا خواب کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا۔ کسی کی آواز میرے پیچھے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی نوجوان تھا۔

''کیسے ہیں؟''

''کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

ایک مرتبہ پھر اس نے مجھے اپنے پُراسرار حصار میں جکڑ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے کچھ جواب دیتا وہ خود ہی بولنے لگا۔ ''آپ نے اس دن کے بعد سے میری جانب دوبارہ نہیں دیکھا، خیریت تک پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ خیر کوئی بات نہیں دنیا کا یہی دستور ہے لیکن میں آپ کو یاد کرتا تھا؛ اکثر۔ کیوں؟ مجھے بھی نہیں پتا، لیکن یاد کرتا تھا۔ مجھے آپ سے مل کر اچھا لگا تھا۔ اس دن جب آپ نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تھا، تو مجھے لگا تھا میں آپ سے ساری باتیں بتا دوں مگر پتا نہیں، اس دن میں کیوں چلا گیا تھا۔ آپ کو بتاؤں پتا نہیں کیوں مجھے انسان بھیڑیے دکھتے ہیں۔ مجھے ان سے خوف آتا ہے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تھا، کہ میں کون ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے اور کیا میں محض تصویر کشی کرتا پھرتا ہوں، یا کچھ اور بھی''۔ سبھی تو یہی پوچھتے ہیں، آخر کیوں؟ کیا وہ میرے درد کا مداوا کر دیں گے یا میرے حالات پر بین اور مرثیہ کہیں گے؟''

میں بس اس کا چہرہ دیکھے چلا جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔

''بھائی! معاف کیجیے گا۔ لیکن ہر کوئی مجھ سے یہی پوچھتا ہے۔ کس کس کو بتاؤں؟ کس کس کو اپنا دکھڑا سناؤں؟ اور کیوں سناؤں؟ اپنا مذاق بنوانے کے لیے؟ پھر لوگ مجھ سے پوچھتے ہی کیوں ہیں ایسے سوالات؟ اگر پوچھنا ہی ہے تو یہ کوئی کیوں نہیں پوچھتا کہ میں کیا سوچتا ہوں؟ میرے اندرون کی دنیا میں کون سا طوفان برپا ہے؟ میں کیا چاہتا ہوں؟ کس چیز کا متلاشی ہوں؟ اس کے چہرے میں ایک عجیب قسم کا اضطراب تھا۔ میں جہاں بیٹھا تھا انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ''یہ جگہ میرے لیے بہت دکھ کی جگہ ہے، یہی وہ جگہ ہے، جہاں میں نے اپنی خوشیاں کھوئی ہیں۔ میں یہاں اپنی یادوں کو زندہ کرنے آتا ہوں۔ وہ تلخ یادیں جنھوں نے مجھے پاگل بنا دیا۔ مجھے ہمیشہ ہمیش کے لیے لوٹ لیا''۔ پھر قدرے دھیمی آواز میں، ماحول سے بے گانگی اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔

''کتنی عجیب بات ہے کہ ہم خوشیوں کے لیے مرتے ہیں اور وہ خوشیاں پل بھر میں کافور ہو جاتی ہیں، کیوں نہیں ملتی ازلی خوشی؟ کیا اسی لیے اللہ نے ہم کو پیدا کیا کہ ہم اس کے بھید کو کھوجتے رہیں اور وہ ہمیں آزماتا رہے؟ ہم لوگوں سے محض ایک مسکراہٹ مانگتے ہیں، فوٹو کھینچنے کے لیے، مگر وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، مارتے ہیں''۔

اس کی باتیں مجھے عجیب سی لگیں۔ شاید اس نے محبت میں دھوکا کھایا ہو۔ کسی لڑکی نے دل دکھایا ہوگا۔ کسی نے مارا ہوگا جس سے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہوگا۔

میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے جب اپنے دل کی بھڑاس نکال لی، تو بھی میں اس کے حالات سے بے خبر ہی رہا اور اسے جذباتی نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے، موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اب وہ زرا سنجیدہ ہونے لگا تھا۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے اس سے اس دن کی تصویر کے بارے میں پوچھ لیا۔

''بھئی میری وہ تصویر تو دکھا دو، جو اس دن تم نے کھینچی تھی''۔

''تصویر!؟ کون سی تصویر؟''

وہ انجان بن رہا تھا، حالاں کہ مجھے لگا کہ اسے سب کچھ یاد ہے اور وہ بھولنے کی اداکاری کر رہا ہے۔ میں نے پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی۔ جب اسے لگا کہ میں بھولا نہیں ہوں تو اس نے ٹالنے کے انداز میں مگر

زرا بے زاری سے جواب دیا،’’مل جائے گی، وہ تصویر گھر پر رکھی ہے‘‘۔

’’ٹھیک ہے تو اسی بہانے چلتے ہیں، آپ کا گھر بھی دیکھ لیں گے‘‘۔ میں نے کہا۔

وہ سٹپٹا سا گیا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے کا تاثر کچھ بدل سا گیا تھا۔ میں ضد کرنے لگا تو پتھر پر ٹیک لگاتے ہوئے اٹھا، وہ گھر لے جانے پر راضی ہوگیا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پہاڑوں سے ہوتے ہوئے ایک پگ ڈنڈی کی جانب مڑ گئے۔ پگ ڈنڈی، درختوں اور پتھروں کے درمیان گھٹتی سمٹتی چلی جارہی تھی۔ کم از کم آدھا کلومیٹر کے سفر کے بعد، ہم گلی میں داخل ہوگئے۔ دو تین فرلانگ چلنے کے بعد ایک جگہ رکے۔ نیم کے ایک طویل القامت درخت سے زرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا، جس کی بناوٹ بھی معمولی تھی مگر وہ جھونپڑی سے کچھ بہتر تھا۔ مٹی اور گارے سے چنی ہوئی دیواریں صاف نظر آرہی تھیں۔ چھت پر اوسبیٹس کا شیڈ پڑا تھا۔ گھر کے باہر کچھ گملے رکھے تھے، جن میں پھولوں کے پودے لگے تھے۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ بہت دنوں سے ان میں پانی نہیں ڈالا گیا ہے اور یہ خاموش ذی روح جینے کی تمنا لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مکان کے دروازہ پر بال کی چوٹیوں کی طرح لوہے کی دو کڑیاں لگی ہوئی تھی اور اس پر ایک بڑا سا تالا جڑا تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ تالا کھولا اور وہیں سامنے الگنی پر لٹکا دیا۔ دروازہ کھول کر مجھے بھی اندر آنے کے لیے کہا۔

وہ کمرا کیا تھا، جیسے اس میں انسان نہیں شیاطین رہتے ہوں۔ مجھے خوف آنے لگا۔ بکھرے اور بے ترتیب پڑے سامان، اوبڑ کھابڑ فرش۔ سامنے موجود جھینگے پر ایک لالٹین لٹک رہی تھی اور اس میں سے مری مری پیلی سی روشنی پورے کمرے کو سحر زدہ بنائی ہوئی تھی۔ سامنے ہی ایک بوسیدہ سی میز تھی، جس پر دھول کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پیچھے دو کرسیاں پڑی تھیں، اس پر موجود گرد و غبار سے لگ رہا تھا کہ بہت دنوں سے اس پر کوئی بیٹھا نہیں ہے۔ دائیں جانب کونے میں ایک چوکی پڑی تھی، جس پر بغیر چادر کے ایک گدا بچھا تھا۔ ٹھیک اس کے سرہانے بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کا ایک کولاج تھا، جسے انتہائی سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ کہیں ٹھیرا پانی، بہتی ندیاں، اٹکھیلیاں کرتے بچے، کوڑیاں، رنگ برنگی مچھلیاں اور سیپیاں۔ کہیں لمبے ہوتے سائے، کہیں تیز چلتے پہیے کی رکی ہوئی تصویر، تو کہیں مٹی کے برتنوں کے باترتیب زاویہ دار نقشے تو کہیں گنا پیلتے انسان اور کھیت میں اناج بوتے کسان۔ غرض الگ الگ انداز اور الگ الگ رنگ میں قید لمحے اپنے اپنے انداز میں کہانیاں سنا رہے تھے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے اچانک مجھے اپنی تصویر کا خیال آیا۔ پورے کولاج میں میری تصویر کہیں نہیں تھی میں نے اس سے پوچھا۔

’’میری تصویر کہاں ہے؟‘‘

کہنے لگا،’’تصاویر تو ڈیولپ ہونے کے لیے دی ہیں، ایک دو دن میں آجائیں گی‘‘۔

اس زمانے میں تصویریں ڈیولپ ہونے کے لیے؟ مجھے لگا شاید میں کسی دوسری دنیا میں آگیا ہوں۔ میں نے اس سے کہا۔

’’مگر ابھی دس منٹ پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا، کہ تصاویر گھر پر پڑی ہیں لے لینا‘‘۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ کہنے لگا’’ آپ چائے پئیں گے یا کافی؟ میں ابھی بنا کے لاتا ہوں‘‘۔

مجھے ماحول اب اور زیادہ سحر زدہ لگنے لگا تھا۔ میں اب یہاں سے جلد ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ یوں بھی اس کی باتوں سے مجھے خوف سا آنے لگا تھا۔ میں نے کہا’’ چائے وائے نہیں میں تو تصویر کے لیے آیا تھا۔ آپ کہہ رہے ہیں، وہ ڈیولپ ہونے کے لیے گئی ہیں، تو پھر کبھی سہی اب اجازت دیجئے!‘‘۔

اس کے چہرے کا تاثر کچھ بدل سا گیا تھا۔ سر کو اپنے مخصوص انداز میں جھکاتے ہوئے تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ متفکر مگر پریشان چہرے کے تاثر کو میں اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ وہ بیٹھا تو میں تھوڑی دیر کے لیے اس کا چہرہ ہی دیکھتا رہا۔ مجھے عجیب وغریب وسوسوں اور اندیشوں نے اپنے سایے میں لے لیا تھا مگر وہ بیٹھتے ہی کہنے لگا۔

’’صحیح بات میں آپ کو بتاؤں؟‘‘

اس کی آواز میں کچھ عجیب سی لرزش تھی۔’’میرا کیمرا تو ابھی ویسے کا ویسا ہی بند ہے، میں نے اسے ابھی تک کھولا بھی نہیں ہے، بلکہ شاید اس میں فلم بھی نہیں‘‘۔

چند لمحوں کے لیے میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ غصہ، سادگی، خوف اور اس کے چہرے کے تاثر سے مجھے کچھ کہنا مشکل تھا، لیکن پھر بھی میں نے اسے کہا۔’’ آخر کیا ضرورت تھی یہ سب ڈراما کرنے کی؟ تصویر نہیں دینا تھی تو لاتے ہی نہیں یہاں تک‘‘۔

وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوگیا اور ہولے ہولے اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلنے لگا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ کسی شدید کشمکش میں مبتلا ہے، یا کچھ جادو کرنے والا ہے۔ میں اور ڈر گیا، لیکن مجھے خیال آیا ڈرنا نہیں چاہیے، پھر مجھے کیوں ایسا لگا کہ اگر وجہ بتانے سے بے سبب کی اسے تکلیف ہے، یا یہ نہیں بتانا چاہتا تو مجھے اس کے پیچھے زیادہ نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن فوراً ہی تجسس نے ہم دردی کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پھر اپنا سوال دُہرایا تو وہ پھیکے انداز میں مسکرایا اور پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

’’میرے ابا جی کو فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ انھوں نے میری اور امی کی ڈھیروں تصویریں کھینچی تھیں۔ ایک مرتبہ میں، ابو اور امی اسی پہاڑی مقام پر ٹہلنے آئے تھے۔ ابو تھوڑے تھوڑے مقام پر ٹھیر کر میری اور امی کی تصویر کھینچتے جاتے تھے اور خوب خوش ہوتے تھے‘‘۔

کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔’’وہ جو خطرناک گھاٹی ہے نا، جہاں اب حکومت نے گریل لگا دیے ہیں اور جہاں جانا اب منع ہے، ہم لوگ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ ایک شام ہم تینوں اسی کے کنارے کھڑے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا اور اس کی وجہ سے فضا میں ہلکی ہلکی سیاہی بھی چھائی

ہوئی تھی۔روزانہ کی طرح کیمرا اباجی کی گردن سے لٹکا ہوا تھا۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں اباجی سے ضد کرنے لگا کہ مجھے بھی تصویر کھینچنی ہے! آپ کی اور امی کی فوٹو ساتھ کھینچنی ہے۔انھوں نے مجھے منع کیا۔ مجھ سے بہتیرا کہا آج مطلع صاف نہیں تصویر اچھی نہیں آئے گی مگر میں نے ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔آخر کار تنگ آ کر انھوں نے مجھے کیمرا دے دیا اور کہا دیکھو کیمرے کو زور سے پکڑو، ہلنا نہیں چاہیے۔اور یہ ویو فائنڈر ہے اس سے اپنے سبجیکٹ کو دیکھو اور فوکس سیٹ کر کے (جب سبجیکٹ صاف نظر آنے لگے) بٹن دبا دینا! یہ کہہ کر وہ خود امی کے ساتھ گھاٹی کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کیمرا اٹھایا، اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے گیا اور اباجی کی نقل اتارتے ہوئے کہا ''ریڈی! ذرا مسکرایئے!''۔

وہ لمحہ بھر رکا، اور پھر باتوں کا سرا جوڑا۔''میں نے اچھی طرح دیکھا تھا اباجی اور امی دونوں مسکرا رہے تھے، مگر اچانک ہی دونوں کیمرے کے فوکس سے پراسرار طریقے سے غائب تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے لینز درست کرنے کی کوشش کی مگر حقیقت میں دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ میں گھبرا کر آگے بڑھا، تو میرے جیسے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ جگہ جہاں وہ کھڑے تھے۔ اچانک نیچے گر گئی تھی۔ گہرائی اتنی تھی کہ مجھے آواز تک سنائی نہ دی۔ مجھے اباجی نے یہاں پر ہونے والے ایسے کئی خطرناک حادثوں کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ کیا ہو گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ میں چکرا کر وہیں گر پڑا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ مجھے وہاں کس نے داخل کرایا، مجھے کون اسپتال لے گیا تھا کسی کو نہیں پتا تھا۔ ایک ہفتے بعد میں اسپتال سے گھر لوٹا اور گھر سے پھر اسی جگہ پر آیا، اباجی اور امی کو ڈھونڈتا رہا لیکن وہ نہیں ملے۔ میں سر پٹختا رہا۔خوب رویا مگر نہ اباجی ملے اور نہ امی''۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔ میں نے دیکھا موٹے موٹے آنسو ڈھلک کر اس کے گندے جیکٹ میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔اچانک وہ خاموش ہو گیا جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔اور اب جادوگر کوئی نیا کرشمہ دکھانے والا ہو۔ابھی چند ثانیے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ وہ اٹھا اور میرے قریب آیا، میں مبہوت ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ میرے کندھے کو ہلا کر کہنے لگا۔

''بتاؤ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ! آخر یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی خوشیاں اور پلک جھپکتے ہی غموں کے بادل۔اس ایک مسکراہٹ کے لیے، اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہم یہاں وہاں بھٹکتے ہیں؟ اپنے دل میں کسک لیے چکر لگاتے ہیں۔موقعوں اور رشتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔لیکن اس کے عوض کیا ملتا ہے، دھکے، گالیاں، تھپڑ، اور کوئی ذرا ترس کھایا تو جھوٹی روٹیاں اچھال دیں، میری جانب کہ میں، کوئی دیوانہ، پاگل فقیر ہوں''۔

وہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر گویا ہوا۔''بھیک میں ملی مسکراہٹ نے سوائے نمک پاشی، منہ بسورنے اور پاگل سمجھ کر نظر انداز کرنے، جھڑکیاں اور گالیاں دینے کے مجھے کیا دیا لوگوں نے۔بولو! میں پاگل ہوں؟ نہیں نا! لیکن لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں''۔

اب وہ نڈھال ہو چکا تھا۔الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

اچانک بولتے بولتے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا، دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا، میں نے دیکھا اس کے پاؤں میں نہ جوتا تھا اور نہ ہی کوئی چپل۔ میں نے سوچا منہ دھونے یا فریش ہونے باہر گیا ہوگا، آجائے گا۔ خاصی دیر انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ تھک کر میں دروازے کی کنڈی کھٹکا کر واپس چلا آیا۔اس دن کے بعد سے متعدد بار میں وہاں گیا مگر میری ملاقات اس سے نہ ہوئی۔ایک مرتبہ اس کے گھر بھی گیا مگر وہ وہاں نہ تھا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں واپس اپنے آبائی گھر لوٹ آیا۔ گھنٹے دنوں اور دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔یوں کئی سال گزر گئے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ پکنک پر آیا ہوا تھا۔اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور شام کو میں بیوی کو ہوٹل میں چھوڑ باہر نکل گیا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا مگر وہ گھاٹی اب بھی وہاں پر موجود تھی، ایک دو پولس کے جوان بھی وہاں پر بیٹھے تھے۔ میں نے اسے دیکھا، میں نے اسے پہچان لیا تھا۔اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔کیمرا اس کی گردن میں نہیں تھا۔وہ ایک بچی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بچی بھی تتلی کی طرح کبھی اس ٹیلے سے اس ٹیلے کی جانب دوڑ رہی تھی۔اب وہ بیٹھ گیا تھا اچھلتے کودتے بچی کو دیکھ رہا تھا۔وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ میں نے اسے سلام کیا۔اس نے مجھے دیکھا۔شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک میرے گلے سے لپٹ گیا،''ارے آپ! ہاہا! میں نے آپ کو پہچان لیا۔ بہت دنوں کے بعد نظر آئے۔کہاں چلے گئے تھے، میں نے آپ کو بہت تلاش کیا؟'' وہ ایک سانس میں نہ جانے کتنے سوالات کر گیا تھا۔ میں نے اس سے بتایا،''میری ڈیوٹی بدلنے کی وجہ سے میں میں گاؤں چلا گیا تھا''

''تم سناؤ کیسے ہو؟ یہ شاید تمھاری بچی ہے''؟ میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا''ہاں! یہ میری بچی ہے۔گڑیا رانی!''

مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ پورا منظر میری نظروں کے سامنے پھر گیا۔

وہ مسکرایا۔اور تبھی مجھے اچانک کیمرے کا خیال آیا، میں نے اس سے پوچھا۔

''ارے تمھارا وہ کیمرا کہاں ہے''؟

اس نے ویسے ہی جیسے مجھے فوٹو کھینچنے کے دن گزارش کرتے ہوئے کہا تھا، مسکرا کر کہنے لگا۔

''ہاں وہ کیمرا کسی نے چوری کر لیا۔ اور پھر کیمرے کا کیا، وہ تو خوشیوں کے طلب کرنے کا ایک ذریعہ تھا''۔

اپنی بیٹی کی پیشانی چومتے ہوئے،''اب تو میری خوشی یہ ہے! ہے نا بیٹا''۔

میں نے دیکھا بچی بھی اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جیسے کیمرے کے لینز نے دونوں کے چہروں کو اپنے فوکس میں مکمل لے لیا ہو اور کینوس پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے ہوں۔

پزّا ابوائے

توصیف بریلوی
(علی گڑھ، بھارت)

پزا بوائے نے اپنی بائیک پارکنگ میں کھڑی کی، وارمر (Warmer) سے پزا نکالا اور لفٹ میں سوار ہوگیا۔ اب وہ ایک ڈور بیل بجا رہا تھا، کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا۔ ایک گورا، خوبصورت اور لمبی انگلیوں کے ناخنوں پر نیل پینٹ والا ہاتھ باہر آیا۔ اس نے پزا بوائے کا گریبان پکڑا اور اندر کھینچ لیا، دروازہ بند، دھڑاک......

یہ معاملہ اس ایک دروازے کا نہیں تھا بلکہ بلڈنگ میں جتنے فلیٹ تھے، ان میں سے زیادہ تر کا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی پزا کھاتا ہے اور کوئی......

انڈر گارمینٹس کے اوپر گاؤن پہننے کے بعد ٹینا نے ایک ہزار کا نوٹ پزا بوائے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہر بار اتنے روپئے دوں گی، جس دن کوئی فرینڈ آ گئی تو اس دن ڈبل ملیں گے اور اگر کم لگیں تو بول دینا۔ جب فون کروں گی تب آنا ہوگا اور خالی ہاتھ کبھی نہ آنا پزا ہمیشہ لانا۔ میرا بوائے فرینڈ بننے کی کوشش کبھی مت کرنا، پزا بوائے ہو پزا بوائے ہی رہنا۔ یہ رہا تمہارا پزا کا بل اب تم جا سکتے ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے روپئے اپنی جیب میں رکھے پھر اپنا پی کیپ لگاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ یوں تو بلڈنگ میں کئی پزا بوائے آتے تھے لیکن ٹینا صرف اسی سے خوش تھی کیونکہ وہ کوئی سوال کیے بغیر چپ چاپ اپنا کام کرتا تھا۔ سب آرام سے چل رہا تھا کہ ایک روز...... آج اتنی دیر کیوں لگائی......؟ ٹینا نے سخت آواز میں پوچھا، جی میڈم...... وہ...... ابھی وہ کچھ کہہ پاتا اس سے پہلے ہی ٹینا بول پڑی...... ابے سالے تیرا پزا کھانے کے لیے تجھے نہیں بلاتی ہوں سارا موڈ خراب کر کے رکھ دیا۔ چل جا یہاں سے اب میرا موڈ نہیں ہے، ٹینا نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ ابھی بھی خاموش کھڑا تھا۔ واش روم سے ٹاول لپیٹے ہوئے ٹینا کی فرینڈ رنکی باہر آئی، اب بس بھی کرو ٹینا! تم نے مجھے انوائٹ کیا ہے تو مجھے ہی انجوائے کرنے دو، رنکی نے ٹینا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ہے پزا بوائے! ادھر آؤ کہتے ہوئے رنکی نے وہسکی کا ایک پیگ اس کی طرف بڑھایا۔ میں شراب نہیں پیتا میڈم...... اس نے آہستہ سے کہا۔ دیکھ ہم جیسا کہتے ہیں ویسا کر زیادہ ڈرامہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیکس (Sex) کسی بھی لڑکی کے ساتھ کر لے گا اور شریف بنتا ہے۔ یہاں فری میں مل رہی ہے پی لے ویسے بھی تیرے بجٹ میں یہ نہیں ہوگی کہتے ہوئے رنکی نے ٹینا کی طرف دیکھا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔

طوفان بدتمیزی گزر چکا تھا اور میز پر رکھا ہوا پزا ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ ہر دوسرے چوتھے روز ٹھنڈا پزا ڈسٹ بن (Dust Bin) کی رونق بڑھا رہا تھا اور سلسلہ یوں ہی دراز ہو رہا تھا۔

ڈور بیل بجی، دروازہ کھلا اور پزا بوائے اندر......

ٹینا ٹو پیس میں بیڈ پر پہنچی اور اس کے ہونٹوں کو چوسنا شروع ہی کیا تھا کہ اسے پزا بوائے کے جسم سے تپش محسوس ہوئی۔ پھر اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا...... تیرا بدن تپ رہا ہے اور تو کانپ بھی رہا ہے، تو مجھے بھی بیمار کر دے گا کیا؟ وہ کچھ کہتا کہ ٹینا پھر بولی تیری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیوں آ گیا؟ جی میڈم ہلکا سا بخار ہے...... اگر نہیں آتا تو آپ ناراض ہو جاتیں اور کہیں غصہ میں مجھ سے پزا منگانا بند کر دیتیں...... تو...... اس لیے میں......

چل ٹھیک ہے اب تو کچھ دیر آرام کر لے ٹینا نے اے.سی. بند کرتے ہوئے کہا۔

لیکن میڈم...... وہ...... پزا بوائے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔

تو پریشان نہ ہو تجھے آج کے روپئے بھی ملیں گے۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر قدرے اطمینان دکھائی دینے لگا۔ تو کچھ پئے گا...... وہسکی وغیرہ؟ ٹینا نے مہمان نوازی کے انداز میں پوچھا۔ نہیں میڈم...... میری طبیعت بگڑ جائے گی، اس نے ملتجی ہو کر کہا۔ ٹھیک ہے میں کافی بنا کر لاتی ہوں اس سے تجھے اچھا محسوس ہوگا۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں میڈم، وہ آہستہ سے بولا۔

تکلیف کی کوئی بات نہیں میں اپنے لیے بھی بنا رہی ہوں، کافی پینے کے بعد ٹینا نے اس کے ماتھے پر اپنی خوبصورت اور لمبی انگلیاں رکھ کر یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ درجہ حرارت بڑھا یا کم ہوا۔ مجھے لگتا ہے تجھے اب ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے، کہتے ہوئے ٹینا نے ایک ہزار کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ میڈم یہ تو زیادہ ہیں، اس نے نوٹوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تب بھی تو آیا، اس لیے...... اب جا اور کسی اچھے ڈاکٹر سے دوائی لے۔ دو تین دن میں جب تیرا بخار ٹھیک ہو جائے گا تو مجھے بتا دینا۔

ڈور بیل بجی اور پزا بوائے اندر...... کہاں تھا اتنے دنوں سے؟ تیرا فون بھی آف آ رہا تھا۔ ایک دن تجھے میں نے لفٹ میں اوپر جاتے بھی دیکھا تھا۔ میرے پاس کیوں نہیں آیا، کیا بات ہے؟ ٹینا نے سوالوں کی بوچھار کر دی اور وہ غریب ابھی بھی خاموش تھا۔ وہ...... میڈم بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ روپئے چاہیے، اس نے ہمت کر کے کہا۔

میں نے تو تجھے پہلے ہی دن کہا تھا کہ اگر کم لگیں تو بول دینا، ٹینا نے یاد دلایا۔ جب بغیر مانگے ہی کہیں زیادہ ملے تو...... وہ رخ پھیرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔ اب میں سمجھی...... تو نے دوسری پارٹی دیکھ لی ہے۔ مجھے تجھ سے ہمدردی ہوگئی تھی، لیکن تو بہت پروفیشنل نکلا، اگر تجھے زیادہ روپئے چاہئے تھے...... ویل......! میرا موڈ آف ہو رہا ہے تو جا یہاں سے ٹینا نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے جاتا ہوں آئندہ بغیر کام کے نہ بلانا۔ بھاڑ میں جاؤ تم اب کبھی نہیں بلاؤں گی۔ ٹینا نے غصہ سے چیختے ہوئے کہا۔ لائیے پزا کا بل دیجئے میں جا رہا ہوں۔ وہ جا چکا تھا اور ٹیبل پر رکھا پزا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

کئی دنوں تک ٹینا نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا، ایک دن وہ اسے اپنی ہی بلڈنگ میں پھر نظر آیا اور اس بار ٹینا چپکے چپکے اس کا پیچھا کرنے لگی۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر پزا بوائے کس کے فلیٹ پر جاتا ہے۔ اس کے دل پر گھونسا سا لگا جب اس نے پزا بوائے کو اپنی ماں کے فلیٹ کی ڈور بیل بجاتے ہوئے دیکھا کیونکہ اس کی ماں کو پزا پسند نہیں تھا اس لیے وہ سب سمجھ گئی۔ وہ کاریڈور (Corridor) میں تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی اور پزا بوائے اندر جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ غصہ سے آگ بگولہ ہوگئی اور ڈور بیل کا سوئچ بار بار دبانے لگی اور ساتھ ہی زور زور سے دروازہ بھی تھپ تھپا رہی تھی۔ جب دروازہ کھلا تو ٹینا کی ماں سٹپٹائی ہوئی تھی۔ ٹینا کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے شعلے دیکھ کر پہلے تو گھبرائی لیکن پھر آنکھ ملاتے اور مسکراتے ہوئے بولی، کیوں شور مچا رہی ہو ڈارلنگ؟ ٹینا نے پہلے اپنی ماں کو نیچے سے اوپر تک دیکھا وہ میکسی (Maxi) میں تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہتے ہوئے ٹینا تیز قدموں سے اندر گھس گئی اور اس کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ٹینا سیدھے بیڈروم میں جا گھسی، اس کی ماں نے پہلے تو احتیاطاً فرش پر پڑی ہوئی Lingerie پیر سے ایک طرف کی اور پھر ٹینا کے پیچھے بیڈروم میں جا پہنچی۔

کیا ہوا ٹینا......؟ کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ اس نے پیار سے پوچھا۔

وہ پزا بوائے کہاں ہے؟ میں نے اس کو اندر آتے دیکھا ہے، ٹینا Cupboard کا دروازہ کھول کر بند کرتے ہوئے بولی۔

ک......ک......کون پزا بوائے؟ یہاں کوئی پزا بوائے نہیں ہے، وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

موم آپ جھوٹ بول رہی ہیں، میں نے اس کو اندر آتے ہوئے دیکھا ہے، کہتے ہوئے وہ ماں کو گھور رہی تھی، اور اس کی ماں ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ آخر کار ٹینا نے پزا بوائے کو واش روم سے باہر نکال ہی لیا۔

پزا بوائے کو دیکھ کر ٹینا کی ماں حواس باختہ ہوگئی اور طرح طرح کے Excuse دینے لگی۔ بس کیجیے موم! آپ کو موم کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ آپ رنگ رلیاں منا رہی ہیں، میری موم اتنی Characterless ہوسکتی ہے میں نے سوچا نہیں تھا۔ اب ساری باتیں میرے سامنے شیشے کی طرح صاف ہیں۔ آپ کا وہ رات رات بھر Kitty Party میں رہنا، کھنہ انکل کے گھر اس وقت جانا جبکہ آنٹی گھر پر نہ ہوں، ڈیڈ سے کہہ کر میرے لیے دوسرا فلیٹ خریدنا، آپ نے مجھے اسی لیے الگ کیا تاکہ آپ آرام سے اپنی Lust کا انجوائے کرسکیں......You are a Lusty وہ اب چیخ رہی تھی۔

آپ ڈیڈ کو دھوکا دے رہی ہو...... کہتے ہوئے ٹینا فرش پر ہی بیٹھ گئی اور زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ اس کی سانسوں کی بازگشت سے سینے پر نمودار ہوا Delta اور بھی گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس دوران پزا بوائے وہاں سے کھسک چکا تھا۔

اگر غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہو تو پلیز! میری بات سنو ٹینا......!

مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی ہے، آپ ڈیڈ کو دھوکا دے رہی ہیں، مجھے دھوکا دے رہی ہیں، ٹینا مزید کچھ کہتی اس سے پہلے اس کی ماں سخت ہوتے ہوئے بولی...... دھوکا! کس دھوکے کی بات کر رہی ہو تم؟ دھوکا میں دے رہی ہوں؟ دھوکا تو تمہارے ڈیڈ مجھے دے رہے ہیں، پچھلے سات سال سے آسٹریلیا میں ہیں، کیا ان کے وہ بڑے بڑے پروجیکٹ مجھ سے بھی زیادہ بڑے ہوگئے؟ ذمہ داریوں کے نام پر صرف ڈھیر ساری دولت بھیجتے ہیں خود کیوں نہیں آتے؟ مجھے نہیں چاہیے دولت، نہ ہی فلیٹ، کار اور Status۔ اس سب کے علاوہ بھی انسان کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ کیا تمہارے ڈیڈ نے ان سات سالوں میں میرے بارے میں سوچا......؟

تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہے اتنے سالوں میں انھوں نے صرف دو بار Wedding anniversery wish کی ہے۔ میری اپنی بھی کوئی لائف ہے۔ My darling! there are all naked, you too. مجھے تمہاری عیاشیوں کے بارے میں بھی سب پتہ ہے، ٹینا شوکڈ تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی جو کہ اب مسکرا رہی تھی۔ آگے بولوں یا تم سمجھ گئیں ڈارلنگ......! اس کی ماں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ٹینا کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھی اور وہاں سے چپ چاپ چلی گئی۔

یار ٹینا Try to Understand جب ہم لوگ پزا بوائے کو بلا کر مستی کرسکتے ہیں تو تیری موم کیوں نہیں؟ تو خود سوچ، انکل کب سے گھر نہیں آئے ہیں، آخر آنٹی کو بھی Amusement کا حق ہے۔ Be Practical dear رنکی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اگر تیری موم نے ایسا کچھ کیا ہوتا تب تو سمجھتی......ٹینا آہستہ سے بولی۔

اچھا......! تجھے کیا لگتا ہے میری موم مساج پارلر میں مساج کرانے جاتی ہیں......؟ رنکی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے بولی، لیکن میں ٹینشن نہیں لیتی جو ٹھیک لگتا ہے وہی کرتی ہوں اور دوسروں کی لائف میں Interfere کرنا اپنا کام نہیں۔ مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے......رنکی نے ٹینا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

What do you mean دال میں کالا......؟ ٹینا نے رنکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی، ہاں......وہ مجھے پسند ہے۔ موم کے ساتھ اس کو دیکھ کر میں جل بھن گئی تھی۔

ہم م م م......! تو اب آئی نہ دل کی بات زباں پر رنکی نے ٹینا کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ لیکن میری جان! اس پزا بوائے اور تمہارے Status میں زمین آسمان کا فرق ہے، رنکی کہے جا رہی تھی اور ٹینا کہیں خلاء میں گم تھی۔

رنکی جا چکی تھی اور ٹینا بستر پر دراز ہوگئی، اب اس کا خود سے ہی Question Session شروع ہوگیا۔

کیا واقعی میں ایک پزا بوائے کو چاہنے لگی ہوں؟

نہیں نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اگر یہ سچ نہیں ہے تو میں نے اس کا پیچھا کیوں کیا؟
کیونکہ وہ میری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔
اچھا......! ٹھیک ہے تو موم سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟
ہاں میں اسے چاہنے لگی ہوں، پسند کرتی ہوں اس کو، موم کی وجہ سے اس نے میرے پاس آنا بند کر دیا تھا اور اسی لیے میں...... مجھے کسی کی پرواہ نہیں، وہ میرا ہے، صرف میرا۔
ایک شام ٹینا نے پزا بوائے کو اپنے فلیٹ پر بلایا......’’ تمہاری ڈیمانڈ اتنی بڑھ گئی ہے کہ تم نے مجھے بھلا ہی دیا‘‘ ٹینا نے پزا بوائے کے سینے کے بالوں پر مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ آج میں نے تمہیں بہت خاص بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ کیا بات ہے میڈم......؟ اس نے تجسس سے پوچھا۔
ٹینا نے اس کے گال کو آہستہ سے چومتے ہوئے کہا، اب تمہیں اس طرح کا کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہیں ڈیڈ کی کسی فرم کا منیجر بنوادوں گی اور یہ فلیٹ بھی تمہارے نام کردوں گی۔ تم بس...... بس مجھ سے شادی کرلو۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ اتنا سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا...... یہ نہیں ہوسکتا میڈم......!
کیوں نہیں ہوسکتا......؟ میں تمہیں اتنا کچھ تو دے رہی ہوں اور کیا چاہیے؟
میڈم! یہ سب مجھے نہیں چاہیے، مجھے معاف کیجئے میں آپ سے شادی نہیں کرسکتا۔ ٹینا کی تیوری چڑھ چکی تھی اس نے پزا بوائے کا کالر پکڑتے ہوئے کہا...... سالے، کتے موم کے ساتھ Bed share کرسکتا ہے، مجھ سے شادی نہیں کرسکتا......؟ آخر مجھ میں کمی کیا ہے؟ جوان نہیں ہوں، Slim نہیں ہوں، خوبصورت نہیں ہوں...... بول کیا کمی ہے؟
وہ اپنا کالر چھڑاتے ہوئے سکون سے بولا، میں پیسوں کے لیے کسی بھی عورت کے ساتھ......
لیکن کیوں......؟ جب میں تجھے سب کچھ دینے کو تیار ہوں...... ٹینا کی آواز پھٹ رہی تھی۔ کیونکہ میں شادی شدہ ہوں...... یہ سن کر ٹینا کا دل دھک سے ہوگیا اور وہ روہانسی ہوگئی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی...... تم مجھ سے شادی کرلو میں تمہیں اپنا سارا Account balance دے دوں گی اور مجھے تمہاری شادی سے کوئی پرابلم نہیں۔
آپ سمجھتی کیوں نہیں، میں شادی شدہ ہوں...... میرے بیوی بچے ہیں، اس بار وہ چیخا تھا۔ ٹھیک ہے تجھے ابھی بتاتی ہوں کہتے ہوئے اس نے پھلوں میں رکھا ہوا چاقو اٹھالیا، Don't move ٹینا نے فوراً دروازہ لاک کردیا اور چابی کھڑکی سے نیچے پھینک دی۔ پزا بوائے کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نظر آنے لگے اور وہ گڑگڑانے لگا، میڈم! مجھے جانے دو، گاؤں میں میری بیوی ہے، دو بچے ہیں میرے علاوہ ان کا کوئی نہیں ہے۔

چپ......سؤر کی اولاد آج تجھے مزہ چکھا کر ہی رہوں گی، چل اپنی شرٹ اتار...... جلدی اتار نہیں تو تیرا خون میرے ہی ہاتھوں ہوگا کہتے ہوئے ٹینا اپنے Smart Phone کی اسکرین پر جلدی جلدی انگلی پھیرنے لگی۔
ہاں......تو اب بول کتے میری موم تجھے زیادہ روپئے دیتی تھی، اس لیے تو ان کے پاس جاتا تھا، میں تجھے اور بھی زیادہ دیتی تو ایک بار...... میں تو تجھ پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہوگئی تھی لیکن کتے کو گھی ہضم کہاں ہوتا ہے۔ اب تو دیکھ تیرا تماشہ بننے والا ہے میں نے کمپلین کردی ہے، کچھ ہی دیر میں پولیس پہنچنے والی ہے۔ پزا بوائے کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ ٹینا کی طرف لاچاری سے دیکھتے ہوئے گڑگڑا رہا تھا، پلیز میڈم مجھے جانے دو...... پلیز! جانے دو، اب تو اس نے ہاتھ بھی جوڑ لیے تھے اور بری طرح کانپ رہا تھا۔
ٹینا ہاتھ میں چمچماتا ہوا چاقو لیے کھڑی تھی، اسی چاقو سے اس نے اپنے مختصر لباس کی ایک اسٹیپ بھی کاٹ دی۔ وہ متواتر گڑگڑاتے ہوئے ٹینا سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جیسے ہی ڈور بیل بجی، اچانک اس کے جسم میں بلا کی پھرتی آگئی، وہ کسی بھی طرح بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ کبھی دوڑ کر بڑی سی کھڑکی کی طرف جاتا، تو کبھی واپس آکر ٹینا کے سامنے گڑگڑاتا اور ٹینا تو جیسے پتھر دل ہوچکی تھی۔
ڈور بیل بجنا بند ہوچکی تھی، اب دروازہ توڑے جانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ دروازے سے آنے والی ایک ایک آواز اس کو بے چین کر رہی تھی۔ مانو اس کے دماغ میں Bomb پھوٹ رہے ہوں۔ دھاڑ دھاڑ کی آوازوں سے وہ دہشت زدہ ہوا جاتا تھا اور پورا جسم پسینے سے شرابور تھا، جیسے ہی دروازہ ٹوٹا...... پولیس اندر داخل ہوئی...... اور پزا بوائے کا جسم کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے ہوا میں لہراتا چلا گیا۔ چھلانگ لگانے سے پہلے اس کے علم میں شاید یہ بھی نہیں رہا کہ وہ بلڈنگ کی دسویں منزل پر تھا......

قدیم ترین ہوٹل

جاپان میں نیشیما آنسنسن کیاُنکن حا کواوا، یمنشیشی پریفورور گرم موسم بہار ہوٹل ہے۔ یہ ہوٹل 705 عیسوی میں قائم ہوا۔ یہ جاپان کا سب سے قدیم ہوٹل ہے اور اس ہوٹل کی کمپنی آپریشن میں سب سے پرانی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ 2011 ء میں، ہوٹل کو گنیس ورلڈ ریکارڈز نے دنیا بھر میں اس سب سے قدیم ترین ہوٹل کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔ یہ 1300 سے زائد برسوں کے دوران ایک ہی خاندان کی 52 نسلوں (مسلسل اپنے وارثوں سمیت) انتظامی امور چلا رہی ہیں۔

''اخلاص کی خوشبو''

رضیہ اسماعیل
(بریڈفورد، برطانیہ)

دیواروں پر نقش بناتی رہتی ہوں
خود کو لکھتی اور مٹاتی رہتی ہوں
پلکوں پر خوابوں کی تہیں جم جاتی ہیں
پلکوں سے پھر گرد اُڑاتی رہتی ہوں
یادیں جب بھی بانہیں کھول کے آتی ہیں
یادوں سے میں ہاتھ چھڑاتی رہتی ہوں
روز کا رونا آنکھ کہاں تک دیکھے گی
اشکوں سے اب آنکھ چراتی رہتی ہوں
کہنے کی سو باتیں ہیں پر کیسے کہوں
رستوں کا پھر سوگ مناتی رہتی ہوں
بند گلی میں رستے ڈھونڈتی رہتی ہوں
سوچتی ہوں اور ہونٹ چباتی رہتی ہوں

○

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

اب کسی کا آسرا کوئی نہیں
مجھ میں اب میرے سوا کوئی نہیں
میری حق گوئی کے ہیں سارے مرید
میرا لیکن ہم نوا کوئی نہیں
پُرکشش ہے کس قدر یہ زندگی
اور ایسا خوش ادا کوئی نہیں
جو بھی ہیں دیر و حرم کے پاسباں
رند ہیں سب پارسا کوئی نہیں
ایسے غم سے ملتا ہے دل کو سکوں
جس کی دنیا میں دوا کوئی نہیں
کیا کریں گے زندگی کا احترام
جن میں جینے کی ادا کوئی نہیں
جو کسی دل پر نہیں ڈھائے ستم
آپ میں ایسی ادا کوئی نہیں
سوچتا ہوں آپ کو کیسے کہوں
آپ سا اہلِ جفا کوئی نہیں
جو بھی غم ہیں کیجیے مجھ کو عطا
اور میرا آسرا کوئی نہیں
دل ہوا ہے اُن اداؤں پر نثار
اس میں نظروں کی خطا کوئی نہیں
آپ ہیں جب اس نظر کے روبرو
میں کہوں کیسے خدا کوئی نہیں
آپ کی ہر بات ٹھہری معتبر
اس جہاں میں آپ سا کوئی نہیں
ایسے ہیں کس کو یہ دل سجدہ کرے
رہگذر پر نقشِ پا کوئی نہیں
زندگی میں میں اپنا ہم نوا
اور میرا ہم نوا کوئی نہیں
جس میں کچھ اخلاص کی خوشبو بھی ہو
دور تک ایسی صدا کوئی نہیں
دوسروں کا غم کرے محسوس جو
اس زمانے میں رہا کوئی نہیں
زندگی میں سب کو اپنی فکر ہے
جو کرے سب کا بھلا کوئی نہیں
ہر کسی سے عرش ہوتی ہے خطا
اس جہاں میں بے خطا کوئی نہیں

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

زرد پتے کی طرح شاخ سے جھڑنے والے
ناز کس بات پہ کرتا ہے اکڑنے والے

آج کیوں شرم سے گردن یہ جھکی جاتی ہے
تتلیاں راہ میں ہر شب کو پکڑنے والے

جھوٹ چھپتا نہیں دنیا میں چھپانے سے کبھی
سوچ لے خوب شب و روز کی گھڑنے والے

زخم اتنے دیے تو نے کہ چھپانا مشکل
اے مرے دوست مرے یار بچھڑنے والے

یاد رہ رہ کے مرے گاؤں کی آتی ہے مجھے
ہیں مگر شہر کے حالات جکڑنے والے

○

ثاقب تبسم ثاقب

(علی پور چٹھہ)

مجھے سب سُرخ پھولوں سے سجانے میں لگے ہیں
مرے گھر میں سبھی رونے رُلانے میں لگے ہیں

کسی نے بھی نہیں سمجھی مرے غم کی روانی
یہاں سب اشک اپنے ہی بہانے میں لگے ہیں

زمیں پر اک شجر تن کے کھڑا یوں ہی نہیں ہے
ارے .. کتنے زمانے اس زمانے میں لگے ہیں

شکاری جو دبا ہے پیڑ کے نیچے اچانک
پرندے خوف سے ملبہ ہٹانے میں لگے ہیں

سبھی بچے، جواں، بوڑھے خدا کے بعد قسم سے
مصیبت میں ہمیشہ "ماں" بلانے میں لگے ہیں

اُسی کی اب شباہت کا گماں ہم پر عیاں ہے
جسے ہم ایک مدت سے بھلانے میں لگے ہیں

زمیں پر بھی، فلک پر بھی فسانے ایک سے ہیں
اِدھر اِس کو، اُدھر اُس کو، منانے میں لگے ہیں

کہیں کا اب کہیں وہ جا چکا ہے، بس چکا ہے
ابھی تک ہم اُسے اپنا بنانے میں لگے ہیں

فتح کا بھی یقیں پوری طرح اِن کو نہیں ہے
یہ جو ہارے ہوؤں کو پھر ہرانے میں لگے ہیں

زبانِ غیر ہی ثاقب بچھونا ہے سبھی کا
یہاں بس ایک ہم اُردو سُنانے میں لگے ہیں

○

اسد عباس خان

(جھنگ)

ہجر کو ہجر بناتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہم ترا سوگ مناتے ہیں چلے جاتے ہیں

خود سے ہم بھاگ کے چوپال میں جا بیٹھتے ہیں
داستاں سنتے ہیں سناتے ہیں چلے جاتے ہیں

باندھ لیتے ہیں ترے کون و مکاں چادر میں
پھر وہی بوجھ اٹھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

شب کو ہم خواب میں آتے ہیں کسی کشتی پر
اُس کو پھر ساتھ بٹھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس کی گلی میں جا کر
خود کو آواز لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ہم فقیروں سے ہی سیکھو یہاں دنیا کرنا
اُن کی مرضی سے جو آتے ہیں چلے جاتے ہیں

○

شوق انصاری
(فیصل آباد)

ہماری ذات ہے مہرہ نہیں ہے — کسی کے کھیل کا حصّہ نہیں ہے
یہ کیسا ظلم ہے اہلِ ہنر پر — تماشا عام ہے شہرہ نہیں ہے
بڑے محروم ہیں مفلس کے بچّے — کہ ان کے ہاتھ میں بستہ نہیں ہے
وہاں تک ساتھ وہ دے گا ہمارا — جہاں تک دوسرا رستہ نہیں ہے
نکلتا کیوں بھلا اشکوں میں بہہ کر — یہ ارماں آنکھ کا سرمہ نہیں ہے
ہوس ادراک پر غالب نہ ہو شوقؔ — تو پھر ایمان کو خطرہ نہیں ہے

○

ملک محمد انور
(واہ کینٹ)

عہد حلفاً لیا ہے مجھ سے — بدگماں پھر، رہا ہے مجھ سے
ساتھ کیسے رہے وہ میرے — سوچ جس کی جدا ہے مجھ سے
محض مجھ کو سزا ملی ہے — کیا گنہ بس ہُوا ہے مجھ سے؟
موت کو کیوں پتہ نہیں ہے — کل کسی کا جُڑا ہے مجھ سے
جب سے اُن پہ غزل کہی ہے — چاند تب سے خفا ہے مجھ سے
کاش کہہ دے وہ مجھ سے آ کے — تیر سہواً چلا ہے مجھ سے
دل وکالت کرے اُسی کی — کرگیا جو دغا ہے مجھ سے
اک تعلق بنا جو انورؔ — شہر سارا جلا ہے مجھ سے

○

زیبا سعید
(کراچی)

جس نے پایا ہے زخم کا گہنا — صرف زیبا ہے یہ تری بہنا
دکھ زمانے کے سامنے پا کر — اتنا آساں نہیں غزل کہنا
جب سے ہم عشق میں ہوئے ناکام — کام آنکھوں کا رہ گیا بہنا
ساری دنیا ہے جنگ کی زد میں — کارِ مشکل ہے اب یہاں رہنا
چین سے کون ہے زمانے میں — چاند سورج کا دیکھئے گہنا
تیری یادیں بھی ساتھ ساتھ رہیں — میرا جگ میں ہو! جہاں رہنا
سکھ بہت دور ہم سے ہیں زیباؔ — ہم نے سیکھے ہیں دکھ سدا سہنا

○

شاہین مفتی
(گجرات)

ما بدولت خرید سکتے ہیں
ہر سہولت خرید سکتے ہیں

بیچ سکتے ہیں ساری دنیا کو
اور حکومت خرید سکتے ہیں

تذکرہ جسکا ہے کتابوں میں
ایسی جنت خرید سکتے ہیں

فیصلے کی گھڑی سے کچھ پہلے
ایک مہلت خرید سکتے ہیں

کیا ضرورت ہمیں دلیلوں کی
جب عدالت خرید سکتے ہیں

کاٹ سکتے ہیں تیرے ہاتھوں کو
اپنی قسمت خرید سکتے ہیں

○

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ
(ممبئی، بھارت)

آدمی زندہ ہے لیکن وسوسوں کے درمیاں
ایک شیشہ رہ گیا ہے پتھروں کے درمیاں

سب نے اس منظر کو اپنے طور پر برتا مگر
چاند بے چارہ گھِرا تھا بدلیوں کے درمیاں

کوئی ساعت، کوئی لمحہ، کوئی پل اپنا نہیں
وقت شاید پھنس گیا ہے دشمنوں کے درمیاں

ذہن و دِل جذبات سے مغلوب ہیں کچھ اس طرح
جیسے طوفاں پل رہے ہیں ساحلوں کے درمیاں

زندگی کی ناؤ کو طوفان جب سے لے گئے
ساری موجیں سو رہی ہیں ساحلوں کے درمیاں

نقلی چہرہ اصلی چہرے اغوا کر کے لے گیا
ایک چہرہ گھومتا ہے آئینوں کے درمیاں

آج پھر ماچس کی ڈبیا سازشوں کی زد میں ہے
کانا پھوسی چل رہی تیلوں کے درمیاں

○

ضمیر درویش
(مرادآباد، بھارت)

ٹوٹنے کو تو یہی دل بارہا ٹوٹا بھی ہے،
پھر بھی تُو موجود ہے اس میں ترا جلوہ بھی ہے!

ہو نہیں سکتا کبھی تُو ہم سے بڑھکر دردمند،
درد کو ہم نے بچھایا ہی نہیں اوڑھا بھی ہے!

میرا بچپن کھیلنے آتا ہے اب بھی میرے ساتھ،
کھلکھلا کر ہنستا بھی ہے پھوٹ کر روتا بھی ہے

پھول میں رنگت ہے خوشبو بھی ہے لیکن یارِ من،
تجھ میں تو رنگت بھی ہے خوشبو بھی ہے نشّہ بھی ہے!

شکر ہے وہ بندہء عاصی ہوں مَیں جس سے ترا،
کوئی پردہ بھی نہیں ہے اور بہت پردہ بھی ہے

گاہ تُو وہ اسم جو محسوس ہوتا ہے فقط،
گاہ وہ جسکو ترا درویش چھو سکتا بھی ہے

○

رئیس صدیقی

(بھوپال، بھارت)

ہنس ہنس کے ہر اک غم چھپانے آتے ہیں
حسین شعر ہمیں بھی سجانے آتے ہیں

ہمارے دم سے ہی آباد ہیں گلی کوچے
چھتوں پہ ہم ہی کبوتر اُڑانے آتے ہیں

دریچہ کھول دیا تھا ترے خیالوں کا
ہوا کے جھونکے ابھی تک سہانے آتے ہیں

وصال، ہجر، وفا، فکر، درد، مجبوری
ذرا سی عمر میں کتنے زمانے آتے ہیں!

حسین خوابوں میں ملنے کو پہلے سوتے تھے
کہ اب وہ خواب بھی نیندیں اڑانے آتے ہیں

رئیسؔ، کھڑکیاں ساری نہ کھولیے گھر کی
ہوا کے جھونکے دیئے بھی بجھانے آتے ہیں

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

بارش کے منتظر تھے سمندر کے پاس بھی
دیکھی نہیں تھی روشنی خاور کے پاس بھی

تاثیر موسموں کی مزاجوں پہ چھا گئی
شعلے ملے ہیں پھول سے پیکر کے پاس بھی

وہ بوجھ تھا کہ مجھ سے اٹھایا نہ جا سکا
دستار آئی تو تھی مرے سر کے پاس بھی

کہتے ہیں اُس نگاہ کے ڈھالے ہوئے صنم
یہ طرز بت گری نہیں آذر کے پاس بھی

ٹھہرا ہے کون فوجِ صداقت کے سامنے
رستم بہت تھے ظلم کے لشکر کے پاس بھی

اس شہر کے عجیب ہی رسم و رواج ہیں
روشن دیا نہیں ہے کسی گھر کے پاس بھی

حاصل ہوئی جو ماں کے قدم چوم کر مجھے
دولت کہاں تھی اتنی سکندر کے پاس بھی

دیکھا نہ پھر پلٹ کے گُلوں کی طرف عدیلؔ
نقشِ قدم تمہارے تھے پتھر کے پاس بھی

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور، بھارت)

جب چل پڑیں تو راھگور دیکھتے نہیں
مطلب یہ ہے کہ خوف وخطر دیکھتے نہیں

کچھ لوگ جی رہے ہیں اندھیروں سے بے نیاز
کچھ لوگ زندگی میں سحر رکھتے نہیں

یہ تو نہیں کہ اھل نظر ہی نہیں رہے
پر کیا کریں کہ اھل نظر دیکھتے نہیں

بے حس نہ تھے یہ لوگ کبھی پہلے تو اتنے
لٹتا ہو چاہے پاس کا گھر دیکھتے نہیں

اب کیوں نہ کاٹ ڈالنے اس پیڑ کو شفیق
مدت سے جس پہ کوئی ثمر دیکھتے نہیں

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۸

بہتی ہوئی آنکھوں سے میں نے کرسی سے اٹھ کر دونوں کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا، آپ کو میرے آگے ہاتھ جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ٹھیک جگہ آئے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ دونوں خوشی سے کھڑے ہوگئے اور نیلم نے جذباتی لہجے میں کہا، ہم آپ کے بہت ممنون ہوں گے اور آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ میں نے اسی جذباتی لہجے میں کہا، اس میں نہ ممنون ہونے کی بات ہے اور نہ ہی اس میں کسی احسان کی بات ہے۔ اتنا کافی ہے کہ آپ میری چھوٹی بہن کی سفارش لائے ہیں۔ میرے جواب پر دونوں کی آنکھیں بھر آئیں لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ آپ ابھی چند منٹ کے لیے تشریف رکھیں میں اندر سے ہو کر آتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میں تصویر ہاتھوں میں لئے باہر نکل کر روپا کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو روپا نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر جلدی سے اندر کھینچ کر پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ جیسے مجھے کسی سے چھپانا چاہتی ہو۔ میں نے روپا کو وہ تصویر دکھاتے ہوئے کہا، بھگوان کا بلاوا آیا ہے۔ باہر کچھ لوگ مجھے جوہانس برگ لے جانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

توقع کے برخلاف روپا ہنس کر کہنے لگی، اس کا مطلب ہے بھگوان نے میری سن لی۔ وہ کیسے؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ کہنے لگی، وہ دونوں چیونٹیاں سارے بھون میں تمہاری بُو سونگھتی پھر رہی ہیں۔ کچھ دیر پہلے میرے کمرے میں آئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں، راموجی کہاں ہیں؟ ہم انہیں اپنے سنگ لے جانا چاہتے ہیں۔ روپا نے منہ چڑھاتے ہوئے ان کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب دیا، تم اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟ میں اس کی سیکرٹری تھوڑی ہوں۔ جاؤ کہیں اور سے اس کا پتہ کرو۔ کہنے لگیں وہ کہیں نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا تو وہ یہاں بھی نہیں ہے۔ پھر وہ تمہیں مہمان خانے میں جا کر خود دیکھ آئیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید میں نے ان سے جھوٹ بولا ہے۔ ابھی ایک نوکر نے آ کر تمہارا پوچھا تھا۔ کہنے لگا دربار سنگھ اور اس کی بیٹیاں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کر رہے ہیں۔ ماتا جی نے تمہیں بلوایا تو میں نے کہلوا بھیجا کہ تم کچھ مہمانوں کے ساتھ ہو۔ کچھ دیر پہلے میں دل میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ رام کرے یہ لوگ تمہیں ساتھ لے جائیں تا کہ تمہیں دربار سنگھ کے ساتھ نہ جانا پڑے۔ روپا کو تیار دیکھ کر میں یہاں سے نکلنے میں کسی قسم کی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کہا، اچھا تو پھر یوں کرتے ہیں کہ میں اپنے کمرے میں جا کر چپکے سے اپنا سامان پیک کر کے نکل جاتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تم انہیں جا کر بتا دینا کہ مجھے جلدی میں مہمانوں کے سنگ جوہانس برگ جانا پڑ گیا ہے اور میں پھر وہاں سے ہندوستان واپس چلا جاؤں گا۔ وہ اچھا ٹھیک ہے کا نعرہ لگاتی ہوئی چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے اپنا سامان سمیٹنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ سامان اٹھا کر میں مہمان خانے پہنچ کر اکرام سے بولا چلیں میں تیار ہوں۔

اکرام اور نیلم کو شاید میری طرف سے اتنی آسانی اور اتنی جلدی تیاری کی امید نہیں تھی اس لیے وہ حیران ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی کار ریمیش لاج کے صدر دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا، یہاں سے جوہانس برگ کتنی دُور ہے؟ کہنے لگے، کوئی ڈیڑھ سو میل سے کچھ اوپر کا فاصلہ ہے اور ہمیں وہاں پہنچتے پہنچتے سہ پہر ہو جائے گی۔ اکرام نے نیلم کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا، اگر تم لمبے سفر پر گاڑی چلانے سے نہ کتراتیں تو میں تھکاوٹ کی وجہ سے تمہیں گاڑی چلانے کو کہتا۔ میں نے کہا، اگر آپ چاہیں تو گاڑی میں چلاتا ہوں آپ مجھے راستہ بتاتے جائیں۔ انہوں نے میرا سامان کار کی ڈکی میں رکھتے ہوئے کہا، بھئی یہ تو تمہاری مجھ پر بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے ان کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اکرام میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا، نیلم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور ہم منزل کی جانب روانہ ہوئے۔

دورانِ سفر اکرام نے پوچھا، آپ کو دیکھ کر مجھے آپ کے بارے میں کسی وجہ سے تجسس ہو رہا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے چند ذاتی سوال پوچھوں؟ جی ہاں، ضرور، میں نے جواب دیا۔ آپ کے والد کا نام کیا ہے اور وہ ہندوستان میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا، میرے باپو کا نام شان جی ہے اور وہ ایک سپیرے ہیں۔ اکرام کہنے لگے، میرے پوچھنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہندوستان کے زیادہ تر باشندے گہری رنگت کے ہوتے ہیں اور ان کے بال اور آنکھیں کالی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس آپ کی آنکھیں سبز اور بال بھورے ہیں اور آپ کا رنگ بھی ہلکا ہے۔ میں نے جواب دیا، یہ خدا کی دین ہے۔ میں نے جان کر خدا کی دین کہا تھا اگر میرا مخاطب کوئی ہندو ہوتا تو میں اسے کہتا، یہ بھگوان کی کرپا ہے۔ اکرام بولے وہ تو ٹھیک ہے لیکن شکل وصورت میں والدین کی جینیٹکس کا دخل بھی ہوتا ہے۔ میں نے اکرام سے پوچھا، آپ کی بات بجا ہے لیکن کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے یہ سوال کس لیے پوچھا تھا اور اس سے میرے والدین کی جینیٹکس کا کیا تعلق ہے؟ اکرام نے جواب دیا، یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن اگر آپ سننا پسند کریں تو میں آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ میں نے جواب دیا، میں لمبی کہانی اس لیے بھی سننا چاہوں گا کہ کہانی کے دوران ہمارا لمبا سفر اچھا کٹ جائے گا۔ اکرام نے کہا، دراصل ہمارا ہندوستان میں کوئی قریبی واقف کار نہیں ہے میں اپنی کہانی آپ کو اس امید پر سنا رہا ہوں کہ اگر ہو سکے تو آپ ہندوستان میں اس سلسلے میں میری کچھ مدد بھی کریں۔ اگر میرے بس کا کوئی کام ہوا تو میں ضرور کروں گا، میں نے وعدہ کرتے ہوئے کہا اور ہاں آپ مجھے پھر سے آپ کہنے لگے ہیں، میں نے اکرام سے کہا تو وہ بولا۔ اچھا اب میں محتاط رہوں گا۔

یہ کہتے ہوئے اکرام نے اپنی بات یا کہانی شروع کرتے ہوئے کہا، جیسا کہ میں نے تمہیں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ میرا تعلق آفریدی قبیلے سے ہے۔ میرا والد اپنے قبیلے کا بڑا خان تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ تیئیس چوبیس سال پہلے میرا بڑا بھائی خیبر میڈیکل کالج پشاور سے MBBS کرنے کے بعد FRCS کرنے لندن چلا گیا۔ اگر چہ وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑا تھا اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے کافی قریب تھے۔ لندن میں ہماری چند سال تک خط وکتابت رہی۔ اسے گئے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ اس نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اس نے لندن میں ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے اور یہ کہ میں اس بات کا ذکر ابھی گھر میں کسی اور سے نہ کروں۔ بدقسمتی سے وہ خط میری بجائے آغا جی کے ہاتھ لگا۔ ہم اپنے والد کو آغا جی کہتے تھے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ قبائلی خان کے لیے ایک ہندو بہو سے بڑی گالی کوئی اور نہیں ہوتی۔ خط پڑھ کر آغا جی کو تو جیسے جلال آ گیا اور اس نے ہم سب کو ایک کمرے میں بند کر کے یہ تنبیہہ کی کہ اگر ہم میں سے کسی نے آج کے بعد اُس ناخلف بیٹے کا یا اس کی ہندو بیوی کا اس گھر میں آیا اس گھر کے باہر ذکر کیا اور اُن سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھا تو وہ اُسے گولی مار دے گا۔ پھر انہوں نے انعام کو اپنی جائیداد سے بھی عاق کر دیا ہے۔ آغا جی نے یہاں پر بھی بس نہیں کیا انہوں نے انعام بھائی کو خط لکھا کہ وہ اپنا بدرقا (قبائلی اصطلاح میں بدرقا، خان کے پالتو غنڈے یا باڈی گارڈ کو کہتے ہیں) بھجوا کر اس کو اور اس کی ہندو بیوی کو مروا دے گا۔ انعام میرے بڑے بھائی کا نام تھا اور میں نے اپنے بیٹے کا نام اسی کے نام پر رکھا ہے۔

اکرام نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، وہ انعام کا میرے نام آخری خط تھا۔ میں نے اس کے بعد اسے کئی خطوط لکھے لیکن اس نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ اسے شاید میرے بارے میں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں نے اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے راز کو راز نہ رکھا۔ آغا جی اس واقعہ کے دس سال بعد تک زندہ رہے۔ ان کی زندگی میں گھر کے کسی فرد کو انعام بھائی کا نام تک لینے کی جرأت نہیں ہوئی اور ان کے جیتے جی میں ملک سے باہر بھی نہیں جا سکا۔ ان کی وفات کے بعد میں سپیشلائزیشن کے لیے لندن گیا تو اکرام کو لاپتہ ہوئے کوئی دس بارہ سال گزر چکے تھے۔ میں نے اسے ڈھونڈھنے کی کئی ناکام کوششیں کی۔ جہاں وہ رہتا تھا وہ اور اس کے آس پاس والے گھر توڑ کر ایک بڑی بلڈنگ بنا دی گئی تھی۔ لندن یونیورسٹی سے پتہ چلا کہ FRSC کرنے کے بعد اسے وہیں پر لیکچرار بنا دیا گیا تھا۔ وہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر ہندوستان گیا تھا پھر نہیں لوٹا۔ انہی دنوں ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا اور پاکستان بن گیا۔ چونکہ میرا بھائی پاکستان بننے سے پہلے برطانوی پاسپورٹ پر لندن گیا تھا اس کے لیے اُس کے پاس برطانوی، پاکستانی یا ہندوستانی شہریت حاصل کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آغا جی کا خط اُسے ان دنوں ملا ہو گا۔ وہ اپنے باپ کو جانتا تھا شاید اسی خوف سے اس نے اپنی اور اپنی بیوی کی جان بچانے کی غرض سے لندن چھوڑ کر ہندوستان کی شہریت حاصل کر لی ہو گی۔

میں نے اس کے نام کی کھوج میں ہندوستان کی ہر یونیورسٹی اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ہسپتال اپنے طور پر کھنگال ڈالے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس نے ہندوستان کی شہریت کے ساتھ ساتھ اپنا نام تبدیل کر لیا ہو گا جس کی وجہ سے اس کا سراغ ملنا اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ میرے کچھ جاننے والوں اور دوستوں نے میری اس کھوج میں مدد بھی کی لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ تمہاری طرح میرے بھائی کی آنکھیں سبز اور بال بھورے تھے اسی لیے جب میں نے تمہاری سبز آنکھیں اور بھورے بال دیکھے تو میں نے تمہارے والد کا نام پوچھا تھا۔ اکرام نے اپنی بات کا اختتام کیا تو میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا، آپ کی کہانی دلچسپ ہے لیکن میں ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے میں رہتا ہوں۔ اگر مجھے کبھی کوئی ایسا سراغ ملا تو میں آپ کو ضرور مطلع کروں گا۔ اکرام کی کہانی کے دوران ہمارا سفر واقعی جلدی کٹا۔

سفر کے دوران اکرام مجھے راستہ بتاتے رہے۔ جس وقت ہم ان کے کوٹھی نما گھر کے گیٹ میں داخل ہوئے، اس وقت سہہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی کی آواز سن کر اس گھر میں سب سے پہلے ہمیں دیکھنے والا موتی رام تھا۔ جونہی اس نے مجھے کار سے اترتے دیکھا تو بھاگ کر میرے سامنے بغیر کچھ کہے کورنش بجا لاتے ہوئے تقریباً سجدہ ریز ہو گیا۔ اکرام نے اسے میرا سامان اٹھا کر ایک کمرے میں رکھنے کو کہا۔ شینا سے اس کے والدین نے مجھے اتنا متعارف کرا دیا تھا کہ جب وہ بھاگتی ہوئی والدین کے استقبال کے لیے باہر آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اپنے والدین سے لپٹنے کی بجائے چند لمحوں کے لیے بے یقینی کے عالم میں میرے سامنے مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور وہ بین والا بھیا کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ شینا نے جس یقین اور اعتماد سے مجھے پہچان کر بھیا کہا تھا وہ میرے جذبات کو چھیڑنے کے لیے کافی تھا۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ ردِعمل کے طور پر میں نے اکرام اور نیلم کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے۔

شینا نے ایک اجنبی کا استقبال جس والہانہ انداز میں کیا تھا وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کسی خاص وجہ سے نہ صرف مجھے جانتی ہے بلکہ اچھی طرح سے پہچانتی بھی ہے۔ ورنہ کون سا بچہ اپنے والدین کی موجودگی میں کسی اجنبی سے اس والہانہ انداز سے ملتا ہے۔ اسے اپنی بغل سے چمٹائے میں اکرام کی اردلی میں گھر میں داخل ہوا تو میری نظر ایک سرخ وسفید چہرے والی سفید پوش پتلی اور لمبی قامت کی بزرگ خاتون پر پڑی جو ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور ان کے ہونٹ ذکر میں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے اس خاتون کو میں نے پہلے کبھی اور کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے کب دیکھا ہے؟ مجھے کچھ یاد نہ آ سکا لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے جیون میں ایسی مدبر ہستی اب سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ کسی انجانی مقناطیسی طاقت سے میں سیدھا ان کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی چونکیں اور وہ بھی غیر ارادی طور پر میرا استقبال کرنے کھڑی ہو گئیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ایسے چونکے تھے جیسے ہم

ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے تھے اور اب پہلی نظر دیکھ کر ایک دوسرے کو پہچان لیا ہو۔ پھر ہم دونوں ان دیکھی مقناطیسی قوت سے ایک دوسرے کی جانب کھچنے لگے تھے۔ ان کے قریب جا کر میں نے عقیدت سے دوزانوں بیٹھ کر سلام کیا اور اپنا ماتھا ان کے آگے احتراماً جھکا دیا۔ انہوں نے جواباً میرا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر بے تحاشہ میرا ماتھا چومتے ہوئے پشتو زبان میں کچھ کہا۔ میں ان کی شخصیت کے سحر میں کچھ یوں کھویا کہ مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا۔ پیچھے سے اکرام کی آواز آئی، یہ میری امی ہیں اور تمہیں دعائیں دے رہی ہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انکا نام بنوں بی بی ہے۔ اکرام کی والدہ اپنے پاکیزہ چہرے سے سندر بن کی حقیقی بنوں بی بی معلوم ہو رہی تھیں۔ میرے دل نے کہا کہ بنوں بی بی ہو بہو ایسی ہوگی۔

ان کے پاس ہی صوف پر بیٹھ کر میں نے اکرام سے پوچھا کہ آیا پشتو کے علاوہ ان کی امی کوئی اور زبان سمجھتی یا بولتی ہیں تو اس نے جواب دیا، وہ تھوڑی بہت ہندکو اور اردو سمجھتی ضرور ہیں لیکن بولتی بہت کم ہیں۔ شینا اب بھی میرے پاس کھڑی تھی میں نے اسے اپنے اور بنوں بی بی کے درمیان بٹھا دیا۔ اکرام نے کہا، چلو میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاتا ہوں۔ ہم نے تمہیں شینا کے ساتھ والا کمرہ دیا ہے تاکہ تم بہن بھائی ایک دوسرے کے قریب رہ سکو۔ اکرام کے ساتھ اٹھ کر چل پڑا تو شینا بھی میرے ساتھ چل پڑی۔ جس کمرے میں مجھے رہنا تھا وہاں میرا سامان رکھ دیا گیا تھا۔ روپا کو اپنی پہنچ کی اطلاع دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے اکرام سے پوچھ کر کمبرلی کے لیے کال بک کروائی۔ دوسری جانب روپا کی بجائے اس کی ماتا جی نے فون اٹھایا تھا۔ میں نے انہیں اپنی جوہانس برگ میں باخیریت پہنچ کی اطلاع دی تو وہ کہنے لگیں دربار جی تمہیں اپنے ہاں کچھ دنوں کے لیے مہمان کے طور پر لے جانا چاہتے تھے۔ جب ہم نے انہیں بتایا کہ تم جوہانس برگ جا چکے ہو تو انہیں مایوسی ہوئی۔ میں نے کہا اگر جیون نے وفا کی تو پھر کبھی اُن کے ہاں جا کر رہوں گا۔ پھر میں نے انہیں اس آس پر اپنا جوہانس برگ کا فون نمبر لکھوایا کہ شاید روپا مجھے کال کرے۔ انہیں روپا سے فون پر بات کروانے کو نہیں کہا اور سب کی خیریت معلوم کر کے فون رکھ دیا۔

کچھ دیر اپنے کمرے میں رہا۔ غسل خانے میں گھس کر نہا کر تازہ دم ہو کر باہر نکلا تو شینا کمرے میں بیٹھی تھی۔ شینا کا کمرہ بھی دیکھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے شینا سے کہا، چلو مجھے اپنا کمرہ دکھاؤ۔ اس کا کمرہ جانوروں کے ایک چھوٹے سے عجائب گھر سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ وہاں انواع واقسام کے جانوروں کے خشک اور کلوروفارم کی بوتلوں میں محفوظ ممیاں رکھی تھیں۔ میں نے شینا سے کہا کہ وہ مجھے اپنے جانوروں کے مجموعے سے متعارف کرائے تو وہ بڑی خوشی سے اس پر تیار ہوگئی۔ نیلم نے سچ کہا تھا کہ شینا جانوروں سے بڑی محبت کرتی ہے اور اسی محبت کی وجہ سے اس کا کمرہ جانوروں کا عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں ایک کونے سے اپنے مجموعے کا تعارف کراتی ہوئی مجھے دوسرے کونے تک لے گئی۔ اس کا جانوروں سے متعلق تعارف اتنا مکمل اور فصیح ہوتا تھا کہ مجھے ایک بارہ سالہ بچی کے جانوروں کے علم پر حیرت ہو رہی تھی۔ اسے یہ تک معلوم تھا کہ کون سا جانور اس نے کب اور کہاں سے حاصل کیا ہے۔ تعارف کے دوران وہ ایک جار کے پاس رکی۔ جار میں ایک عجیب الخلقت سنپولیا تھا۔ جس کے دو منہ دو دُمیں اور ایک جسم تھا۔ اس کا ایک منہ کھلا تھا اور دوسرا منہ بند تھا۔ شینا بتانے لگی یہ منہ کالا سنپولیا ہے۔ یہ مجھے اپنے پرانے گھر میں زندہ ملا تھا اور میرے ابو امی نے اسے کلوروفارم میں محفوظ کرنے میں میری مدد کی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے اور بھی بہت کچھ دکھاتی رہی۔ ابھی ہم دونوں نے اس کے کمرے کے تمام جانور پوری طرح نہیں دیکھے تھے کہ نیلم کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگی، عشائیہ تیار ہے تم لوگ آ کر پہلے کچھ کھا لو پھر جو جی چاہے کرتے رہنا۔

پھر میری جانب دیکھ کر بولی، ہم شینا کی وجہ سے کھانا جلدی کھا لیتے ہیں۔ کھانے کے دوران ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ کھا کھانے کے بعد نیلم نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں چائے پینا پسند کروں گا یا نہیں۔ میں نے کہا، کیوں نہیں میں ہر کھانے کے بعد چائے ہاضموم کے طور پر پیتا ہوں۔ انہوں نے چائے تیار کر کے مجھے پلائی۔ میری زندگی کی یہ پہلی پشاوری چائے تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے اصل چائے تو یہ ہے اور اب تک میں ہندوستان میں کچھ اور پیتا رہا ہوں۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے لیکن میں نے حسبِ عادت میٹھا کھانے سے پرہیز کیا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ نیلم نے شینا کو نہا کر اپنے کمرے میں جانے کا حکم دیا تو میں نے نیلم سے کہا میں آج کی رات شینا کے کمرے میں گزار کر اس کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں۔ نیلم نے میرے لیے وہاں بستر لگانے کو کہا تو میں نے انہیں منع کرتے ہوئے بتایا کہ میں وہاں رات بھر جاگتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں شینا کے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھوں گا۔ شینا نہانے چلی گئی تو میں بھی اپنے کمرے میں بین لینے گیا۔ کمرے سے واپسی پر میرے ہاتھوں میں بین دیکھ کر نیلم بولی، ہماری شینا نے تمہیں بین والا بھائی غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا، جی ہاں اسی وجہ سے تو میں بلا جھجک آپ کے ساتھ چلا آیا ہوں۔ نیلم بولی، اچھا تو ہمیں بھی اپنی بین سناؤ۔ میں نے جواب دیا، آج رات آپ شاید شینا کے کمرے سے میری بین کی آواز سنیں گے۔ شینا سونے کی تیاری مکمل کر کے آئی تو سورج اپنی آخری کرنیں سمیٹ رہا تھا۔ ہم دونوں گھر والوں کو شب بخیر کہتے ہوئے شینا کے کمرے میں چلے گئے۔ اسے بستر پر لٹا کر میں نے کہا، اچھا اب تم آنکھیں بند کر کے سو جاؤ میں تمہارے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھوں گا۔ وہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

کچھ دیر بعد شینا کے بستر پر چرچراہٹ ہوئی۔ دیکھا تو شینا کی چند لمحوں پہلے والی شریر آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں شناسائی کی بجائے اجنبیت تھی اور اس کا جسم کسی لکڑی کی مانند اکڑ چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور شینا کا جسم اب کسی ان دیکھی قوت کے زیرِ دام یا زیرِ حراست آ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا جس کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچا۔ میں نے شینا سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے مجھے گھورنا شروع کیا۔ پھر اس کی ہلکی سے آواز آئی، مجھے

آزادی دو، مجھے جانے دو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہونٹ اگرچہ شینا کے ہلے تھے لیکن آواز اس کی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا، کہاں سے آزادی دوں اور کہاں جانے دوں۔ لیکن ان بے معنی اور مبہم جملوں کے علاوہ شینا نے کوئی آواز نہیں نکالی۔

سوچنے لگا کہ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ میں اس گھر میں کیوں لایا گیا ہوں اور شینا کے کمرے میں میرا کیا کردار ہوگا۔ بقول شینا کے یا اس کے جسم میں داخل روح کے میں کسے آزادی دوں اور کسے کہاں جانے دوں؟ یہ تو معلوم تھا کہ دیوتا مجھے اس گھر میں لانا چاہتے تھے جیسے وہ مجھے پرکاش بھون لے گئے تھے۔ لگتا تھا بنوں بی بی، مناسہ دیوی اور ناگ دیوتا کسی انجانی وجہ سے سانپ زدہ لوگوں سے مجھے متعارف کروانا چاہتے تھے۔ کس لیے؟ یہ سوال جتنا آسان تھا، اس کا جواب اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا۔

میری سوچ کا دائرہ کچھ وسیع ہوا تو میں سوچنے لگا کہ مجھے افریقہ بلانے کی تحریک شروع کرنے والی رمپا رانی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے بلا کر وہ خود اٹھ جائے گی۔ اگر رمپا رانی مجھے یہاں نہ بلاتی تو تلک رام نہ جانے کب تک میری راہ دیکھتا رہتا۔ اور نہ جانے یہ پٹھان خاندان کب تک اپنی بیٹی کو سورج ڈھلنے کے بعد اپنے کمرے میں نظر بند کرتا رہتا۔ کیا یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں؟ کس سلسلے کی؟ دیوتاؤں نے رمپا کو بھی اس سلسلے میں استعمال کرنے کے بعد اٹھا لیا۔ تو اور کیا! دیوتاؤں نے رمپا رانی کو استعمال کر کے تلک رام اور شینا کے لیے مجھے افریقہ بلایا ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تلک رام اور شینا کے لیے آخر مجھے ہی کیوں گھسیٹا ہے؟ کسی اور سے یہ کام کیوں نہیں لیا گیا؟ ابھی تک میرے سامنے ان تمام سوالات کا جواب ایک پُراسرار خاموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک سوچوں کے اس بھنور میں بے بسی کے عالم میں ایک بے حس وحرکت معصوم بچی کو کسی لکڑی کی طرح اکڑے سوتا دیکھ کر سوچا کہ اب میں اس کے لیے کیا کروں۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں کرسی پر بیٹھ کر ہلکے سُروں سے بین بجانے لگا۔ بین بجتی رہی اور نہ جانے کب تک بجتی رہی۔ بین بجنے کے دوران ہی ایک زوردار چھناکا ہوا، میں نے ردِعمل کے طور پر اپنی آنکھیں کھولیں تو سامنے شیلف پر پڑا شیشے کا ایک جار ٹوٹ چکا تھا اور اس سے کلوروفارم کی بو کمرے میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ چھناکے کی آواز سن کر دروازے کے باہر کھسر پھسر کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ جیسے باہر والے کمرے میں آنے یا نہ آنے کے بارے میں متزلزل سی کیفیت میں ہوں۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو نیلم اور اکرام دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔ انہیں اندر آنے کا کہہ کر میں نے شینا کی جانب توجہ دی تو مجھے ایسے لگا جیسے وہ اب واقعی سو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اب بند تھیں اور اس کے چہرے کی کرختگی اور جسم کی اکڑاہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے ٹوٹنے والے جار کی جانب دیکھا تو حیران رہ گیا کہ ٹوٹنے والا جار اس عجیب الخلقت منہ کالے سنپولیے کا تھا جو کل شینا نے مجھے دکھایا اور متعارف کرایا تھا۔ روح کے زیرِ اثر شینا نے مجھے دو مبہم جملے کہے تھے۔ مجھے آزادی دو، مجھے جانے دو۔ یہ جملے اب میری سمجھ میں آنے لگے تھے۔ میں نے حیران اور پریشان کھڑے ہوئے اکرام سے پوچھا، کیا آپ کے ہاں لکڑی کی آگ والا کوئی چولہا ہے؟ ہے تو، پر کیوں؟ نیلم نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ پہلے آپ چولہا جلائیں اور مجھے وہاں لے چلیں بعد میں سب کچھ بتاؤں گا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے جار سے دوسروں والے منہ کالے سنپولیے کا مردہ جسم اٹھاتے ہوئے کہا۔ اکرام اور نیلم میرے آگے آگے چل کر مجھے گھر کے پچھلے حصے میں لے گئے جہاں ایک چھوٹا سا تندور بنا ہوا تھا۔ انہوں نے مٹی کا تیل ڈال کر تندور میں پڑی ہوئی ادھ جلی لکڑیوں کو آگ لگا دی اور میں نے سنپولیا اس آگ میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ جل کر پہلے کوئلہ اور پھر راکھ بن گیا۔ انہیں آگ بجھانے کا کہہ کر میں شینا کے کمرے میں واپس آیا تو وہ سکون کے عالم میں ابھی تک سوئی ہوئی تھی اور میں مسکراتا ہوا اس کے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے لٹکا ہوا گھڑیال اس وقت رات کے ایک بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی اور اتنے غیر متوقع انداز میں ہوا تھا کہ میں خود بھی حیران تھا۔ اکرام اور نیلم تندور کی آگ بجھا کر میرے سامنے والے صوفے پر کچھ کہے بنا میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا، اس سے پہلے کہ آپ کچھ سوال پوچھیں میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ شینا دو سال بعد آج پہلی بار فطری نیند سو رہی ہے اور انشاءاللہ آج کے بعد بھی وہ ہر رات اپنی نیند سوئے گی۔ آپ تسلی کے طور پر اسے جا کر دیکھ آئیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو شینا کو جگا کر بھی دیکھ لیں اور ہاں اس کے کمرے کا دروازہ ابھی کچھ دیر کے لیے کھلا رہنے دیں تاکہ کلوروفارم کی بو نکل جائے اور کانچ کے ٹوٹے ٹکڑے سمیٹ لیں تاکہ کسی چلنے والے کو نہ چبھیں۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ کر شینا کے کمرے میں گئے۔ کچھ دیر بعد واپسی پر ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اکرام بولا، تمہاری بات درست ہے۔ شینا سکون سے سو رہی ہے۔ میں نے ان کی مسکراہٹ میں شامل ہوتے ہوئے کہا، میری معلومات کے مطابق اسلامی تعلیمات کی رو سے مرنے کے بعد دوسری دنیا میں نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ابھی میں آپ سے جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق مرنے کے بعد اسی دنیا میں نئی زندگی شروع کرنے سے ہے جو شاید آپ کے مذہبی میلان پر پورا نہ اترے۔ میں آپ کے عقیدے کی تردید نہیں کر رہا ہوں میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ چند لمحوں کے لیے اپنے عقیدے کو ایک جانب رکھ کر میری بات توجہ سے سنیں اور اُسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کو نہ صرف میری بات سمجھ آئے گی بلکہ آپ کے لیے شینا پر پچھلے دو سالوں سے نازل مصیبت کی تہہ تک پہنچنے میں بھی آسانی ہوگی۔

دونوں میری جانب ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھے تو میں نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا، ہندو دھرم کے مطابق آتمائیں یعنی روحیں مرنے کے بعد اس دنیا میں دوسرا جنم لینے کے لیے آکاش پر جاتی ہیں۔ لیکن وہ اس وقت تک آکاش پر نہیں جا سکتیں یا دوسرا جنم نہیں لیتیں جب تک ان کے پچھلے جنم والا جسم خاک یا راکھ

نہیں ہو جاتا۔اسی وجہ سے ہندودھرم میں مردے کو جلد جلا دیا جاتا ہے تا کہ اس کی روح کو نئے جنم کے لیے آکاش پر جانے میں آسانی ہو۔ایسی روحیں جن کا جسم مرنے کے بعد باقی رہتا ہے وہ اس دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں اور دوسرا جنم نہیں لے سکتیں بدروحیں کہلاتی ہیں۔خصوصاً ایسی روحیں جن کی موت فطری یا طبی نہ ہوئی ہو۔شینا نے کل مجھے اپنے جانوروں کے عجائبات دکھاتے ہوئے ایک جار میں مبہوت دوسَروں والے منہ کالے سنپولیے کے متعلق بتایا تھا کہ اسے وہ اپنے پرانے گھر میں زندہ ملا تھا اور اس نے آپ کی مدد سے اُسے کلوروفارم میں محفوظ کیا تھا۔ دونوں نے میری بات کی تصدیق میں اپنے سر ہلائے تو میں نے کہا، دوسَروں کی وجہ سے یہ سنپولیا آپ کے لیے ایک عجوبہ تھا چنانچہ آپ نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی آتما پچھلے دوسال سے بھٹک رہی تھی۔سنپولیے کی آتما کو اپنا جسم نظر آتا تھا لیکن وہ اپنے جسم میں جانے کے قابل نہیں تھی۔چونکہ اس کا بدن یہاں تھا اس لیے روح اپنے بدن کے گرد دن بھر منڈلاتی رہتی تھی اور رات کے وقت اپنے بدن کے قریب بسر کرنے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ اس کمرے کے مکین کے بدن میں داخل ہو جائے۔مجھے بھی اس بات کا اندازہ نہ تھا اگر میری بین بجانے کے دوران وہ جار نہ ٹوٹتا۔بین کی لے سے سنپولیے کی روح شینا کے جسم سے نکلی تو اس نے میری توجہ اپنے جسم والے جار کو توڑ کر کرائی۔شینا کے جسم میں بدروح نے مجھ سے کہا تھا ''مجھے آزادی دو، مجھے جانے دو۔'' دوسرے الفاظ میں بدروح مجھے بتا رہی تھی کہ میں اس جسم کی وجہ سے ابھی تک اس دھرتی پر بھٹک رہی ہوں۔

آپ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ شینا پر اس قسم کے دورے صرف گھر میں ہی پڑتے ہیں باہر نہیں پڑتے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سنپولیے کی روح اپنے جسم کے پاس منڈلاتی رہتی تھی۔گھر آتے ہی شینا اس روح کے قبضے میں آجاتی تھی۔ آپ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ شینا کو چاند کی چودھویں رات کو دورہ نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے کہ ہندودھرم کے مطابق پورن ماشی کی رات کو اس سنسار کی ساری بدروحیں ایک جگہ جمع ہو کر بھگوان سے ان پر دوسرا جنم لینے کی مشکل آسان کرنے کی پرارتھنا کرتی ہیں۔اب اس سنپولیے کا جسم تندور میں جل کر آپ کے سامنے راکھ ہو چکا ہے اور اس کی روح اپنے جار کے اردگرد پھرنے کی بجائے آکاش پر جا کر دوسرے جنم کی تیاری کر رہی ہوگی۔

میری بات کے اختتام پر دونوں کے منہ حیرت سے کھلے تھے اور وہ میری باتیں کچھ اتنی توجہ سے سن رہے تھے جیسے بچے سونے سے پہلے اپنی پسند کی کہانی سن رہے ہوں۔نیلم کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی اگر یہ واقعہ ہمارے اپنے گھر پیش نہ آیا ہوتا اور اگر میں اس کی عینی شاہد نہ ہوتی اور اگر میری بچی اس واقعے کا ایک حصہ نہ ہوتی تو میں تمہاری بات پر کبھی یقین نہ کرتی۔ایسے میں شینا اپنے کمرے سے نکل کر ماں کے پاس آ کر بولی، امی مجھے پیاس لگی ہے۔نیلم تو جیسے صدقے قربان ہوتے ہوئے اٹھی اور شینا کو پانی دیا اور اسے اپنے کمرے میں بستر پر لٹانے کے بعد واپس آ کر میرے سامنے بیٹھتی ہوئی جذباتی لہجے میں بولی، میری بیٹی نے دوسال میں آج پہلی بار رات کے وقت اٹھ کر مجھ سے کچھ مانگا ہے۔اکرام خود کو سنبھالتے ہوئے بولا، میرا ذہن ابھی تک تمہارے بتائے ہوئے سچ کو ہضم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنا آگے بڑھنے کے باوجود عقائد کی دنیا میں کتنے پیچھے ہیں۔اگر ہمیں یہ بات شینا کے پہلے دورے کے روز معلوم ہو گئی ہوتی تو۔۔۔میں نے ان کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔۔۔تو ہم متعارف نہ ہوتے، میں پشاوری چائے کبھی نہ پی پاتا، اتنے اچھے لوگوں سے نہ مل پاتا اور آپ کی امی کو کبھی نہ دیکھ پاتا۔اس پر دونوں ہنس پڑے۔ کہنے لگے، ہاں یہ بات تو ہے۔قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔میں نے کہا، اچھا رات کافی گزر چکی ہے، اب آپ لوگ جا کر آرام کریں۔ میرا خیال ہے آج کی رات آپ اپنی دوسالہ قضا نیندیں پوری کریں گے۔دونوں اٹھتے ہوئے بولے، ہاں یہ بات تو سچ ہے۔ویسے بھی ہمیں کل صبح کام پر نہیں جانا ہے اس لیے ہمیں اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں ہوگی۔ان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا پھر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

دوسری صبح میری آنکھ حسب عادت جلدی کھل گئی۔تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو گھر میں ابھی سنّاٹا تھا شاید سب لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔باہر صرف بنوں بی بی مصلے پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔انہوں نے ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور ایک بار پھر قرآن پاک پڑھنے لگیں اور میں قریب بیٹھا انہیں پڑھتے دیکھتا رہا۔سورج نکلا تو انہوں نے قرآن مجید ٹھپ (بند) کرنے کے بعد ایک سجدہ کیا اور سجدے سے اٹھ کر میرے چہرے پر پھونکا۔پھر جائے نماز تہہ کر کے ایک جانب رکھی تو میں نے ان سے پوچھا، کیا آپ کو اردو آتی ہے؟ انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، توڑا توڑا (تھوڑا تھوڑا) ۔نہ جانے کیوں میں ان سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔آج مجھے اندازہ ہوا کہ پانچ چھ زبانیں جاننے کے باوجود میں بنوں بی بی سے بات نہیں کر سکتا۔اس روز میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں پشتو زبان سیکھ کر بنوں بی بی سے بہت سی باتیں کروں گا۔ایسے میں شینا جاگ گئی اور میرے پاس کھڑی ہو کر کہنے لگی، بھیا آپ بین بہت اچھی بجاتے ہیں۔تمہارے لیے تو بجاتا ہوں، جواب دے کر میں نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔پھر شینا کا چھوٹا بھائی انعام اپنے کمرے سے باہر نکلا لیکن وہ میرے قریب نہیں آیا۔بس مجھے دور سے دیکھتا رہا۔میں نے بھی اسے زیادہ چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ایسے میں اکرام اور نیلم بھی جاگ گئے۔آج ان کے چہرے شگفتہ لگ رہے تھے جیسے وہ رات کو گہری نیند سوئے ہوں۔

نوکر نے ناشتہ تیار کر کے لگایا۔ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔جن میں میری تعلیم کے علاوہ میرے علاقے کے حالات شامل تھے۔انہوں نے بھی اپنے علاقے کی تہذیب سے میری شناسائی کروائی۔میں نے پشتو سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے اس مقصد کے لیے چند کتابیں دینے کا وعدہ کیا۔ناشتے کے بعد میں نے اکرام سے کہا، میں کسی قریبی انڈین

ائرلائن کے دفتر جا کر اپنی ہندوستان واپسی کا ٹکٹ بنوانا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے گرمیوں کی چھٹیاں ہیں اور اگر وہاں پر کوئی ضروری کام نہیں ہے تو چھٹیوں کے باقی دن یہاں رک جاؤ ہم تمہیں پشتو سکھا کے واپس ہندوستان بھیجیں گے۔ میں نے کہا، اچھا تو پھر اگر آپ اجازت دیں تو میں کلکتہ کے لیے ایک اورسیز کال کر کے اپنے گھر والوں کو مطلع کر دوں۔ انہوں نے کہا، اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے جہاں جی چاہے اور جب چاہے کال بک کرواؤ اور بات کرو۔

میں نے اسی وقت کلکتہ کے لیے کال بک کروادی۔ چند گھنٹوں بعد کال پر دوسری طرف نیتو کی آواز سن کر میں نے پوچھا، تمہیں تو قاہرہ میں ہونا چاہیے تھا؟ وہ بھی میری آواز پہچان کر بولی، شکر ہے تم قاہرہ نہیں آئے۔ ہم تیسرے روز ہی وہاں سے انڈیا واپس آ گئے تھے۔ پھر بولی، مجھے جمال کے ذریعے تمہارا پیغام ملا تھا اس لیے میں مطمئن تھی کہ تمہیں خواہ مخواہ مصر کا پھیرا نہیں لگانا پڑے گا۔ پھر رمپا کی اچانک موت کی بات نکلی تو میں نے کہا، رمپا جی کے بے وقت چلے جانے سے سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے ان کے ہاں سانپوں کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ دوسری باتوں کے درمیان وہ بولی، ارے ہاں مجھے یاد آیا، کل ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر سمتھ کا فون آیا تھا۔ ان کے بھائی لندن سے کچھ دنوں کے لیے انڈیا آئے ہوئے ہیں اور وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ تم جنوبی افریقہ میں ہو تو وہ کہنے لگے کہ اگر تم سے بات ہو تو تمہیں ان کا پیغام دے دوں۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تم کب آ رہے ہو تا کہ میں انہیں فون کر کے بتا دوں؟ میں نے کہا، اس پیغام کے بعد تو جتنی جلدی ہو سکا میں آنے کی کوشش کروں گا۔ اور جونہی ٹکٹ کنفرم ہو گی تمہیں فون کر کے اطلاع دے دوں گا۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ باپو کیسے ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں اور اس وقت میرے پاس ہی کھڑے ہیں اور وہ بھی تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نیتو نے فون باپو کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

دوسری جانب باپو نے چھوٹتے ہی کہا، میں نے تیری سگائی کر دی ہے رے۔ باپو کی بات پر میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا، کب، کس سے اور کہاں باپو؟ پچھلے دن میں نے بٹیا اور وکرم بابو سے نیتو کو تیرے لیے مانگا ہے۔ انہوں نے ہاں کر دی ہے۔ تم یہاں آ ؤ گے تو سگائی کی باقاعدہ تاریخ مقرر کریں گے۔ میں نے پوچھا، کہ آپ نے نیتو سے پوچھا ہے؟ وہ میرے پاس ہی کھڑی ہے، تو خود ہی اس سے پوچھ لے۔ میرا جواب سنے بنا انہوں نے نیتو کو فون دیتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف سے نیتو کی کانپتی ہوئی آواز آئی، میں نے تو ہاں کر دی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہیں یہ سگائی منظور ہے یا نہیں؟ ایک نہیں ایک کروڑ بار منظور ہے، میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ نیتو جی، میرے لیے اس سے بڑھ کر بھاگیہ بات اور کیا ہو گی کہ میں اپنا باقی جیون تمہاری زلفوں کے سائے میں گزاروں۔ دوسری جانب خاموشی رہی۔ میں نے کہا، ہیلو تم میری آواز سن رہی ہو؟ لیکن دوسری جانب کافی دیر تک خاموشی رہی تو میں ڈرا کہ کہیں نیتو نے فون رکھ نہ دیا ہو۔ اس لیے میں نے بار بار ہیلو، ہیلو کہنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے نیتو کی بھرائی ہوئی جذباتی آواز آئی، مجھ سے فون پر بات نہیں ہوتی، بس تم جلدی سے گھر آ جاؤ، یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

فون رکھا تو جذبات سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ جس بات کو کہنے کی سکت مجھ میں نہیں تھی وہ باپو نے کہہ کر میری مشکل آسان کر دی تھی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ مجھے کمبرلی میں زیادہ دن نہیں رہنا پڑا تھا۔ ورنہ میں شاید روپا سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیتا یا روپا مجھ سے کچھ کہتی تو میرے لیے اس کے آگے انکار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر ایک جانب روپا ہوتی تو دوسری جانب نیتو اور میرے لیے دونوں میں سے ایک کا چناؤ کسی حد تک پیچیدہ ہو جاتا۔ اب اگر کبھی روپا کا سامنا ہوا اور اس نے کچھ کہا بھی تو میں صاف لفظوں اسے بتا دوں گا کہ میری سگائی ہو چکی ہے۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح یقین تھا کہ روپا کے والدین اس سلسلے میں کم از کم نیتو کے والدین کی طرح آسانی سے روپا کی بات ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہیں روپا کو انکار کے کئی بہانے ملیں گے۔ ویسے بھی راجاؤں کے ہاں عورتوں کو کچھ کہنے کی اجازت ہی کب ہوتی ہے۔ کیا پتہ روپا کی سگائی کہیں پہلے ہی سے ہو چکی ہو۔

اچھی بات یہ تھی کہ فون پر بات کرنے کے دوران گھر کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے اس لیے کسی نے فون کے دوران میری جذباتی کیفیت کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اکرام کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگا، گھر والوں کو بتا دیا نا۔ میں نے کہا، جی ہاں لیکن وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے کلکتہ واپس آ جاؤں۔ کیوں خیر تو ہے؟ اکرام نے حیرت سے پوچھا، باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن دو وجوہات کی بنا پر وہ مجھے جلدی واپس بلا رہے ہیں۔ پہلی یہ کہ انہوں نے میری بات پکی کی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میرے وہاں پہنچتے ہی وہ میری منگنی کر دیں۔ کیا تمہیں وہ لڑکی پسند ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ جی ہاں، بہت زیادہ پسند ہے۔ میں نے جواب دیا۔ تو پھر مبارک ہو، تمہاری منگنی کی خوشی میں مٹھائی ہم کھلائیں گے، انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ شکریہ میں نے جواب دیا اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا ایک جانکار لندن سے ہندوستان آیا ہوا ہے اور وہ اپنی واپسی سے پہلے مجھ سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔

کیا تمہاری لندن میں بھی کسی سے جانکاری ہے؟ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ میں نے جواب دیا، جی ہاں میرے کچھ مہربان وہاں رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ٹام کا اس کے گھر والوں کا ایک سرسری سا تعارف اکرام سے کرایا جس میں سے سانپ کا ذکر جان بوجھ کر نکال دیا۔ کیا وہ لندن میں میرے بھائی کا سراغ لگانے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ اکرام نے پوچھا۔ میں نے کہا اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ چند روز کے لیے ہندوستان چلیں وہاں پر ان کے منہ برابر بیٹھ کر بات کریں۔ ہو سکتا ہے مسٹر سمتھ لندن میں اور ہم ہندوستان میں مل کر آپ کے کھوئے ہوئے بھائی کا کھوج نکالیں۔ اسی طرح آپ میری منگنی میں بھی شریک ہو جائیں گے۔

اکرام کہنے لگے، تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے۔ اب سے پہلے نہ میرا کوئی قریبی جانکار لندن میں تھا اور نہ ہندوستان میں۔ اپنے بھائی کو ڈھونڈھنے کی تمام کوششیں میری ذاتی تھیں اور اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر یہ سب کچھ کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ اب اگر تمہارے توسط سے لندن کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جائے اور اگر تم لوگ ہندوستان میں میری مدد کر سکے تو ہو سکتا ہے کہ میرے بھائی کا کچھ نہ کچھ سراغ نکل آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری امی اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار اپنے کھوئے ہوئے بیٹے سے مل لیں۔ میں نے کہا لندن میں کئی پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسیاں بھی ہیں جو لوگوں کو ان کی قبروں تک میں تلاش کر کے لاتی ہیں۔ اگر مسٹر سمتھ خود مصروف بھی ہوئے تو ان کی مدد سے آپ کسی سراغ رساں کمپنی کی مناسب داموں پر خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور آپ کو کچھ رقم کے عوض رپورٹ مل جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے بھائی بھی اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد روپوشی سے نکل آئے ہوں۔ اکرام بولا، تمہاری بات بالکل بجا ہے اور یہ بات قابل عمل بھی معلوم ہوتی ہے۔ نیلم کے آتے ہی پروگرام بناتے ہیں۔

نیلم بچوں کو لے کر کہیں باہر گئی تھیں۔ ان کی واپسی پر اکرام نے انہیں ہمارے درمیان گفتگو سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگیں، بات تو بڑی سادہ ہے اور دل کو بھی لگتی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بات اتنی آسان بھی ہے جتنی نظر آتی ہے؟ اکرام کہنے لگے، ایک ہی صورت ہے کہ میں کوشش کر کے دیکھ آؤں۔ کم از کم دل میں حسرت تو نہیں رہے گی۔ اس کے لندن میں کچھ لوگوں سے بھی قریبی تعلقات ہیں جو ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا نے رامو کو ہمارے ہاں ہندوستان سے افریقہ شاید اسی لیے بھجوایا ہے۔ شاید یہ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ چلیں تو پھر آپ تیاری کر لیں، نیلم نے خوش ہو کر کہا۔

دوسرے دن ہم نے انڈیا ایمبیسی جا کر اکرام کے لیے ہندوستان کا ویزہ لگوایا۔ پھر ہم نے انڈین ایئر لائن سے میری اور اکرام کی ایک ساتھ ٹکٹ بنوائی۔ ہماری پرواز دو دن بعد یعنی ہفتے کے دن صبح چھ بجے سیدھا کلکتہ کے لیے تھی جس کے لیے ہمیں بمبئی جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹکٹ بنوا کر میں نے ایک فون کال پاہیرالہ اور دوسری کال کلکتہ کے لیے بک کروائی۔ میں نے آپریٹر سے کہا کہ مجھے پاہیرالہ کی کال پہلے ملا دے۔ اکرام نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ ٹام اس وقت پاہیرالہ میں ہوگا۔ ان سے بات کرنے کے بعد گھر والوں کو سارے پروگرام سے ایک ساتھ کلکتہ میں آگاہ کروں گا۔

پاہیرالہ کال ملی تو دوسری جانب سے رچرڈ کی آواز آئی، میں نے اپنا نام بتا کر اس سے ٹام کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا، بھئی تم کہاں ہو؟ میں نے جواب دیا، ابھی تو افریقہ سے بول رہا ہوں۔ تمہاری واپسی کب تک ہے؟ ٹام تم سے کسی سلسلے میں کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، میں یہ بتانے کے لیے کال کر رہا ہوں کہ میں ہفتے کے روز کلکتہ پہنچ رہا ہوں۔ کیا وہ مجھ سے اتوار کے روز کلکتہ میں نیتو کے ہاں مل سکتے ہیں؟ وہ بولا، اس وقت تو سرکٹ ہاؤس میں ہیں اور وہاں پر فون نہیں ہے اس لیے ان سے بات کرنا ممکن نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مل سکتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پروگرام کے مطابق اگر تمہارا فون نہ بھی آتا تو وہ کلکتہ جانے والے تھے۔ کیا جینا بھی ان کے ساتھ ہے؟ میں نے پوچھا۔ بالکل ہے اور جینا تو تمہیں اور کالی سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ میں نے کہا تو انہیں کہہ دیں کہ میں اتوار کے روز کلکتہ میں نیتو کے ہاں ان کا منتظر رہوں گا۔

دو گھنٹوں بعد کلکتہ کے لیے کال ملی تو آگے سے لانی بول رہی تھیں۔ مجھے اپنی نیتو جیسا تحفہ دینے پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ کہنے لگی تم نے اس کا دل جیت کر ہمارے لیے یہ کام بہت آسان کر دیا تھا۔ پھر میں نے انہیں اپنی واپسی کی فلائٹ کا نمبر دیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتایا کہ میرے ساتھ افریقہ سے ایک مہمان بھی چند دن کے لیے آ رہا ہے۔ وہ بولیں فکر کی کوئی بات نہیں بیٹے۔ ہوائی اڈے پر کوئی نہ کوئی تمہیں لینے کے لیے موجود ہوگا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اتوار والے روز ہمارے پرنسپل مسٹر سمتھ کے بھائی مجھ سے ملنے آئیں گے۔ کہنے لگیں، کوئی بات نہیں۔ جب آ جانا تو باقی سب کچھ تم خود ہی سنبھال لینا۔ فون رکھا اور اکرام سے کہا، میری جانب سے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے، ہاں! میں سن رہا تھا، تم نے بڑی باریک بینی سے سارا انتظام کیا ہے۔

میری واپسی میں ابھی دو دن باقی تھے۔ اکرام نے مجھے ایک البم میں اپنے بھائی کی کالی اور سفید تصویر دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ تصویر میرے بھائی نے اپنے پاسپورٹ کے لیے بنوائی تھی۔ ایک آدھ تصویر اس کی کالج کے زمانے کی بھی ہمارے پاس تھی۔ اکرام بولا، اس کے علاوہ ہمارے پاس اس کے بچپن کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ دراصل اس دور میں ہمارے ہاں تصاویر کھچوانا نہ صرف معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ پھر ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ ہمارے آغا جان کی تصویر ہے۔ ہمارے آغا جی نے پوری زندگی میں حج پر جانے کے لیے پاسپورٹ بنوانے پر صرف ایک تصویر کھنچوائی تھی۔ باپ بیٹے کی تصاویر کو غور سے دیکھا۔ آغا جی کی گھنی گھنی مونچھوں نے ان کا چہرہ واقعی بارعب کر دیا تھا۔ دوسری جانب انعام کا ہلکی مونچھوں والا چہرہ علم کے نور سے روشن نظر آتا تھا۔ تصویر میں آغا جی نے روایتی پگڑی اور واسکٹ پہنی تھی جبکہ انعام نے تصویر میں ٹائی اور کوٹ پہنا تھا اس کے سر کے بال تراشے ہوئے تھے۔ اگرچہ باپ بیٹے میں فرق بھی تھا اس کے باوجود دونوں ایک کڑی سے متعلق معلوم ہوتے تھے۔

میں نے اکرام سے کہا آپ ان تصاویر کی کاپیاں بنوا کر اپنے ساتھ ہندوستان لے چلیں تا کہ اگر وہاں پر کسی کو دینی پڑیں تو آپ کو آسانی ہوگی۔ انہیں میرا مشورہ پسند آیا۔ ابھی ہم تصاویر دیکھ رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، اکرام نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز سننے کے بعد رسیور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا، کوئی تمہارا پوچھ رہا ہے۔ میں نے اس سے رسیور لے کر ہیلو کہا تو دوسری جانب سے نسوانی آواز نے کہا، تمہاری روپا کو سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔

''قصدِ زیارت''

لَبَّیک اَللّٰھُمَّ لَبَّیک....

افتخار عارف (اسلام آباد)

ربِّ کعبہ کی طرف اِذن و عنایت سے گیا
شکرِ نعمت کو گیا، قصدِ زیارت سے گیا

وادیٔ شہرِ مکرّم سے مدینے کی طرف
والیؐ شہرِ مدینہ کی اجازت سے گیا

سارے اسباب تو پہلے سے بہم ہو چکے تھے
حکم کی دیر تھی، حکم آیا تو عجلت سے گیا

سجدہ ریزی کی مری مشق پرانی تھی، سو میں
سجدے کرتا ہوا ہر منزلِ طاعت سے گیا

میں غلاموں کی قطاروں میں کھڑا آخری شخص
بابِ رحمت کی طرف بابِ امانت سے گیا

کہیں گریہ کیا پیہم ادب آداب کے ساتھ
کہیں وارفتگیٔ شوق کی شدّت سے گیا

چین دیتا ہے بہت دل کو قیامِ حرمین
دل کو آرام کی حاجت تھی، ضرورت سے گیا

کتنے دُشوار مراحل تھے وہؐ جب گزرے تھے
میں بہت سہل اُسی جادۂ ہجرت سے گیا

وہ مدینے میں جو دو باغ ہیں جنت کے، اُدھر
بیعتِ سلسلۂ نُور کی نیّت سے گیا

ایسا میں کون سا شاعر ہوں مگر میرے نصیب
مدحتِ سرورِ کونینؐ کی نسبت سے گیا

○

کرتارپور

شاہین (کینیڈا)

زندگی کو ہم نے
جب موقع ملا
بے تحاشا ہر قدم پہنائے معنی
لیکن اب یہ سوچتے ہیں
اس تگ و دَو سے ہمیں حاصل ہوا کیا
اک چمکتی کار؟ گھر؟
گھر کی آرائش؟ دریچوں اور پردوں کا تصادم؟
رُت بدلتے دیکھ کر پھر از سرِ نو
اپنے کپڑوں اور جوتوں کو نئی ترتیب سے رکھنے
نیا لانے، پہننے کی لگن؟
آئے دن کی، ذائقے کو ڈھیل دیتی، اشتہا انگیز بیرونی ضیافت؟
خود فریبی کا تسلسل
کس لئے، کس کے لئے؟
حوصلے اپنے کسی سے کم نہیں تھے
چاہتے تھے یہ ہمارے سارے اپنے
دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں کسی سے (ہم نہ تھے!)
اب ہمیں لگتا ہے جیسے یہ بھی خود غرضی تھی اپنی
اپنی ہی تکمیل کا اک شاخسانہ یہ بھی تھا
دوست کہتے ہیں ہماری زندگی ہے کامرانی کی دلیل
کامرانی کس طرح کی اور پھر کس کے لئے؟
چار جانب ناکسوں، لاچار مظلوموں کی واماندہ قطاریں
ختم ہوتی ہی نہیں ہیں
تھا ہمیں معلوم اتنا
جانتی ہے مایا اینجیلو (Maya Angelou)
قفس میں بھی پرندے نغمہ خواں ہوتے ہیں کیوں
اور پھر ہم دیکھتے ہیں
کھل گئی ہے آنے والے موسموں کی راہداری
جلوہ گاہِ ناز ہے کرتارپور!

○

جسم کے انڈیکس سے پرے

پرویز شہریار
(دہلی، بھارت)

جھیل جیسی آنکھیں
لعل بدخشاں ہونٹ
بل کھاتی سیاہ زلفیں
کشش چاروں کھونٹ
یہ سب بھول بھلیاں ہیں
چہرہ مہرہ
دراصل ایک پردہ ہے
منزلِ مقصود سے بھٹکانے کا ایک حربہ ہے
اصلی عورت
کہیں اور ہوتی ہے
جسم کے انڈیکس سے پرے
کنڈلی مارے بیٹھی، کسی برہمن کی طرح
غیر مرئی سی
اودے اودے بادلوں کے خواب جیسی
اَماوس کی سیاہ رات جیسی
برقِ خوابیدہ
اپنی توانائیوں سے بھرپور
کنڈل جگانے میں
بڑی تپسیہ کی ضرورت ہوتی ہے
'پریم' ---عورت کے اندر کا سچا موتی ہے
اُس کے جسم کے پار جا کر ہی
اُسے تلاش کیا جا سکتا ہے
ورنہ جسم کے گرداب میں رکھا کیا ہے
مرد اپنے بازوؤں کے زور پر
قابض ہونا چاہتا ہے 'عورت' کے بدن کے شور پر
لیکن---
بدن ریت کا ٹیلہ ہے
خواہشوں کا میلہ ہے
وہاں سراب ہی سراب ہے
حسن مانا کہ لاجواب ہے
لیکن یہ
عورت کے ظاہر میں نہیں
اُس کے باطن میں ہوتا ہے کہیں پوشیدہ
اپنے ایپک سینٹر کے متلاشی
کسی جوالامکھی کی طرح
آدمی تمام عمر
بھاگتا رہتا ہے حسین چہروں کے پیچھے
اُس مردِ ناداں کی طرح
جو سمندر کی سطحِ آب پر
اُبھرتی ڈوبتی لہروں کو نہارتا رہتا ہے اکثر
اپنی پُر شوق نگاہوں سے
ساحل، سمندر پر
پڑی سیپیوں سے کھیلتا رہتا ہے دن بھر
شاید اُسے معلوم نہیں
سچے موتی تو
سمندر کی اندرونی تہوں میں پڑے ہوتے ہیں گم صم
اُن گمنام موتیوں کو پانے کے لیے
سیپیوں کے لب کھلنے تک کرنا ہوتا ہے انتظار
عورت کے اصلی جوہر کی خاطر
جسم کے انڈیکس سے پرے
چہرے کے پُر فریب پردہ کو ہٹا کر
کسی غوطہ خور کی طرح
اُس کے نہاں خانۂ دل میں اُترنا ہوگا
روح کے بند دریچے پر متواتر دستک دینا ہوگا
عورت سامانِ تعیش نہیں
بازار کا جنس نہیں
جسم بھی نہیں ہے
عورت کا اسمِ ثانی ---
محبت ہے، محبت ہے،
محبت ہی ہے!

مسکان کِھلی رہے

حنیف باوا
(جھنگ)

بڑھتی عمر کے لوگو
اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی
ہونٹوں پر انگلی رکھ کے
خاموشی سے جئے جاؤ
ہوسکتا ہے
تمہارے میٹھے بول بھی، انہیں
زہر لگیں
یہ بھی ممکن ہے کہ
تمہارا ہر اچھا کام
ان کے لیے
بے نام رہے
اسی لیے تو۔۔۔
میں یہ کہتا ہوں
بے شک آنکھوں میں تمہاری
سدا اشک بہیں
پھر بھی
بڑھتی عمر کے سجنو
تمہارے لبوں پر
ہر پل میٹھی مسکان
کِھلی رہے
تمہارے ماتھے کی
سب ریکھائیں بھی تو شائد
یہی سب کچھ دیکھتی ہیں

○

تحریر

رضیہ اسماعیل (بریڈفورڈ، برطانیہ)

لکھو، اتنا لکھو
یہ زندگی تحریر بن جائے
کسی کاغذ کے ٹکڑے پر
کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے!
لکھو ایسے کہ حرفوں سے
کسی ماہر مصوّر کی کوئی تصویر بن جائے!
ترے لفظوں میں وہ تاثیر ہو
جو پاؤں کی زنجیر بن جائے!
انڈیلو دل کا سارا درد
تم کاغذ کے ٹکڑوں پر
کوئی فقرہ قلم سے روٹھ کر کچھ اس طرح نکلے
کسی نا دیدہ کل کی قیمتی جاگیر بن جائے!
اسی تحریر کے ناتے ہمارے ملنے کی
شاید کوئی تدبیر بن جائے!
کہا تھا تم نے یہ مجھے۔۔۔!!
میں جب سے لکھ رہی ہوں
میں ہر اک حرف پر یہ سوچ کر نقطے لگاتی ہوں
کہ ان میں نقش ابھرے گا۔۔۔تمہارا نقش!
جسے لفظوں کے پیچ وخم میں ہی میں قید کرلوں گی
مگر لفظوں کو سو سو بار لکھنے پر
کئی نقطے لگانے اور مٹانے پر
کوئی بھی عکس تو کاغذ کی بانہوں میں نہیں آتا
کہاں ہو تم۔۔۔کتابِ زندگی کے
کون سے پنے میں رہتے ہو!
ہمیں لفظوں کے گھر میں چھوڑ کر
تم نے کہاں پر گھر بنایا ہے!
کہاں دل کو لگایا ہے!

○

زردرو

(گزرے برس کے نام)

پروین شیر
(نیوجرسی)

ایک مدت سے یونہی کھڑا ہے پرانا شجر
اس کی ٹہنی کو تھامے ہوئے
آج پھر
زردرو ایک پتہ لرزتا ہوا
ٹوٹ کر گر رہا ہے گئی رت کے خاشاک پر!
اس کے بوڑھے خمیدہ بدن پر ہیں
سوکھی رگوں کی جو پگ ڈنڈیاں
لے کے جاتی ہیں ماضی کی دہلیز پر
اس کی لرزش کی آہٹ میں ہیں
ان گنت داستاں کے اُفق
جن پہ ہے آنسوؤں اور خوشی کی دھنک
سلسلہ ہے یہی
اس شجر کی لچکتی ہوئی شاخ سے
ٹوٹ کر پھر سے گر جائے گا
خشک پتوں کے انبار پر
دوسرا زردرو برگ
پھر سے کہے گا وہی داستاں!!

○

سال آیا ہے نیا!

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

سال آیا ہے نیا ! لیکن کہاں جائیں گے ہم
کیا یونہی افسردگی سے دل کو بہلائیں گے ہم
جو کہ ماضی تھا وہ لایا ہے ہمیں اس حال میں
کیا اُسی ماضی کو مستقبل میں دہرائیں گے ہم
وقت ہے، پل پل میں ہوتا جا رہا ماضی میں گُم
کب تلک بیتے دنوں پر اشک برسائیں گے ہم
آنے والا ہر نیا دن ہے اُمنگوں سے بھرا
ساتھ اس کے کیا اُمیدوں کو نہ برلائیں گے ہم
کیا جوانی کا مقدر ہے بھٹکنا رات دن
کب نجیبو! اس کو راہِ راست پر لائیں گے ہم
چل پڑے ہیں جو، نہ سدِ راہ ان کے ہوں کبھی
اور کیا اُن پر کرم اتنا تو فرمائیں گے ہم
زندگی کیا ہے، مرقعِ جہدِ انسا ں کا یہاں
راستی سے کامیابی ہے، یہ سمجھائیں گے ہم
کب تلک اُلجھائیں گی ناعاقبت اندیشیاں
زندگی کی مشکلوں کو مل کے سلجھائیں گے ہم
آسماں پر تو کمندیں ڈال رکھی ہیں مگر
اس زمیں پہ رہنے کے قابل بھی بن جائیں گے ہم
صبر واستقلال والوں پر ہے رحمت رب کی
انکساری اور خوش خلقی کو اپنائیں گے ہم
صاف دل گوتم ہیں کہہ دیتے ہیں سب کو صاف صاف
ان کی باتوں کو بھلا کیونکر بُھلا پائیں گے ہم

○

سَمے ہوگیا

رفیق سندیلوی
(اسلام آباد)

پھر مقامِ رفاقت پہ
مدغم ہُوئیں
سُوئیاں دونوں، گھڑیال کی
رفت و آمد کے چکّر میں
گھنٹے کی آواز میں
میرا دِل کھو گیا
اپنی ٹِک ٹِک میں
بہتا رہا وقت
کتنا سمے ہو گیا!

سال ہا سال
پانی کے چشمے سے
گیلے کیے لب عناصر نے
جلتے اَلاؤ پہ
ہاتھ اپنے تاپے مظاہر نے
سینے کی دھڑکن سے
نادید کے رنگ و روغن سے
اَشیا نے
بینائی حاصل کی
مقسوم کے طاقچے سے
جہاں پُھول رکھّے تھے
لکڑی کے صندوقچے سے
خزانہ اُٹھالے گئی رات
مٹھّی سے گرتے رہے
ریت کی مثل دن!

ایک دن
صحن کی پیل گوں دُھوپ میں
آہنی چار پائی پہ لیٹے ہُوئے
ایک جھپکی سی آئی
تو مَیں سو گیا

میرے چہرے پہ
بارش کی اِک بُوند نے
گِر کے دستک دی:
بابا چلو،
اپنے کمرے کے اندر
سَمے ہو گیا!!

○

''گلاب''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

میں تو حیراں ہوں میری خواہش میں۔۔۔
جانتے ہیں کہ خاردار ہوں میں۔۔۔
اُنگلیاں لوگ زخمی کرتے ہیں۔۔۔
کس قدر مان مجھ کو دیتے ہیں۔۔۔
ہر زباں کے ادب میں چاہا گیا۔۔۔
اور کئی زاویوں سے بَرتا گیا۔۔۔
عارض ولب کی ترجمانی کو۔۔۔
استعارہ بنا کبھی تشبیہہ۔۔۔
کوئی کالر ہو یا کہ زلفِ دراز۔۔۔
کوئی گجرہ ہو یا مہکتا ہار۔۔۔
میں علامت کے طور بجتا رہا۔۔۔
اس قدر دے کے مجھ کو مہکِ کرم۔۔۔
پھر پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔۔۔
پتی پتی بکھر کے جب ٹوٹا۔۔۔!

○

ہیپاٹائیٹس

(یرقان یا پیلیا)

ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

یرقان یا پیلیا ایک عام مرض ہے جو خاص طور سے تیسری دنیا میں لاکھوں افراد کی موت کا سبب بنتا ہے۔ زمانہ قدیم سے حکما اس کے وجود سے باخبر تھے مگر اس کو سمجھنا آسان نہ تھا اس لئے کہ اسکی صحیح تحقیق یا تشخیص کے لئے موجودہ دور کی نہایت اعلیٰ ترین اور پیچیدہ ٹکنالوجی کی ضرورت تھی۔ یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ یرقان جو جلد، آنکھوں اور پیشاب میں پیلی رنگت کی زیادتی کو کہا جاتا ہے، کی کئی وجوہات ہیں مگر اس مضمون میں ہم صرف اس یرقان یا بیماری پر روشنی ڈالیں گے جو جگر کی سوزش کی وجہ سے ہوتا ہے اس سوزش کا سبب وائرس کی انفیکشن ہے اسلئے کہ صحت عامہ کے لحاظ سے یہ سب سے اہم ہے۔ ہیپاٹائیٹس (HEPATITIS) کا لفظ (HEPAR) سے نکلا ہے۔ انسان کے پیٹ میں سیدھے ہاتھ کی طرف پسلیوں کے ذرا سے نیچے ایک عضو ہے جسے یونانی میں ہیپار، فارسی اور اردو میں جگر ہندی میں کلیجہ اور انگریزی میں لیور (LIVER) کہتے ہیں۔ انسانی جسم کے اعضا میں یہ بڑی حد تک سب سے پیچیدہ عضو ہے۔ دراصل یہ جسم کی کیمیائی فیکٹری ہے اس لئے کہ اس میں انتہائی پیچیدہ کیمیائی عمل ہوتے رہتے ہیں اسی وجہ سے اگر یہ فیل ہو جائے تو انسانی زندگی ممکن نہیں ہے۔ کچھ سال پہلے تک اس بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا اور ایک حد تک اب بھی اس میں پیدا ہونے والی معدود چند بیماریوں کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے مگر چند سال پہلے اسکی پیوندکاری یعنی تباہ شدہ جگر کو نکال کر نیا جگر لگانے کی ٹیکنالوجی پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے اور کئی جانوں کو بچایا جا چکا ہے مگر نہ صرف جگر کی تبدیلی بہت پیچیدہ آپریشن ہے بلکہ بیحد مہنگا بھی ہے حتیٰ کہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہ آپریشن بہت زیادہ عام نہیں ہے۔

جگر کا فعل:

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے جگر بائیں طرف پسلیوں کے نیچے واقعہ ہے۔ اسکے دو حصے ہیں جنکے درمیان سے نیچے کی طرف خون کی بڑی نالیاں ہیں معدے اور چھوٹی آنت سے ہضم کی ہوئی غذا ان خون کی نالیوں کے ذریعہ جگر میں داخل ہوتی ہیں اور ان غذائی اجزا کی مزید پروسیسنگ ہوتی ہے۔ یہیں چربی اور پروٹین کو مزید چھوٹے ذروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کولیسٹرول کی افزائش بھی یہیں ہوتی ہے اور جگر جسم کو درکار ایک اہم پروٹین البومن بھی بناتا ہے۔ اسکے علاوہ مختلف قسم کے ہارمون جن سے ہماری زندگی کے بہت سے کیمیائی عمل ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ بھی جگر ہی بناتا ہے۔ ایک اور اہم عمل جو صرف جگر ہی کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جب قدرتی طور پر ہمارے خون کے سرخ ذرات ٹوٹتے ہیں تاکہ نئے ذرات پیدا ہوسکیں تو ان ٹوٹنے والے ذرات کے ملبے سے ایک زرد رنگدار مادہ بیلی روبن (BILIRUBIN) خارج ہوتا ہے۔ جگر اس مادے کو، جسے عمومی زبان میں ''پت'' کہتے ہیں علیحدہ کر کے ایک خاص نالی کے راستے پتے کی تھیلی میں خارج کرتا ہے جہاں وقتاً فوقتاً یہ تھیلی سکڑ کر اس مادے کو آنتوں میں خارج کرتی ہے جہاں سے فضلے کے ذریعہ یہ مادہ جسم سے باہر نکل جاتا ہے، اسی لئے فضلے کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اگر جگر کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو وہ خون سے اس مادے کو علیحدہ نہیں کر سکتا اور خون میں اس مادے کی مقدار بڑھ جاتی ہے جسکی وجہ سے جسمانی رنگت اور آنکھوں میں پیلا پن اتر آتا ہے جسے ''پیلیا'' کہتے ہیں۔ یہ جگر کی خرابی کی واضح اور اوّل نشانی ہوتی ہے۔

ہیپاٹائیٹس جسے صحیح طور پر جگر کی سوزش کہنا چاہئے، ایک متعدی یعنی چھوت کا مرض ہے۔ یہ انتہائی خطرناک مرض ہے جس سے ہر سال ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں جانیں تلف ہوتی ہیں۔ حقیقتاً اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ اب صرف چند سالوں سے کچھ نئی ادویات ایجاد ہوئی ہیں جو بیماری کو کسی حد تک آگے بڑھنے سے روک سکتی ہیں مگر عملی طور پر ان دواؤں کا استعمال آسان یا ممکن نہیں ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ لکھنا بھی امید افزا ہے اسکی روک تھام اور تدارک اتنا مشکل نہیں ہے مگر اس کے لئے ایک بہت بڑے پیمانے پر عوامی مہم کی ضرورت ہے تاکہ اسکے تدارک کے لئے عوام کو آگاہی ہو سکے۔

ہیپاٹائیٹس کی وجہ

اس حقیقت کے باوجود کے عالمی طور پر یہ مرض بیحد عام تھا اور دنیا کے ہر خطے میں اس کا وجود تھا اور اس سے بے شمار اموات ہو رہی تھیں مگر ۱۹۶۵ تک بھی اسکی حتمی وجہ معلوم نہیں تھی ۶۵ میں ایک امریکی ڈاکٹر باروخ بلمبرگ (جسے بعد اس دریافت پر نوبیل انعام بھی ملا) نے اتفاقاً یہ دریافت کیا کہ آسٹریلیا کے وحشی قبیلوں میں ان چند لوگوں کے خون میں وائرس کے جراثیم کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے موجود تھے جنہیں یرقان تھا۔ مزید تحقیق سے ثابت ہوا کہ جگر کی سوزش، اسکی سوجن اور اور آخرکار اسکی مکمل تباہی جسم میں اس وائرس کی انفیکشن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ وائرس اس قدر چھوت کی وقعت رکھتا ہے کہ یہ ہزاروں لوگوں کو بھی اس بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چونکہ اس وائرس کو شناخت کے لئے کوئی نام دینا تھا اس لئے اسے ''بی'' وائرس کہا گیا اور اس وائرس کے ذریعہ پھیلنے والی بیماری کو ہیپاٹائٹیس ''بی'' کہا گیا۔ اسی طرح تیسری دنیا میں جہاں صفائی کا فقدان تھا اور یرقان کا مرض عام تھا جب وہاں مریضوں کے خون کی جانچ کی گئی تو وہاں بھی خون میں ایک وائرس پایا گیا۔ اس کو وائرس ''اے'' کہا گیا۔ اس کے بعد بھی کچھ ایسے مریض دیکھے گئے جنہیں یرقان تھا اور انکا جگر تباہی کی طرف جا رہا تھا مگر ان میں نہ تو اے وائرس تھا نہ ہی بی وائرس۔ کوئی بائیس سال تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا جب تقریباً ۱۹۸۷ میں برطانوی اور امریکی ڈاکٹروں نے ان مریضوں میں ایک وائرس دریافت کیا اسے ہیپاٹائیٹس ''سی'' کا نام دیا گیا۔

ہیپاٹائیٹس اے۔

ہیپ اے ایک بہت ہی عام بیماری ہے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی وقت تیسری دنیا میں ۱۴ لاکھ افراد اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ نسبتاً کم مہلک ہے پھر بھی اس میں مبتلا ہونے والے افراد میں پانچ سے آٹھ فیصد لوگ لقمہء اجل بن جاتے ہیں۔ ان سے مرنے والے زیادہ تر کمزور اور نحیف یا پھر دس سال سے پندرہ سال کے بچے ہوتے ہیں۔ اسکا کوئی علاج نہیں مگر خوش قسمتی سے تین سے چھ ہفتوں میں جسم کی قدرتی مدافعت اس پر قابو پا لیتی ہے اور یہ خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ مریض کے فضلے میں وائرس کا اخراج ہوتا ہے اور جن ممالک میں گندگی ہے وہاں کھانے پینے کی چیزوں اور پانی میں فضلے کی آمیزش کی وجہ سے صحت مند افراد کے جسم میں یہ وائرس داخل ہو کر جگر پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں جہاں صفائی کا بہتر انتظام ہے وہاں یہ بیماری اب تقریباً ناپید ہے۔ اسکا بھی کوئی حتمی علاج نہیں مگر خوش قسمتی سے اب اسکا مدافعتی ٹیکا ایجاد ہو گیا ہے جو یقینی طور پر اس سے بچاؤ کرتا ہے۔ وہ لوگ جو مغربی ممالک میں رہتے ہیں جب وہ اپنے وطن جائیں ان کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ یہ ٹیکا لگوائیں۔ مریض کے برتن، اسکے فضلے اور قربت سے دوری اور پرہیز ضروری ہے۔ خاص طور سے بار بار ہاتھ دھونا بھی ضروری ہے۔ اگر کھانے کی اشیا کو کم از کم پانچ منٹ تک ابالنے کے درجہ حرارت پر رکھا جائے تو وائرس کی موت ہو جاتی ہے اور وہ بیماری نہیں پھیلا سکتا۔ یرقان شروع ہونے کے دو سے تین ہفتے تک مریض کا فضلہ چھوت کا سبب ہوتا ہے مگر مریض کے تھوک سے مرض نہیں پھیل سکتا۔ مرض کے بچاؤ کا ٹیکا مردہ وائرس سے تیار کیا جاتا ہے اس لئے اس ٹیکے سے ہیپاٹائی ٹس نہیں لگ سکتی۔ اس کی دو ڈوزز ہوتی ہیں جو چھ ماہ کے فاصلے سے لگائی جاتی ہیں۔ بالغ افراد کبھی بھی لگوا سکتے ہیں بچوں کے لئے چھ ماہ اور ایک سال کی عمر کے لئے سفارش کی جاتی ہے۔

ہیپاٹائی ٹس ''بی''

ہیپاٹائی ٹس ''بی'' ایک نہایت خطرناک مرض ہے۔ اسکا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ وائرس ایک صحت مند فرد کے جسم میں آلودہ خون کی آمیزش سے داخل ہوتا ہے اور جلد ہی لاکھوں کی تعداد میں خود کو تقسیم کر کے آخر کار جگر کے گوشت میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اگر دو ماہ کے عرصے میں مریض کی قدرتی قوت مدافعت اس پر قابو پا کر اسے تباہ نہ کر دے اور مکمل طور پر خون کو اس سے پاک نہ کر دے تو یہ دائمی یعنی CHRONIC مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جگر کے خلیات کو ناکارہ کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں جگر کا متاثرہ حصہ سوکھے ہوئے زخم کی طرح سکڑنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ پورا جگر سوکھ کر سکڑ جاتا ہے۔ اسے سروسس CIRRHOSIS کہتے ہیں۔ جگر اپنا کام چھوڑ دیتا ہے۔ جگر سے گزرنے والے خون کی جکڑ لیجاتی ہیں اس سے خون کے دوران میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پیٹ میں پانی بھر جاتا ہے اور دوسری پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں آخری مرحلے میں مریض پر بیہوشی طاری ہو جاتی ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ایک بڑی تعداد میں اس انفکشن کی وجہ سے جگر کا سرطان ہو جاتا ہے جو مہلک ہوتا ہے۔

اس بیماری کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ مریض کو ایسا خون چڑھایا گیا ہے جو اس وائرس سے آلودہ تھا یا پھر مریض نے کوئی ایسی سوئی استعمال کی ہے جسے اس سے پہلے کسی ایسے شخص نے استعمال کیا تھا جس کے جسم میں یہ وائرس تھا۔ آج کل اس چیز پر بہت توجہ دی جاتی ہے کہ ترسیل خون سے پہلے اسکی بڑی کڑی جانچ کی جائے اور استعمال شدہ سوئیاں صحیح طریقے سے ٹھکانے لگائی جائیں، جو لوگ نشے کی دوائیں اپنی رگ میں لگاتے ہیں ان میں یہ مرض عام ہے۔ مریض کے برتن، کپڑوں یا اس سے بوس و بازی کرنے سے یہ مرض نہیں لگ سکتا۔ اس کی تشخیص خون کے ٹیسٹ سے ہوتی ہے جس سے خون میں وائرس ''بی'' کی موجودگی کا پتہ لگ جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے بہت سے افراد جن کے خون میں یہ وائرس ہے وہ ایک طویل عرصے تک بالکل نارمل ہوتے ہیں اور انہیں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ انہیں CARRIER کہا جاتا ہے یعنی ایک طرح وہ اس وائرس کو لئے پھرتے ہیں اور بیماری کے پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔ سائینس کی بہت بڑی فتح ہے کہ اسکے تدارک کا بھی ٹیکا ایجاد ہو گیا ہے اور اب اس بات کی سفارش کی جاتی ہے کہ ہر شخص اور خاص طور سے صحت کے شعبے میں کام کرنے والے افراد یہ ٹیکا ضرور لگوائیں۔ اس کا ٹیکا (VACCINE) وائرس کے غیر موثر حصے سے تیار کیا جاتا ہے اس لئے اس سے ہیپاٹائیٹس ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سفارش ہے کے نولود کو چند ہفتوں میں یہ ٹیکا لگایا جائے اسکی تین ڈوزیں تین مہینوں کے وقفے سے لگائی جاتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ عام حالات میں یہ زندگی بھر کے لئے ہپاٹائی ٹس سے بچاؤ مہیا کرتا ہے۔ ایک ایسا مرض جو نا قابل علاج ہے اور جو انتہائی تباہی پھیلاتا ہے اگر وہ اسکے ٹیکے سے جانیں بچا سکتا ہے تو کیوں ہر شخص یہ ٹیکا نہ لگوائے اس لئے امریکا میں صحت کے محکمے میں کام کرنے والوں کے لئے یہ ٹیکا لازمی ہے۔

ہیپاٹائی ٹس ''سی''

اسکی دریافت ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ یہ بھی آلودہ خون یا پھر آلودہ سوئیوں اور اس قسم کے اوزاروں کے استعمال سے ہوتی ہے جو خون سے آلودہ ہوں۔ نائی کے استروں، گندے شیونگ ریزر اور آپریشن کے اوزار اگر وہ صحیح طور پر صاف نہ کئے جائیں تو ان سے بھی یہ بیماری لگ سکتی ہے۔ ہپاٹائی ٹس جنسی اختلاط سے بھی ہو سکتی ہے اگرچہ اس کے امکانات کم ہیں مگر ایسی احتیاط جس کی وجہ سے باہمی رطوبتیں ایک دوسرے سے مکس نہ ہو سکیں یعنی کانڈم کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے مگر صرف بوس و کنار یا جھوٹے برتنوں کے استعمال سے یہ بیماری نہیں لگ سکتی۔

پاکستان میں ہیپ سی وبائی صورت اختیار کر چکی ہے اور عالمی ادارہ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان اس بیماری میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے، پہلے نمبر پر مصر ہے۔ صوبے پنجاب میں کل آبادی کے سات فیصد افراد اس مہلک بیماری میں مبتلا ہیں اور پورے ملک میں اسی لاکھ افراد اس بیماری میں مبتلا

ہیں اور ہر سال چار لاکھ افراد اسکا شکار ہو کر موت کی وادی میں اترتے ہیں۔

ہیپ سی کا کوئی علاج نہ تھا اور یہ یقینی طور پر مہلک بیماری تھی اور اب بھی مریضوں کی اکثریت اس سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہ جگر کے سرطان کی بہت خاص اور اہم وجہ ہے۔ اس سے مدافعت کا کوئی ٹیکا بھی ایجاد نہیں ہوا ہے۔ کچھ سال پہلے ایک دوا INTERFERON ایجاد ہوئی جسکے انجکشن اس بیماری کو بڑھنے سے روکتے ہیں۔ پھر کئی سال بعد کچھ دوائیں وائرس کے خلاف اور انہیں تباہ کرنے کی دریافت ہوئیں اور اب انٹر فیرون اور RIBAVIRIN کے استعمال سے مرض کو ایک بہت طول عرصے تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

یہ دوائیں اس قدر مہنگی ہیں کہ مغربی دنیا کے رئیس ترین افراد بھی انکے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے بہت سے ممالک میں ایسے قوانین پاس کئے گئے ہیں کہ مستحق مریضوں کو یہ ادویات حکومت کی طرف سے مفت مہیا کی جاتی ہیں۔

میں نے سنا تھا کہ شہباز شریف کے زمانے میں پنجاب میں بھی ایک ایسی ہی سکیم چلی تھی کہ ہیپ سی کے مریضوں کو یہ ادویات مفت فراہم کی جارہی تھیں۔ اس سے بچاؤ کا طریقہ اس سے آگاہی اور وہ طریقے ہیں کہ ان افراد کی نشان دہی کی جائے جن کے خون میں ''سی'' وائرس موجود ہے اور وہ دوسروں تک یہ بیماری نہ دے سکیں۔ خاص طور سے ان کے استعمال شدہ بلیڈ استرے، سوئیاں، جو انکے خون سے آلودہ ہو سکتی ہیں ان سے بچا جائے۔ اگر یہ اشیاء ہی سی کے وائرس سے آلودہ ہو جائیں اور کسی وجہ سے انکو استعمال کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو یا تو انکو پانی میں اس قدر ابالیں کہ کئی دفعہ ابال آجائے جس سے وائرس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بلیچ (BLEACH) سے دھونے یا اس میں ایک گھنٹے ڈبونے سے بھی وائرس مر جاتا ہے اور یہ اوزار استعمال کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ دہائیوں بعد ہیپ سی کی ویکسین بھی ایجاد ہو جائے جو انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی۔

- بقیہ -

مفاہمت کا عذاب

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلنے یا بھوننے سے پہلے ہی گرم تیل کی اڑتی ہوئی چھینٹیں میرے ہاتھوں پر آبلے بھی ڈال دیتی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

اس نے گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ پانی پی کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

''آج خلاف معمول ابھی تک کیسے جاگ رہی ہو۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہر دن ایک جیسا نہیں ہوتا۔ تمام راتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ زندگی تبدیلیوں کا نام ہے۔'' وہ بڑے نارمل لہجہ میں بولی۔

دونوں کی نگاہیں ملیں اور وہ غیر ارادی طور پر مسکرا دیئے۔

''آج سردی بہت ہے۔'' وہ جھرجھری لیتا ہوا بولا۔

''ہاں آج واقعی سردی بہت ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں ایک ساتھ بیڈروم میں واپس آگئے۔

ٹی.وی. چل رہا تھا۔ شاید وہ بھولے سے چلتا ہی چھوڑ گئی تھی۔

دونوں کی نظریں ٹی.وی. پر پڑیں۔ بندر اور کیلے والا اشتہار پھر آرہا تھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو وہ کسی قدر جھینپ گئی۔

یہاں مفاہمت کا ایک اور موقع میسر آگیا تھا۔

پھر وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں میں بلا کی شدت تھی، باتیں بہت دنوں کی اکٹھا تھیں اور بیان کے لئے بہت تھوڑا سا وقفہ تھا۔

جیسے ہی وال کلاک نے بارہ بجائے، اس نے ٹیوب لائٹ بند کر کے نائٹ بلب روشن کر دیا۔ وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد اشتہار والے بندر کی روح اس کے اندر حلول کر گئی۔

اگلی ہی شام وہ سول لائنز کی کافی شاپ میں بیٹھا، آنکھیں بند کئے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی مفاہمت غیر شعوری اور لمحاتی ہوتی ہے۔ کہیں یہ اسی طرح کی مفاہمت نہ ہو، شاید انسانی فطرت اس کی قصوروار ہے۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کلر ونڈو پین کے اس پار سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ ادھر سے ادھر دوڑتی ہوئی کاریں، نوجوان جوڑوں کی بھیڑ، اور اس بھیڑ کے چہروں پر پھیلی ہوئی مسرت، زرق برق دوکانوں پر خریداروں کا ہجوم۔ سب کچھ وہی۔ خوابوں میں بھاگتی دوڑتی اور غائب ہوتی پرچھائیوں کی طرح۔

اچانک وہ چونک پڑا، اس نے دیکھا کہ باہر پھیلے ہوئے کہرے کی گھنی چادر کو چیرتی ہوئی، شافعہ آہستہ آہستہ قدموں سے کافی شاپ کی طرف چلی آرہی ہے۔

استثنائی صورتیں

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ڈاکٹر رینو بہل مشرقی پنجاب و ہریانہ کی ایک جرأت مند مقبول ومشہور افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے سات مجموعے چھپ چکے ہیں اور اب ناول نگاری کی طرف راغب ہونے کے بعد ان کے دوسرے ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں انہوں نے ایک ایسے اہم سماجی اور معاشرتی مسئلہ کو موضوع بنایا ہے جسے عام طور پر اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ اس حوالے سے طنز، حقارت اور تکلیف دہ رویہ اور برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ مصنفہ بڑی سوچ بچار کے بعد موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اور ان کی تحریریں نہ صرف بامقصد ہوتی ہیں بلکہ بامعنی انداز میں زبان وبیان کی تابندگی اور فکر ودانش کے ساتھ کچھ ایسے اشاروں پر بھی مشتمل ہوتی ہیں جو زیر بحث مسئلہ کے حل کے لیے قاری کی سوچ کی مثبت رہنمائی کرسکیں۔ ڈاکٹر رینو بہل کی لکھی ہوئی کہانیاں اسی لیے بغیر دل پر جبر کیے خود کو پڑھوا لیتی ہیں۔ ''ادب برائے زندگی'' کے اپنے اصول کے تحت خاص موضوعات پر قلم اُٹھانا ان کی مجبوری بن گئی ہے۔

پنجاب کی سرزمین پر رہتے ہوئے انہوں نے گریجویشن کے دوران اردو زبان پڑھی اور پھر اسی میں ڈاکٹریٹ کیا۔ وہ گذشتہ دو دہائیوں سے اپنی دانشورانہ اور تخلیقی صلاحیتیں استعمال کرتے ہوئے اردو افسانہ نگاری اور اب ناول نگاری میں ایک طویل عرصہ کے بعد نئی روح پھونک کر گیسوئے اردو سنوارنے اور اردو ادب کی ترقی وسربلندی کے لیے کوشاں ہیں اور اب یہ ان کی شناخت اور پہچان بن چکا ہے۔ انسان نظام کائنات میں تخلیق شدہ لاکھوں قسم کی مخلوقات میں اعلیٰ خصوصیات کے ساتھ ذہین اور خوبصورت ترین مخلوق ہے جسے عام اصول کے مطابق جوڑوں (Pairs) یعنی مذکر اور مؤنث کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ پیچیدہ اور مشکل صورتِ حال اور کسی معذوری کی صورت میں بھی محنت سے باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بینائی سے محروم انسان اعلیٰ تعلیمی امتحانات پاس کر لیتا ہے۔ قوت سماعت یا کسی اور جسمانی معذوری کے باوجود حوصلہ افزا رویہ سے کسی نہ کسی صورت اپنی مشکل کا حل نکال کر زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس بعض اوقات اپنا گھرانہ یا معاشرہ منفی عمل اور رویہ اختیار کرتے ہوئے عام اور بے قصور انسان کی زندگی بھی قابل رحم بنا دیتا ہے۔

کائنات میں عام طور پر ہر چیز اپنی طے شدہ شکل (Design) میں بنتی ہے لیکن کبھی کبھار استثنائی صورتیں (Exceptions) بھی وجود میں آ جاتی ہیں جو عام (Normal) صورت سے کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ یہ عمل انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات مثلاً جانوروں، درختوں اور پودوں میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کیا راز ہے یہ تو صرف خالق کائنات ہی جانتا ہے۔ اس نے انسان کو بہترین دل و دماغ اور سمجھ بوجھ سے لیس کر کے دنیا میں بھیج دیا ہے تاکہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور اختیار کو صحیح استعمال کر کے جزا کا حقدار ٹھہرے۔

انسان کو مرد اور عورت کے روپ میں پیدا کیا گیا ہے تاہم پیدائش کے اس انتہائی پیچیدہ عمل میں شاذ و نادر ایک ایسی جنس وجود میں آ جاتی ہے جس میں مذکر اور مؤنث کی کچھ خصوصیات ایک ساتھ شامل ہو جاتی ہیں (Gender Dysphoria) جو عموماً سات آٹھ سال کی عمر میں نمایاں ہو کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی صورت میں ایک مرد اپنے جسم میں ایک نسوانی روح کی موجودگی اور اثرات محسوس کرتا ہے (Male body with female soul) اور یہی وہ قسم ہے جسے ہمارے معاشرے میں ''خواجہ سرا'' یا ''ہیجڑا'' کہا جاتا ہے۔ ان کی گفتگو کا انداز، حرکات وسکنات اور عموماً لباس بھی نسوانی طرز کا ہوتا ہے جبکہ ظاہری قد وقامت اور ڈیل ڈول مردانہ نظر آتی ہے۔

دوسری صورت میں ایک عورت اپنے اندر ایک مردانہ روح کی موجودگی محسوس کرتی ہے۔

تیسری صورت میں ایک فرد میں جنس کی خصوصیات اس طرح موجود ہوتی ہیں کہ جراحی کے ذریعہ وہ کوئی ایک جنس اختیار کر سکتا ہے۔

انسان کا تصورِ ذات (Self concept) اس کے ذہن میں تخلیق ہوتا ہے جس میں اس کی جنس کا تصور بھی واضح ہوتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ مخصوص معاشرتی رویہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ لڑکا نسوانی لباس، چوڑیاں، بالیاں یا انداز گفتگو اختیار نہیں کرتا جبکہ لڑکی اپنے انداز نسوانی ہی رکھتی ہے۔ تاہم تیسری جنس کے ذہن میں تصورِ ذات یا Sefl Concept واضح نہیں ہوتا اور ان حالات میں معاشرے اور سماج کا رویہ اور اذیت ناک دباؤ انہیں نسوانیت کی طرف دھکیلنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور بسا اوقات وہ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں البتہ مذہب سے وابستگی اس صورت کو قابو کرنے میں بڑی موثر ہوتی ہے۔

ماہرین نفسیات کے مطابق مندرجہ ذیل چار عوامل تیسری جنس کے افراد کو جو پہلے ہی نسوانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں، نسوانی رویہ اختیار کرنے میں مزید معاون ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ ماں سے جسمانی اور جذباتی قربت جو احساسِ تحفظ کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ باپ کا سخت گیر رویہ جو ان افراد کو کنٹرول کرنے کے لیے روا رکھا جاتا ہے۔

۳۔ معاشرے کے غریب اور غیر تعلیم یافتہ والدین کا ان افراد پر کمزور کنٹرول جس کی وجہ سے تیسری جنس کے یہ افراد ناچ گانے، بھکاری پن، چوری چکاری اور منشیات وجنسی معاملات کی طرف مائل ہو کر اپنے جیسے دوسرے گروہوں یعنی خواجہ سراؤں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات AIDS جیسی مہلک بیماریوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

روشنی پھیلاتی شاعری

نویدسروش
(میرپورخاص)

غزل کہنے، پڑھنے اور سننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ غزل کہنا آسان ہے مگر غزل کہنے اور سمجھنے والے اچھی طرح واقف ہیں کہ غزل تخلیق کرنا انتہائی مشکل عمل ہے۔ ہردن لاکھوں غزلیں کہی جارہی ہیں سینکڑوں کتابیں شائع ہورہی ہیں اور ہرروز اخبارات اور رسائل میں ہزاروں غزلیں شائع ہورہی ہیں یہ کام بھی ضروری ہے مگران غزلوں میں زندہ کتنی رہتی ہیں۔ اچھی کتاب، غزل اور شعراپنی جگہ شعری ادب اور دل میں جگہ بنالیتے ہیں۔ ''روشنی دونوں طرف'' کی غزلیں، ادب، دل اور ذہن میں اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ظہور چوہان کے چوتھے شعری مجموعے ''روشنی دونوں طرف'' کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب، زبان وبیان کی سادگی اور فنی لوازمات سے اپنی غزل کو آراستہ کیا ہے اُن کی غزل میں جمالیاتی مہک رومانی فضا کو معطر کیے رکھتی ہے۔ پرانی اور نئی غزل کا حسین امتزاج ان کی غزل کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

خوشی ملی ہے تو مہکا ہوا ہے سارا وجود
کہاں تمہاری محبت، کہاں ہمارا وجود
اب اُس کے حسن کی تعریف اور کیا کی جائے
اندھیری شب میں چمکتا ہوا ستارہ وجود

ظہور چوہان کی غزل کہیں روایت سے بچھڑی ہوئی محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی بے جا مشکلات اور گھسے ہوئے موضوعات میں گم ہوتی ہے انہوں نے ایک نئی اور پسندیدہ غزل کا جہان آباد کیا ہے وہ اپنے پڑھنے والوں پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں بلکہ وہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات، حادثات اور مشاہدات اور تجربات سیاسی، سماجی اور نظریاتی بھی ہوسکتے ہیں۔

ظہور چوہان کا لہجہ دھیما ہے مگر سہما ہوا یا افسردہ نہیں ہے سماجی وسیاسی دشواریوں کے حوالے سے سوچتے ہیں بے چین ہوتے ہیں اپنے عہد کے المیوں اور مسائل کو بیان بھی کرتے ہیں یہاں وہ کاٹ دار لہجے کے بجائے لفظوں میں چھپی طاقت سے کام لیتے ہیں جو معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ پُراثر بھی ہوجاتا ہے وہ کہیں زندگی میں غیر محسوس جبر کی تصویریں پیش کرتے ہیں تو کہیں خوف کی فضا کی آواز بنتے ہیں اس قبیل کی غزلوں میں اُن کا فن شعری محاسن سے لبریز ہے کہیں بھی فنی جھول یا نعرے بازی کا گمان نہیں گزرتا۔

شہر کا شہر نوابوں کے اثر میں ہے ظہور
جسے دیکھو وہی لگتا ہے نوابی چہرہ

خدائے ارض وسما! میری لاج رکھ لینا
یہاں تو ہر کوئی خود کو خدا سمجھتا ہے
ہم وہ طائر جنہیں اُڑنے کا ہنر آتا ہے
قید ہونے میں کہاں وقت کے زندانوں میں
اسی کا نام ہے دنیا، یہ دنیا داری ہے
کسی کے کام نہ آنا، کبھی ضرورت میں
یہ اور بات ترے ساتھ اختلاف بھی ہے
مگر میں بولتا بھی ہوں تری حمایت میں
یہ پیش خیمہ کسی انقلاب کا تو نہیں
جو ارتعاش سا آبِ رواں میں رہتا ہے

ظہور چوہان کی غزل میں سنجیدہ رومانی فضا نظر آتی ہے وہ اپنے اسلوب سے منفرد بناتے ہیں اُن کے کلام میں محبت کے زاویے ذرا نئے انداز اور سنجیدہ بے باکی سے سامنے آتے ہیں۔ یہ خارجی اور داخلی کیفیات کی حقیقی تصویریں ہیں۔ ظہور چوہان رومان میں بے جا جذباتیت سے کام نہیں لیتے بلکہ ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ہجر کے کرب کے لمحوں سے لطف اندوز ضرور ہوتے مگر اُسے وحشت نہیں بننے دیتے یہ شاعر کا ادراک اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ غزل کے مزاج اور موضوعات کے تقاضے بھی ہیں اور ارتقا بھی۔

اگرچہ کہنے کو اچھا تو ہوں مگر نہیں ہوں
ترے بغیر میں زندہ تو ہوں مگر نہیں ہوں
پوری ہو جاتی اگر کوئی کہانی ہوتی
یہ محبت ہے میاں! اس میں کسک رہتی ہے
تونے اے عشق! یہ کیسا مجھے رکھا ہوا ہے
جان سے مار کے زندہ مجھے رکھا ہوا ہے
حسبِ معمول دھڑکتا ہے ابھی ہجر میں دل
کیوں کہ موسم ہی نہیں آیا عزاداری کا
جب کبھی اُس کا تصور میں کروں تو اُس کی
جانے کب تک مری سانسوں میں مہک رہتی ہے

رئیس فروغ کا فلسفۂ محبت یہ تھا
ایک محبت کافی ہے
باقی عمر اضافی ہے

زمانے کی برق رفتاری اور بدلتے ہوئے رجحانات کے تحت ظہور چوہان حقیقت پرمبنی فلسفۂ محبت پیش کررہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے اب وہ زمانہ نہیں رہا بقول غالب:

بیٹھیں رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ظہور چوہان ماضی کو فراموش نہیں کررہے مگر وہ لمحۂ موجود میں کھلی

آنکھوں سے حقیقت دیکھنا بھی چاہتے ہیں اور گواہی بھی چاہتے ہیں۔

چل رہے ہیں عشق کے بھی سلسلے
اور دکھوں کا بوجھ بھی ڈھوتے ہیں ہم
اس لیے میں نے محبت پہ محبت کی ہے
مچھلیاں دور نہیں رہتیں کبھی پانی سے
تجربات اتنے مسلسل جو کیے تو جانا
ہر محبت کے ظہور اپنی ہے تاثیر نئی
یہ جواب تیری محبت میں گرفتار ہوں میں
اس کا مطلب ہے کسی اور سے بیزار ہوں میں

ان مشاہدات اور تجربات کا بیان ہمارے عہد کے سچ کی تصویریں ہیں بقول قابل اجمیری:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

انسانی فطرت میں یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ مظاہر فطرت اور رازِ کائنات میں دلچسپی ہوتی ہے مگر شاعر فطرت اور کائنات کے رازوں میں دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی کھوج میں رہتا ہے۔ حقیقت سے آشنا ہونے کی جستجو میں لگا رہتا ہے اور پھر اپنی فکر اور مشاہدے سے کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے یہی جستجو اُسے نئے جہان سے روشناس کرواتی ہے اور اُس کے کلام میں امکانات پیدا ہوتے ہیں یہ احساس ہمیں ظہور چوہان کی غزل میں نظر آتا ہے ان کی فکر میں انسان، کائنات اور مظاہر فطرت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

موجود بھی ہوں چاروں طرف اور نہیں بھی ہوں
کیسے مجھے کرے گا کوئی مسترد یہاں
مرے خدا نے نوازا ہے فکر و فن سے مجھے
اُسے کہو! میں الگ راستہ بنالوں گا
مرے کریم! مجھے وہ ہنر عطا کر دے
میں جب مروں تو مجھے دنیا ڈھونڈتی رہ جائے
ایک دنیا مرے اطراف ہے آباد ظہور
گھر سے باہر مجھے جانے کی ضرورت نہیں

ظہور چوہان کا کلام اُن کے صاحب مطالعہ ہونے کا شاہد ہے انہوں نے میرؔ، آتشؔ، غالبؔ سے لے کر علامہ اقبال تک اور پھر اسی روایت سے وابستہ فراقؔ، فیضؔ، ناصر کاظمی سے فیض حاصل کیا ہے۔

غالب و آتش و اقبال ہیں پیرو مرشد
خونِ دل اُن کے ابھی تیر میں ڈوبا ہوا ہے

ماضی کے کئی اہم شعراء کی طرح ظہور چوہان بھی میر تقی میر کے خدائے سخن ہونے کا اعتراف اس انداز سے کر رہے ہیں۔

غالب و آتش و اقبال یا کوئی بھی ہو
عہد در عہد رہِ میر میں ڈوبا ہوا ہے

ظہور چوہان کی خاص لفظیات میں طرف، سینہ، گھر، کارواں، کمرے، زمین، روشنی، پرندے، یاد، محبت، خاک، ضرورت، دل وغیرہ ہیں شاعر نے ان لفظیات کو کہیں بطور استعارہ، کہیں تشبیہہ اور علامت کے طور پر استعمال کر کے نئے معنیٰ کشید کیے ہیں۔

رہتا ہوں میں زمین سے لپٹا ہوا مگر
اپنا مجھے سراغ ملا آسمان سے
کسی کی یاد تو مہکا کرے گی کمرے میں
میں چند پھول اگر کاغذی سجالوں گا
میں جو رہتا ہوں سرِ خاک اِدھر اور اُدھر
مرے تقسیم ہیں افلاک اِدھر اور اُدھر
مری لحد پہ جو آیا ہے اُس کی خدمت میں
محبتوں بھرا میرا سلام حاضر ہے

ظہور چوہان کی غزل میں تخلیقیت کا جوہر بھی ہے اور معنوی گہرائی بھی۔ اُن کے ہاں صرف تخیلات کا شہر آباد نہیں ہے بلکہ عصری تلخیاں بھی ہیں۔ اُن کی غزل فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے سبب نئے امکانات کا اشاریہ ہے۔

زمین پہ اپنے قدم میں جمانے والا ہوں
اس آسمان کو سر پر اٹھانے والا ہوں

ظہور چوہان کے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ ''ہجر اک مسافت ہے'' (۲۰۰۱) میں ''پسِ غبار اک ستارہ'' (۲۰۰۸) ''گونجتی صدا حویلی میں'' (۲۰۱۳) اور اب ''روشنی دونوں طرف'' (۲۰۱۸) میں منظر عام پر آ چکا ہے۔

ان شعری دستاویزات نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ظہور چوہان نے اپنے آپ کو دہرایا نہیں ہے اُن کا جو سفر ''ہجر کی مسافت'' طے کرنے کی نیت سے شروع ہوا تھا اس سفر میں غبار میں ستاروں پر کمندیں ڈالیں اور صدائیں (نظریات) بھی گونجیں اور اب وہ اس منزل پر آ پہنچے ہیں جہاں ''روشنی دونوں طرف'' نظر آ رہی ہے پھر نئی غزل سے مایوس ہونا ادبی کفر ہے۔

ہمیں نہ دفن کرو کچی پکی قبروں میں
ہم اہلِ علم ہیں مر کر بھی جو نہیں مرتے

۔ خوشی ۔

خوشی ہمیشہ چھوٹی چھوٹی بے لوث خدمتوں میں ملتی ہے لیکن لوگ اسے بڑے کاموں اور بڑی نیکیوں میں تلاش کرتے ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ

لوٹ پیچھے کی طرف

نازیہ پروین (فیصل آباد)

انسان کے خمیر میں حال کی نسبت، ماضی اور مستقبل کے حوالے سے تجسس واشتیاق نے مورخ، سائنس دان اور مخفی علم کے حامل افراد کو خاصا متحرک رکھا ہے۔ حال ہی میں ایک ڈاکومنٹری دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں دس لاکھ سال پہلے سیارہ مریخ پر انسانی زندگی کے آثار بتلانے کے بعد دو متحرک دھڑوں کے بیچ لڑائی اور ایٹمی مواد کے استعمال سے تباہی کا ذکر کیا گیا تو یہ مصرع خود بخود لبوں پر آ گیا:

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

جب ہم اپنے ماضی کے رہن سہن، بود باش اور رسوم ورواج کی بابت کھوج لگاتے ہیں تو ہمارا سفر تین سے چار ہزار سال ماضی کی اُور جا کر تھم سا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے آنے والے زمانوں میں مریخ کی طرح زمین کی قدیم ترین تاریخ بھی دریافت کر لی جائے یا اس دریافت کا سفر مزید فاصلہ طے کر لے۔ دنیا میں جن قدیم تہذیبوں کے آثار دستیاب ہیں اُن کی تعداد تین بتلائی گئی ہے۔ پہلی عراق اور شام کے بیچ ماسپوپیا جسے انگریزی میں Mesopotamia کہا جاتا ہے۔ یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب دریاؤں کی سرزمین ہے۔ یہ قدیم عربی تہذیب تین ہزار پانچ سو قبل مسیح میں بتلائی گئی ہے جس کی دریافت آج سے پانچ سو سال قبل ہوئی۔ جہاں Assyrians, Akkadians, Sumerians اور Babylonians نام کی قومیں یا قبیلے بستے تھے۔ اس قدیم تہذیبی ورثہ میں مختلف اقوام نے اپنے اپنے طریق پر دونوں دریاؤں کے پانی کو استعمال میں لاتے ہوئے انسانی زندگی کو آسودہ کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ کھیتی کے لیے ہل اور گاڑی کے پہیے بھی اُنہی کی ایجاد بتلائی گئی ہے۔ انتیس سو بیس قبل مسیح تک اس ملک کے شہروں کی تعداد پینتیس کے قریب ہو چکی تھی۔ سب کی اپنی فوج اور تنظیمی ادارے وجود میں آ چکے تھے۔ زیادہ تر فصلیں کھجور کے باغات، جَو اور دالیں وغیرہ پر مشتمل تھیں۔ تیئیس سو قبل مسیح میں سارگون نامی بادشاہ نے پورے Mesopotamia پر حکومت قائم کر لی۔ بائیس سو اناسی قبل مسیح میں سارگون کی موت کے بعد ایموریٹ نامی قوم نے اکیس سو قبل مسیح میں Mesopotamia پر حملہ کر دیا اور انیس سو قبل مسیح تک Mesopotamia تین بار تعمیر کے عمل سے گزرنے کے بعد اگلی دو صدی تک ایموریٹ قوم نے Mesopotamia پر حکومت کی۔ ایموریٹ کے دورِ حکومت میں قانون کی حکمرانی مثالی رہی۔ اس کے بعد ایکڈین کنگز کے ہاتھوں ایموریٹ پسپا ہونے لگے اور ایکڈین اور ایموریٹ کی جنگ مختلف شخصیات اور ادوار میں جاری رہی۔ آبپاشی کے حوالے سے وقت کے ساتھ اس جنگ میں شدت آتی گئی۔ لگ بھگ چھ سو قبل مسیح میں اُن کی زیرِ کاشت زمینوں کے قریب پہاڑیوں سے نکلنے والا کیمیائی مادہ پانی میں شامل ہو کر ان کے کھیتوں تک جا پہنچا جس کے تابکاری اثرات Mesopotamia کی تباہی کا سبب بنے۔

اب دنیا میں دریافت شدہ دوسری قدیم ترین تہذیب ہڑپہ کی جانب؟

پاکستان میں ساہیوال شہر سے 30 سے 40 کلومیٹر دور یہ دنیا کی دوسری قدیم ترین انسانی تہذیب وتمدن کا مسکن تھا۔ جو کہ ایک اندازے کے مطابق 3300 قبل مسیح میں ظہور پزیر تھی۔۔۔ دنیا کی تیسری قدیم ترین تہذیب اہرام مصر اور فراعین کا دور تھا جو کہ 3100 سال قبل مسیح میں موجود میں تھی۔

ہڑپہ شہر 1922 میں دریافت ہوا لیکن اسکی بہت ساری اینٹیں لاہور ملتان ریلوے بنانے میں صرف ہو چکی تھیں۔ اس جگہ کو بچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نیشنل جیوگرافک سوسائٹی بھی اس کام میں شامل ہے۔ برصغیر ہند میں 200 سے زائد تہذیبیں دریافت ہو چکی ہیں، لیکن ہڑپہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تہذیب ہے۔ یہاں کے باشندے تاجر اور زراعت پیشہ تھے جبکہ ہنرمند افراد کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ قدیم ہڑپہ کے آثار تقریبا ایک سو پینسٹھ ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جن کی دریافت حادثاتی طور پر 1890 میں اس وقت ہوئی جب لاہور سے ملتان ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی تو ریلوے ٹریک کیلئے اینٹوں کی سپلائی دینے والے ٹھیکیدار نے ہڑپہ میں اینٹوں کی کان دریافت کی ہوئی تھی اور یہاں سے اینٹیں لا کر ریلوے لائن کی تعمیر میں لگائی جاتی رہیں اور جب بعض افسروں نے اینٹوں کی مخصوص ساخت کو دیکھا اور تحقیق کی تو 1920 میں جا کر پتہ چلا کہ یہ اینٹیں ہڑپہ کے قدیم شہر کی تھیں چنانچہ 1920 میں ہی اس علاقے کو حکومتی تحویل میں لے لیا گیا۔ مگر تب تک قدیم تاریخ کا یہ جدید شہر اجڑ چکا تھا اور جب اس وقت کی حکومت نے یہاں پر کھدائی کا کام شروع کیا تو نامناسب حالات کی وجہ سے یہاں سے ملنے والے نوادرات کی حفاظت نہ ہو سکی۔

ہڑپہ کا رقبہ ایک سو پچاس ایکڑ ہے جس میں کھنڈرات تقریبا 76 ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پرانی تہذیب کا یہ خوبصورت شہر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ انمول چوڑی اینٹ کے بنے کشادہ مکانات وگلیاں اور بڑی چنائی والے کنوئیں، ڈھکی ہوئی نالیاں، نکاسی آب کا مربوط نظام، حفظان صحت کے اصولوں مدنظر رکھتے ہوئے اناج گھر، مزدوروں کے مکانات، ورک پلیٹ فارم، دھات پگھلانے اور ان سے برتن بنانے کی بھٹیاں، اوزان پیمائش کیلئے معیاری ترازو و باٹ مختلف بوٹیوں، مرجان، یاقوت سے بنے ہوئے ہار، تانبے اور پتھر کی مہریں، فن سنگ تراشی سے مختلف جانوروں کی تصویریں اور انجانے حروف سے کندہ شدہ مہریں مل چکی ہیں مگر دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ آج کا انسان چاند پر کمند تو ڈال چکا اور دنیا کی تباہی کیلئے سٹار وار سسٹم تو تیار کر چکا ہے دنیا بھر سے مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین آئے مگر ان انجانے حروف کو سمجھ نہ سکے اور پڑھنے سے قاصر رہے۔

ان حروف کو سمجھ لینا اب ان ماہرین کیلئے چیلنج بنا ہوا ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی ماہرین آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن، ڈاکٹر افضل احمد خان، ڈاکٹر محمد شریف، ڈاکٹر فرزند علی درانی، ڈاکٹر محمد رفیق مغل اور آئی ایچ ندیم پاکستان میں ہڑپہ تہذیب کی تقریبا 400 بستیاں دریافت کر چکے ہیں جس سے

ہڑپہ تہذیب کے مختلف ادوار میں ترقی کے مراحل کا پتہ چلتا ہے گزشتہ سال پانچ ہزار سال پرانا مگر جدید طرز کا ڈرین سسٹم دریافت ہوا۔تحقیق کے مطابق یہ قدیم دور کے نکاسی آب کے جامع نظام کی عکاسی کرتا ہے۔جبکہ موجودہ دور کا سیوریج سسٹم بھی ہڑپہ تہذیب کی نقل معلوم ہوتا ہے اس طرح ٹیلہ اے میں کھدائی کے دوران دوہری دیوار سے تعمیر شدہ بھٹیاں ملی ہیں۔یہ بھٹیاں سیاہ رنگ کی چوڑیاں اور مٹی کے چھوٹے ظروف پکانے کیلئے استعمال کی جاتی تھیں۔انہی بھٹیوں کے قریب رہائشی مکانات،غلہ جمع کرنے کے لئے قد آور مٹی کے بنے ہوئے مٹکے، موتی بنانے کے کارخانے،تانبہ کانسی اور سیپی کی چوڑیاں،زرد عقیق،سنگ سلیمانی سے بنے باریک ٹوکے،خوشنما مہریں،کچی اینٹوں سے بنی فصیل نما دیوار جو 27 فٹ اور بعض جگہ 39 فٹ چوڑی ہے اور پختہ اینٹوں سے بنا ہوا دروازہ بھی دریافت ہوا۔اس قلعہ نما دیوار کے اندر گشت کرنے کیلئے سڑک،نکاسی آب کیلئے پل،سکیورٹی چیک پوسٹ اور پہرے داروں کیلئے واچ ٹاور بھی ملے ہیں۔ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دیوار ہڑپہ شہر کو دشمن فوجوں کے حملے اور سیلاب سے محفوظ رکھنے کیلئے بنائی گئی تھی یوں اس دیوار کو دیوار چین کی طرح قدیم ترین فصیلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ہڑپہ چیچہ وطنی روڈ پر ان ویران ٹیلوں اور خوبصورت قدرتی جنگل کے دامن میں ایک پرکشش جاذب نظر اور خوبصورت عمارت میں ہڑپہ کا عجائب گھر ہے جس کے اندر دیواروں کے ساتھ بیس عدد شیشوں کی الماریوں میں کھدائی شدہ مقامات یعنی وادی سون،کوٹ ڈیجی،آمری،موہنجوداڑو اور ٹیکسلا سے ملنے والے نوادارت رکھے ہیں عجائب گھر کے مغرب میں تقریباً ایک ہزار سال پرانا برگد کا خوبصورت درخت لگا ہوا ہے اس کے تنے اور اس کے پھیلاؤ کو دیکھ کر سیاح اس کے سحر سے اتنا مرعوب ہوتے ہیں کہ وہ اس کی تصویر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔یہاں پر اکثر درختوں کی ٹہنیوں پر اہل نظر کے نام کندہ ہیں۔ہڑپہ شہر کے آثاروں کے درمیان ایک ٹیلے پر حضرت بابا نور شاہ ولی کا مزار مرجع خلائق ہے۔قبر کی لمبائی نو گز ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مناسبت سے یہ بابا نوگزہ کے نام سے معروف ہیں۔ایک روایت کے مطابق قدیم زمانے کے لوگوں کا قد طویل ہوتا تھا مگر یہاں سے دوران کھدائی برآمد ہونے والے انسانی ڈھانچوں کے قد وقامت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہڑپہ کے لوگوں کا قد بھی آج کے انسانوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ہڑپہ کے آثاروں کو اتنا نقصان انسانوں نے نہیں پہنچایا کہ جتنا اس کو نقصان اس زمین میں پائے جانے والے تھور اور نمک سے پہنچا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی مٹی اتنی بھربھری اور کھوکھلی ہو چکی ہے کہ جس کسی مٹی کے ٹیلے پر پاؤں رکھا جائے تو وہ اندر زمیں میں دھنس جاتا ہے ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق زمین میں پانچ سو مائیکروم نمک کی مقدار کسی چیز کو نقصان نہیں دیتی مگر ہڑپہ کی زمین میں تین ہزار مائیکروم سے بھی زیادہ نمک کی مقدار شامل ہے چنانچہ آثار کی باقیات کو محفوظ رکھنے کیلئے ان پر مٹی کا پلستر کیا جاتا ہے جو وہاں پائے جانے والے نمک کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور وقت کے ساتھ یہ مٹی کا پلستر جھڑ جاتا ہے اور پھر اس کی جگہ نیا پلستر کر دیا جاتا ہے۔بارش کی وجہ سے بعض جگہ مٹی میں غار نما اتنے گہرے کھڈے ہیں کہ ایک طرف داخل ہو کر دوسری طرف با آسانی نکلا جا سکتا ہے۔دریافت شدہ تیسری قدیم ترین تہذیب احرام مصر سے قریب ہر پڑھا لکھا شخص واقف اور اُس کے حوالے سے بہت کچھ جانتا ہے پھر بھی قارئین چہارسو نے اشتیاق ظاہر کیا تو اُس قدرتی عجوبے پر الگ نشست میں جستجو کی جائے گی۔

''سخن کدہ''

لائڈن (Leiden) ساؤتھ ہولینڈ Holland کا ایک مشور شہر ہے ۔اس شہر کے انتظامیہ نے دنیا کی مختلف زبانوں کے انسٹھ شاعروں کی نظموں پر مشتمل ایک انتھالوجی،ڈچ ترجمے کے ساتھ، شائع کی(Dicht op de LEIDENINGEDICHTEN murr 2:) اور ان کی نظموں کو شہر کی مختلف عمارتوں کی دیواروں پر منقش کیا۔ ان منتخب شاعروں میں لورکا،رامبو،بودلیر اور کیٹس کے ساتھ ناصر کاظمی بھی شامل ہیں۔ناصر اپنی زندگی میں خواہش کے باوجود ہالینڈ نہ جا سکے،مگر آج ان کی یہ غزل لائڈن کی ایک عمارت کی دیوار پر ثبت ہے۔

زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرز سخن کو ترسے گا

نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شراب کہن کو ترسے گا

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا

انہی کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبت ارباب فن کو ترسے گا

بدل سکو تو بدل دو یہ باغباں ورنہ
یہ باغ سایہ سرو و سمن کو ترسے گا

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

(ماخوذ از ہم سب)

ڈرامہ

پردہ اٹھاؤ

انل ٹھکر

(ممبئی، بھارت)

کردار

گلشن، ملہوترا، اقبال، مسز اقبال، روپا، فریدہ، گوپال، گریش

ڈائریکٹر گلشن اور اسٹیج منیجر ملہوترا گفتگو کرتے ہوئے تھیٹر میں سے گزرتے ہوئے اسٹیج پر سامنے کے حصے میں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ گلشن اسٹیج کے گرے ہوئے پردے کی اونچائی کو نظروں سے ناپتا ہے۔

گلشن: ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک نئی چیز کا کوئی نقش ٹھیک سے ذہن میں اُبھرتا نہیں میں تمہیں Settings یا کسی اور چیز کے لیے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

ملہوترا: پھر بھی آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا اس پر۔

گلشن: سوچا تو بہت ہے مگر۔۔۔(ہوا میں کچھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے) ایسے ہوا میں خوشبو کو پکڑنے کی کوشش کی ہے مگر ہاتھ کچھ نہیں لگا اب تک۔۔۔کوئی ڈھانچہ، تصور، کوئی نقش، اونہو کچھ بھی نہیں۔۔۔صرف محسوس کر رہا ہوں۔خوشبو کے وجود کو، بس۔۔۔کون کون آئے ہیں؟

ملہوترا: روپا کو چھوڑ کر، باقی سب۔

گلشن: خیر! پردہ اٹھاؤ۔

ملہوترا: (پکار کر) موتی لال۔

موتی لال: (اندر سے) آیا صاحب!

ملہوترا: آنے کی ضرورت نہیں۔ پردہ اُٹھاؤ۔

پردہ اٹھتا ہے۔اسٹیج پر چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہیں۔آرٹسٹ دو تین گروپس میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی سب کی توجہ گلشن اور ملہوترا کی طرف جاتی ہے۔کچھ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں کچھ بیٹھے رہتے ہیں۔

گلشن: (سب کو ایک نظر دیکھ کر) روپا نہیں آئی؟

گریش: اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔نہ جانے کیوں لیٹ ہو گئی۔

گلشن: (بیٹھتے ہوئے) یہ تو پُرانا قصّہ ہے روز کسی نہ کسی کے لیٹ آنے کا (آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہے)

گریش: آج آپ کوئی نیا اسکرپٹ لانے والے تھے۔۔۔

گلشن: ہاں!

گریش: تو ریڈنگ شروع کریں؟

گلشن: ریڈنگ! نہیں۔۔۔میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔

(تھیٹر کا دروازہ کھلتا ہے۔روپا اپنی سہیلی کے ساتھ داخل ہو کر اسٹیج کی جانب بڑھتی ہے)

اقبال: لو۔۔۔روپا بھی آ گئی۔

(سب اس طرف دیکھتے ہیں دونوں اسٹیج کا زینہ چڑھتی ہیں)

روپا: Sorry Sir, I am late today

گلشن: (آہ بھرتا ہے) That's all right۔آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جاؤ۔

روپا: (اپنی سہیلی سے) بیٹھو فریدہ! ارے ہاں، آپ سے میری سہیلی کا تعارف کرادوں، یہ ہے ڈاکٹر فریدہ۔میڈیکل میں Housemen Ship کر رہی ہیں۔ (فریدہ سے) یہ ہیں ہمارے ڈائریکٹر مسٹر گلشن، آپ ہیں مسٹر ملہوترا، آپ مسٹر گریش، مسٹر اقبال، مسز اقبال اور مسٹر گوپال۔

(فریدہ تعارف کے دوران سب سے کھل کر ہاتھ ملاتی ہے)

گلشن: ہاں تو، آج ہم نئے اسکرپٹ کی ریڈنگ کرنے والے تھے۔۔۔مگر میں اسکرپٹ نہیں لایا۔لے آنا میں بھولا نہیں قصداً نہیں لایا۔(خاموشی)۔۔۔ میرا خیال ہے آج ہم بغیر کسی اسکرپٹ کے پریکٹس کریں۔

مسز اقبال: یہ کیسے ممکن ہے؟

گلشن: ممکن نہیں تو ناممکن بھی نہیں ہے۔

گوپال: مگر کہانی، پلاٹ، مکالمے؟

گلشن: کہانی؟ آخر کہانی کیا چیز ہے؟ تم کہانی ہو سکتے ہو (اقبال کو ہلکی سی کھانسی آتی ہے) میں کہانی ہو سکتا ہوں۔اقبال کی یہ کھانسی کہانی ہو سکتی ہے۔لفظ کھانسی کو لے کر پلاٹ Develop کیا جا سکتا ہے۔وہی بات مکالموں کی تو ہو سکتی ہے۔شروع شروع میں زبان کو لے کر آپ کچھ پریشانی محسوس کریں مگر کوشش کرنے پر آپ کو زبان بھی مل جائے گی، زبان میں روانی اور رفتار بھی۔

(فریدہ اپنے پرس سے سگریٹ کا پاکٹ نکال کر سگریٹ جلاتی ہے پھر سگریٹ گلشن کو پیش کرتی ہے۔گلشن کا سگریٹ جلاتی ہے۔ دوسرے سگریٹ قبول نہیں کرتے صرف فریدہ کو حیرت سے دیکھتے ہیں)

گلشن: اس طرح آپ ذہنی اور جسمانی طور پر سیدھے اپنے کردار سے جُڑ جائیں گے۔اس کی خوشی اور غم کو جھیل سکیں گے۔اس کی ٹوٹتی، بکھرتی یا بنتی زندگی کو جی سکیں گے۔

گریش: تو؟

گلشن: تو آیئے۔۔۔ہم کسی لفظ یا جملے کو بنیاد بنا کر تعمیر شروع کر دیں۔

روپا: وہ لفظ یا جملہ کیا ہوگا؟

گلشن: لفظ یا جملہ؟ (فریدہ کو دیکھتے ہوئے) مان لو ایک لڑکی، جوان خوبصورت لڑکی، عمر بائیس، پچیس سال۔۔۔ایک دن اتفاقاً وہ اپنے والد سے ملتی ہے۔اس سے پہلے وہ کبھی نہیں ملے اور نا ہی اپنے رشتے سے واقف ہیں۔

(خاموشی۔۔۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ فریدہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے سوچ رہی ہے)

گلشن: ٹھیک ہے؟۔۔۔ روپا تم لڑکی کا اور اقبال تم باپ کا کردار کرو گے۔ باقی لوگ جیسے کہانی کا Development ہو اپنے آپ کو Adjust کر لیں۔

فریدہ: If you don't mind سر! کیا اس لڑکی کا رول میں کر سکتی ہوں؟

گلشن: (کچھ سوچ کر) ٹھیک ہے۔

گوپال: آپ نے پہلے کبھی ڈرامہ میں کام کیا ہے؟

فریدہ: کیا یہ ضروری ہے؟

گوپال: میرا مطلب ہے نئے آرٹسٹ کو۔۔۔

فریدہ: کم از کم مسٹر گلشن کے اس Experiment کے لیے جتنی میں نئی ہوں اتنے ہی آپ۔۔۔ از نٹ اِٹ؟

گلشن: ٹھیک ہے۔ اقبال، بنیادی جملہ ہے۔ نوجوان خوبصورت لڑکی، عمر بائیس سے پچیس سال۔ ایک دن اتفاقاً وہ اپنے والد سے پہلی بار ملتی ہے۔ کیوں؟ کب، کہاں اور کیسے ملنا چاہتے ہو؟

گریش: پہلے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ الگ کیوں، کیسے اور کس حال میں ہوئے تھے۔

اقبال: آپ کیا چاہتی ہیں ڈاکٹر فریدہ؟

فریدہ: میں؟ میرا خیال ہے کہ کیوں الگ ہوئے یہ طے کرنا آپ کا اور آپ کی بیگم کا کام ہے۔ میرا مطلب ہے میری ممی اور آپ کا۔ بنیادی جملے کے مطابق ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔

گلشن: (چٹکی بجا کر) Correct۔ بات آگے بڑھاؤ فریدہ کہو کب، کہاں اور کس حال میں ملے تم دونوں؟

فریدہ: گلشن صاحب! آپ نے اپنے جملے میں لفظ اتفاقاً استعمال کیا ہے۔

گلشن: صحیح ہے۔

فریدہ: یعنی کہ آپ نے ہمیں اتفاقاً ملنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔

گلشن: ہاں

فریدہ: تو مان لیجیے میری ممی نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ میری ممی اور ڈیڈی کے الگ ہونے کے اُن کے اپنے وجوہات ہوں گے۔ وہ الگ ہیں ایک دوسرے سے پھر بھی وہ سوسائٹی سے جڑے ہوئے ہوں گے۔ ویسی صورت میں ہمارا ملنا سوسائٹی کی بدولت ہو تو بہتر ہوگا۔

گلشن: بات واضح نہیں ہو رہی۔

فریدہ: مان لیجیے Mr. X کے وہاں شادی ہے۔ وہ ہمارے رشتے میں ہیں Mr. X کے لیے تو دونوں رشتے دار ہیں اس لیے شادی کی دعوت دونوں کو دے گا۔

ملہوترا: واہ بھئی واہ۔

گلشن: ٹھیک ہے۔ پھر؟

فریدہ: وہاں شادی میں میں بھی ممی کے ساتھ شریک ہوں اور ڈیڈی بھی۔

گوپال: پھر؟

فریدہ: پھر میرے پاس لکھی لکھائی کہانی تھوڑی ہی ہے جو سب پوچھے جا رہے ہو۔

گوپال: چنانچہ ملنے کا اتفاق شادی۔

فریدہ: ویسا ہی سمجھ لو۔

گلشن: باپ بیٹی کس ذات سے ہیں؟

گریش: ذات سے کیا مطلب ہے؟

گلشن: مطلب ذات سے نہیں ذات کے رسم و رواج سے ہے۔ رسم و رواج شادی کے رسم و رواج۔ جہاں وہ اتفاقاً ملتے ہیں وہاں کا ماحول۔

فریدہ: مان لیجیے وہ مسلم ہیں۔

مسز اقبال: ہمارے یہاں شادی بیاہ میں عورتیں ڈھولک پر گیت گاتی ہیں۔ اُس ہجوم میں اکثر ڈھولک بجانے ایک خواجہ سرا بھی رہتا ہے۔ ان سب کو اس وقت کہاں سے لاؤ گے؟

فریدہ: Just imagin ڈھولک بج رہی ہے، عورتیں خواجہ سرا سے ٹھٹولی کرتے ہوئے گا رہی ہیں۔ کچھ سہیلیاں دلہن کو بنا سنوار رہی ہیں۔

گلشن: اتنے میں یکایک دلہن بے ہوش ہو جاتی ہے۔ گانا بند، خواجہ سرا ہائے اللہ کہتے ہوئے مردانے میں خبر کرنے بھاگتا ہے، دلہن کا باپ اپنے ایک دوست کو جو ڈاکٹر ہے لے کر آتا ہے بس آگے بحث بند کام شروع۔ کم اَن اسٹارٹ۔

فریدہ: روپا! تم دلہن بن جاؤ

(روپا مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھتی ہے)

گلشن: سب لوگ اندر چلے جاؤ۔ گریش تم دلہن کے باپ بن جاؤ۔ میں سامنے بیٹھتا ہوں۔

(گلشن تھیٹر میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

گلشن: (پکار کر) ملہوترا۔

ملہوترا: (اندر سے) کیوں۔ کیا ہے؟

گلشن: ذرا ٹیپ ریکارڈر چالو کر دینا۔ مکالمے ٹیپ کرنے ہیں۔ Lights بھی ہو سکے تو Adjust کرتے رہنا۔

ملہوترا: (اندر سے) اچھا۔

گلشن: فریدہ! ناؤ اسٹارٹ۔

(فریدہ روپا کو دیوان پر بٹھاتی ہے۔ پلّو اس کے سر پر رکھ کر گلشن کی جانب پلٹتی ہے)

فریدہ: گلشن صاحب! اب Imagin کیجیے ڈھولک بج رہی ہے۔ گیت۔۔۔ چھیڑ چھاڑ۔۔۔ (پیچھے سے ڈھولک پر گیت، عورتوں کے ہنسنے اور چھیڑ

چھاڑ کرنے کی آوازیں ابھرتی ہیں۔فریدہ دلہن کوسجانے کی اداکاری کرتی ہے۔اتنے میں دلہن بے ہوش ہوجاتی ہے۔گانابند،خواجہ سراہائے اللہ کہتے ہوئے بھاگتاہے)

عورتوں کی آوازیں: ہائے اللہ کیا ہو گیا دلہن کو؟ چڑیل کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہی ہو، پانی لے آؤ۔

عورت: پیاز لے آؤ پیاز۔

دوسری عورت: جوتا سنگھاؤ جوتا۔

فریدہ: (جیسے اس اطراف بھیڑ ہو) کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوا۔تم لوگ ہٹ کر ٹھہرو، ہوا آنے دو۔

(فریدہ دلہن کی آنکھیں اور نبض دیکھتی ہے۔دلہن کا باپ اپنے دوست کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

فریدہ: انکل،گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

باپ: مگر نجمہ کو ہُوا کیا ہے؟

فریدہ: کچھ نہیں۔کبھی کبھی لڑکیوں کو ایسے وقت پر غش آجاتا ہے۔

باپ: (اپنے دوست سے) تم بھی ذرا دیکھ لو۔(فریدہ سے) بیٹے یہ بھی ڈاکٹر ہیں۔

(فریدہ اٹھتے ہوئے آداب کرتی ہے۔ڈاکٹر دلہن کی نبض دیکھتا ہے)

باپ: اسلم، نجمہ کو جلدی ہوش میں لانے کا انتظام کرو، دولہے کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔

اسلم: اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟

باپ: نہیں، کبھی نہیں۔

اسلم: ہوں (فریدہ سے) تم ڈاکٹر ہو؟

فریدہ: جی

اسلم: کیا دینا ہے پیشنٹ کو؟

فریدہ: اب تو آپ ہیں نا۔

اسلم: میں تو ہوں ہی مگر یہ پیشنٹ تمہارا ہے۔پہلے تم نے اُسے دیکھا ہے۔

فریدہ: میں تو ابھی۔۔۔

اسلم: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔(دلہن آنکھیں کھولتی ہے)

فریدہ: نجمہ۔۔۔اب جی کیسا ہے؟

نجمہ: اب آرام ہے (اسلم سے) آداب انکل۔

باپ: کیسی ہو اب؟

نجمہ: اچھی ہوں ڈیڈی۔

اسلم: اسے ہوا ہی کیا ہے جو پوچھے جا رہے ہو کیسی ہو؟ جاوید تم ذرا کاغذ لا دو۔نجمہ! جاؤ بیٹے کچھ دیر آرام کرلو۔

(باپ، بیٹی دونوں جاتے ہیں)

اسلم: کیا نام ہے تمہارا؟

فریدہ: فریدہ

اسلم: پریکٹس کرتی ہو؟

فریدہ: جی نہیں

اسلم: اوہ۔سروس میں ہو۔

فریدہ: جی نہیں۔ابھی تو میں Housemen Ship کر رہی ہوں۔

اسلم: اچھا، اچھا۔مگر باتیں تو بڑے ڈاکٹروں جیسی کرتی ہو۔

فریدہ: جی؟

اسلم: ابھی ابھی تو تم نے کہا نا کہ کبھی کبھی لڑکیوں کو ایسے وقت پر غش آجاتا ہے۔(دونوں ہنستے ہیں)۔۔۔آگے کیا ارادہ ہے؟ MD?... MS? کیا کرنے جا رہی ہو؟

فریدہ: ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔

اسلم: کیوں؟ اور آج کل صرف M.B.B.S سے کیا ہوتا ہے؟

فریدہ: امّی سے پوچھنا ہوگا، وہ اجازت دیں گی تو۔۔۔(جاوید داخل ہوتا ہے۔کاغذ فریدہ کو دیتا ہے۔فریدہ دوا کا نام لکھتی ہے)

اسلم: کس کی بیٹی ہو؟

فریدہ: عائشہ بیگم میری۔۔۔

اسلم: میرا مطلب تمہارے والد سے تھا۔

فریدہ: (کچھ پریشان سی ہوکر) جی۔۔۔وہ۔۔۔وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔

اسلم: (مسکراتے ہوئے) کیوں ڈاکٹروں کے نام نہیں ہوتے۔

(فریدہ پریشان سی جاوید کی طرف دیکھتی ہے۔جاوید زوروں سے قہقہہ لگاتا ہے)

اسلم: کیوں، تم کیوں ہنس رہے ہو؟

باپ: ہنسنے کی تو بات ہے (اسلم اُلجھن سی محسوس کرتا ہے) جب، تم خود اپنی اولاد سے پوچھ رہے ہو کہ تمہارے باپ کا نام کیا ہے تو ہنسی نہیں آئے گی؟ (اسلم، فریدہ چونکتے ہیں)

اسلم: کیا بک۔۔۔

باپ: بک نہیں رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

اسلم، فریدہ: کیا!!

باپ: اسلم، ہو سکے تو اپنی اہلیہ کا نام یاد کرنے کی کوشش کرو۔

اسلم: (بڑبڑاتے ہوئے) عائشہ۔

باپ: (قہقہہ لگا کر) چلو کم از کم نام تو یاد ہے۔۔۔اچھا، مجھے ابھی دوائی منگوانی ہے (جاتا ہے)۔(اسلم اور فریدہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں ان کے چہرے پر کئی تاثرات آتے جاتے ہیں)

فریدہ: آپ۔۔۔ڈاکٹر آپ۔۔۔اوہ I mean .... Sorry ڈیڈی۔

(اسلم کی بانہیں خود بخود پھیل جاتی ہیں۔فریدہ بھاگ کر اس سے لپٹ جاتی ہے)

فریدہ: اوہ ڈیڈی۔

اسلم: (جذباتی ہو کر) ہاں بیٹے۔۔۔(خاموشی) بیٹے، انسان کی خواہشیں جب پوری نہیں ہوتیں تو وہ خواب دیکھنے لگتا ہے۔ مگر جس کے خواب حقیقت بن کر اس کی بانہوں میں سمٹ آئیں وہ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے۔

فریدہ: (الگ ہوتے ہوئے) مگر وہ کتنا بدنصیب ہوتا ہے جس کے خواب اور خواہشیں اس کی آنکھوں کے صحرا میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اسلم: اب ہم تمہیں مل گئے ہیں نا تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے۔

فریدہ: آپ ملے ہیں تو بھی کب؟ جبکہ میں آپ سے لاڈ بھی نہیں کر سکتی، گڑیا یا لولی پاپ کے لیے ضد نہیں کر سکتی، روٹھ نہیں سکتی، آپ کو گھوڑا بنا کر بیٹھ نہیں سکتی۔

اسلم: (مسکرا کر) کیوں بیٹھ نہیں سکتی؟ کس نے منع کیا ہے؟

فریدہ: اس کے لیے وہ عمر چاہیے جسے میں بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔

اسلم: اولاد والدین کے لیے ہمیشہ بچہ ہی رہتی ہے، بیٹے۔

فریدہ: ہاں، مگر بچہ اپنے آپ کو بچہ نہیں سمجھ سکتا۔۔۔ڈیڈی۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میرے بچپن کو کیوں اس کے لڑکپن سے محروم کر دیا گیا؟

اسلم: بیٹے، جی ہوئی زندگی کو اگر پھر سے جیا جا سکتا تو میں تمہیں تمہارا بچپن اور اس کا لڑکپن پھر سے لا دیتا۔

فریدہ: جی ہوئی زندگی کو پھر سے جیا تو نہیں جا سکتا مگر اس کی جگالی کر کے اپنے جئے پر غور تو کیا جا سکتا ہے۔

اسلم: اس سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

فریدہ: کیوں نہیں ہو سکتا؟

اسلم: جو جینے کے وقت حاصل نہیں ہوا وہ اس کی جگالی میں ملے گا؟

فریدہ: ہاں، جینے کے وقت ہم ایک قسم کی جلدی میں رہتے ہیں۔ ایک ساتھ کتنا کچھ سمیٹ لینے کی بھوک رہتی ہے ہم میں۔ اور وہ بھوک ہمیں خود غرض بنا دیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ خود غرضی ہمارے چہروں پر کئی چہروں کی پرتیں چڑھاتی ہوئی ہماری بھوک کو برگد کے پیڑ کی مانند پھیلا دیتی ہے۔ تب لاکھ کوشش کرنے پر بھی ہمیں ہمارا اصلی چہرہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔

اسلم: ہو سکتا ہے، تمہارا کہنا سچ ہو مگر اب کوئی بھوک باقی نہیں رہی مجھ میں۔ جتنا کچھ سمیٹنا تھا سمیٹ لیا ہے میں نے۔

فریدہ: پھر بھی بہت کچھ چھوٹ گیا ہے آپ سے۔

اسلم: مجھے اس کا غم نہیں۔

فریدہ: نہیں ہو سکتا، کیونکہ آپ نے کافی کچھ سمیٹ لیا ہے۔ مگر اُن کو جنہیں آپ نے کتنا کچھ سمیٹ لینے کی جلدی میں نظر انداز کر دیا ہے اُن میں، میں بھی ہوں اور امّی بھی۔ غم ہے کہ میرے بچپن کو اُس کے لڑکپن سے محروم کر دیا گیا اور میرا بچپن دوسرے بچوں کو مجھے اپنے باپ کی بانہوں میں جھولتا دیکھ کر آہیں بھرتے بھرتے مجھ سے دُور سے دُور تر ہوتا چلا گیا اور امّی۔۔۔(آہ بھر کر) میں نے جب بھی اُن کی ویران آنکھوں میں اُن کے غم کو سسکتے سُنا ہے تو لگتا تھا جیسے صحرا کے سناٹوں میں ہوائیں سسکیاں لے رہی ہیں۔

اسلم: ہاں، دیکھا ہو گا تم نے ویسا کچھ اُن کی آنکھوں میں۔ کیونکہ وہ آنکھیں ہر دم تمہارے قریب رہی ہیں۔ اور جب ہم ایک چیز کے ہر دم قریب رہتے ہیں تو اس سے ایک اپنا پن، ایک لگاؤ سا ہو جاتا ہے۔۔۔اور جو ہمیشہ ہم سے دور رہا ہو، جس کے لیے ہم نے صرف سُنا ہو۔۔۔

فریدہ: مگر دیکھا کبھی نہ ہو اسے دیکھنے کا ہمارا تجسس۔۔۔

اسلم: بڑا شدید ہوتا ہے وہ تجسس، مگر اس تجسس کا سبب وہ باتیں ہوتی ہیں جو ہم نے اس کے بارے میں سُنی ہوتی ہیں۔ تم نے بھی کچھ سُنا ہو گا بہت کچھ میرے بارے میں کچھ۔۔۔کچھ اپنی امّی سے، کچھ دیگر لوگوں سے، تم نے ایک تصویر بنائی ہو گی اپنے ذہن میں میری۔ ایک کردار اُبھرا ہو گا تمہارے ذہن میں میرا۔

فریدہ: جی۔

اسلم: مگر سُنی سنائی باتوں سے ذہن میں اُبھرا ہوا کردار یا تو فرشتوں جیسا ہوتا ہے یا شیطانوں جیسا، بہر حال میرا کردار تمہارے ذہن میں جیسا بھی اُبھرا ہے حقیقت سے اس کا میل نہیں جم سکتا۔

فریدہ: آپ بیکار میں شک کر رہے ہیں امّی پر۔ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا آپ کے بارے میں۔

اسلم: تم نے کبھی کچھ پوچھا نہیں ہو گا۔

فریدہ: دو ایک بار جاننے کی کوشش کی تھی مگر۔۔۔

اسلم: جاننے کی کوشش کرنا اور پوچھنا، بڑا فرق ہوتا ہے دونوں میں۔

فریدہ: اُن کی پتھرائی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کوئی بھی ان سے ایسی بات پوچھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

اسلم: آنکھیں وہ آنکھیں (فریدہ کے سامنے آ کر ٹھہرتا ہے) دِکھتا ہے کچھ ان آنکھوں میں۔۔۔؟ نہیں دِکھتا نا کچھ بھی؟ نہیں دِکھے گا کیونکہ۔۔۔کیونکہ ان آنکھوں نے ایسی چھٹپٹاہٹ اور کرب کو جھیلا ہے، جس کا اندازہ دوسرے نہیں لگا سکتے، نہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے وہ چھٹپٹاہٹ آہستہ آہستہ سرد پڑ کر برف کی طرح جم گئی ہے۔۔۔اب اگر میری اس عمر میں تم اپنے سہارے کی آنچ دے کر اسے پگھلا دو تو ان میں جنبش پیدا ہو سکتی ہے۔۔۔اور پھر میرا سمیٹا ہوا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔۔۔میرا اتنا بڑا نرسنگ ہوم ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے تم بھی ڈاکٹر ہو۔۔۔آ کر سنبھال لو اپنا نرسنگ ہوم۔

فریدہ: ڈیڈی آپ۔۔۔

اسلم: ہاں بیٹے، آ جاؤ ہمارے پاس۔ عمر بھر سمیٹتے سمیٹتے آج پہلی بار تمہیں دیکھا تو تھکان سی محسوس کر رہا ہوں۔

فریدہ: آپ ملے اُن سے؟

اسلم: کس سے؟

فریدہ: امّی سے۔

اسلم: اوہ۔۔۔وہ بھی آئی ہیں؟

گلشن: (کرسی سے اُٹھ کر) No...No۔۔۔Subject بدل گیا (اسٹیج پر آ کر) بات کا رُخ ہی بدل دیا آپ لوگوں نے۔۔۔ مجھے لگتا ہے، اب امّی کی Entry ہونی چاہیے (پکار کر) امّی (مسز اقبال داخل ہوتی ہے) امّی، اب تمہاری Entry ہونے دو۔

مسز اقبال: مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

گلشن: ڈر کس بات کا؟

گلشن: کیوں اتنی دیر یہ لوگ کیا بولتے رہے؟ Just Continue it.

مسز اقبال: پھر بھی۔

گلشن: تو پھر بھی Involve yourself۔۔۔اقبال تمہارا آخری ڈائیلاگ پھر سے کہو۔

اقبال: اوہ، وہ بھی آئی ہیں؟

گلشن: نہیں، یہ نہیں۔وہ۔۔۔سرد پڑے برف کی مانند جم گئی ہیں۔

اقبال: (یاد کرتے ہوئے) آنکھیں۔۔۔وہ آنکھیں (فریدہ کے سامنے آ کر) ان آنکھوں میں دیکھو کچھ دِکھتا ہے؟ نہیں دِکھتا نا کچھ بھی؟ نہیں دِکھے گا۔ یہاں کچھ بھی نہیں نہ ہوائیں، نہ سناٹے، نہ سسکیاں، کچھ بھی نہیں۔تم ان آنکھوں کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتی کہ ان آنکھوں نے کیسی چھٹپٹاہٹ اور کرب کو جھیلا ہے۔اور پھر وہ چھٹپٹاہٹ کیسے آہستہ آہستہ سرد برف کی مانند جم گئی ہے۔۔۔اب اگر میری اس عمر میں تم اپنے سہارے کی آنچ سے اسے پگھلا دو تو ان میں پھر سے جنبش پیدا ہو سکتی ہے۔۔۔اور پھر میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔اتنا بڑا نرسنگ ہوم ہے۔۔۔اللہ کے فضل و کرم سے تم بھی ڈاکٹر ہو، آ کر سنبھال لو اُسے۔

گلشن: Come on امّی۔

امّی: (داخل ہوتے ہوئے) فریدہ دوا آ گئی۔۔۔(اسلم کو دیکھ کر، جس کی پیٹھ امّی کی طرف ہے۔امّی بھی پیٹھ پھیر کر ٹھہر جاتی ہے) بھائی جان بلا رہے ہیں تمہیں۔

(فریدہ جاتی ہے۔امّی بھی اس کے پیچھے روانہ ہوتی ہے)

گلشن: امّی کو روکو اقبال۔

اسلم: سنو۔

(امّی رکتی ہے۔گلشن اسٹیج سے نیچے اُتر کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے)

اسلم: پہچانا نہیں مجھے؟

(امّی مڑ کر دیکھتی ہے۔کچھ دیر اسلم کو دیکھ کر)

امّی: کبھی جس کی صورت دیکھ کر بھی پہچان نہیں سکی تھی اسے آج اس کی پیٹھ دیکھ کر کیسے پہچانتی؟ (خاموشی)

اسلم: فریدہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔(خاموشی) میں نے اسے پہچانا ہی نہیں (خاموشی) کیسے پہچانتا؟ میں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔(خاموشی) وہ تو جاوید نے۔۔۔(امّی کی صورت دیکھ کر چپ ہو جاتا ہے)۔۔۔تم نے میرے بارے میں اسے کبھی بتایا نہیں؟

امّی: کیا بتاتی؟

اسلم: یہی کہ۔۔۔

امّی: بتا دینے سے آج وہ تمہیں پہچان لیتی؟

اسلم: ویسے نہیں۔

امّی: تو پھر؟

اسلم: ابھی میں نے اس سے پوچھا کہ کس کی بیٹی ہو تو اس نے تمہارا نام۔

امّی: کیوں وہ میری بیٹی نہیں ہے؟

اسلم: ہے۔

امّی: تو اس نے کیا غلط کہا؟

اسلم: جو کہنا چاہیے، وہ نہیں کہا۔

امّی: وہ چھوٹی نہیں ہے۔کیا کہنا چاہیے سمجھ سکتی ہے۔

اسلم: وہ بچی ہے۔بچوں میں سمجھ سکھانے سے آتی ہے۔

امّی: بچے گھر کی بہ نسبت باہر زیادہ سیکھتے ہیں۔کیونکہ ان کا زیادہ تر وقت باہر گزرتا ہے۔

اسلم: اس نے جو جواب مجھے دیا وہ باہر کا چلن نہیں ہے۔

امّی: چلن بدل بھی تو سکتے ہیں۔

اسلم: تم بیکار بحث کر رہی ہو۔

امّی: سنو کہہ کر روکا تھا تم نے، ورنہ میں تو جا رہی تھی۔

اسلم: فریدہ کو دیکھا تو لگا وہ بڑی ہو گئی ہے۔اس لیے۔۔۔

امّی: یہی کہنے روکا تھا مجھے؟

اسلم: ہاں

امّی: اچھی طرح احساس ہے مجھے اس کا، میں اس کی ماں ہوں۔

اسلم: تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں اس کا باپ ہوں۔

امّی: چلو غنیمت ہے۔

اسلم: کیا؟

امّی: تم اقبال تو کرتے ہو کہ تم اس کے باپ ہو۔

اسلم: کیا مطلب؟

امّی: بیوی سے جدا رہنے والے شوہر اکثر ایسی باتوں سے مکر جاتے ہیں۔

اسلم: میں کیا اتنا گرا ہوا ہوں؟

امّی: یہ سوال کس سے پوچھ رہے ہو؟ مجھ سے؟

اسلم: ہاں تم سے۔
امّی: کبھی یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ کر دیکھا ہوتا۔
اسلم: کہنا کیا چاہتی ہو؟
امّی: تو سمجھ میں آ جاتا کہ جو کبھی اس بلندی تک اٹھا ہی نہیں، کسی کی نظروں سے اس کے گرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔
اسلم: میں اپنے متعلق تمہاری رائے جاننا نہیں چاہتا۔ میں فریدہ کو لے کر بات کر رہا ہوں۔
امّی: کیا چاہتے ہو؟
اسلم: تم نے اس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟
امّی: تمہیں اس سے کیا واسطہ؟
اسلم: میرا اُس سے خون کا رشتہ ہے۔
امّی: وہ ایک اتفاق ہے۔
اسلم: اتفاق ہی سہی مگر رشتہ تو ہے۔
امّی: جس رشتہ کا نعرہ تم آج لگا رہے ہو وہ تمہارا رشتہ اس سے تب سے ہے۔ جب کہ وہ میرے پیٹ میں ایک شکل اختیار کر رہی تھی۔ وقت کی تپتی سڑک پر رینگتے ہوئے میں نے اسے ڈاکٹر نہ بنایا ہوتا تو کیا تم یہ نعرہ بلند کرتے کہ تمہارا اُس سے خون کا رشتہ ہے؟ اگر آج اس کا تعارف تم سے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے نہ ہو کہ ایک گنوار، ان پڑھ، جاہل کی صورت میں ہوتا تو کیا تم اس کے مستقبل کے لیے اتنے فکر مند ہوتے؟ آج جب اس کی زندگی ایک تراشا ہوا خوبصورت پیکر بن کر تمہارے سامنے آئی تو تم نے کہہ دیا۔ فریدہ بڑی ہو گئی ہے۔ مگر تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ بڑی کیسے ہو گئی؟ اس پیکر کو تراشنے کے دوران میری انگلیوں سے کتنی بار خون ٹپکا اور ہاتھ میں کتنے چھالے پڑے۔
اسلم: اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اس کے لیے کافی زحمت اٹھائی ہو گی مگر اب آگے کیا؟ اب وہ بڑی ہو گئی۔۔۔
امّی: مت دہراؤ بار بار اسی بات کو۔ اس کے بڑے ہونے کا خیال ہی کتنا خوفناک ہے میرے لیے۔ میرا بس چلتا تو میں اس کی عمر کو کبھی اپنی گود سے نیچے اترنے نہ دیتی۔
اسلم: تم جذباتی ہو کر باتیں کر رہی ہو۔
امّی: یہ میرے احساسات ہیں۔ اتنے سالوں کی میری کُل پونجی۔
اسلم: اس ڈھنگ سے سوچنا اس کی ترقی کی راہوں کو بند کر دے گا۔
امّی: اس کا بھلا بُرا سوچنا میرا کام ہے۔
اسلم: بڑا فخر ہے تمہیں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانے پر؟
امّی: کیوں نہ ہو؟ وہ میری کوکھ کے درد سے ان ہاتھوں کے چھالوں تک کی تخلیق ہے جسے میں نے اپنی آہوں کی نمی سے زندگی کے صفحات پر اُتارا ہے۔
اسلم: میں نے تمہاری تکلیف کا حال دوسروں کی زبانی سنا ہے۔
امّی: یہ خبر کی جانکاری ہے۔ درد کی پہچان کا علم نہیں۔
اسلم: تو کیا میں نے درد کو دیکھا نہیں؟
امّی: دیکھا ہوگا، مگر جھیلا نہیں۔
اسلم: تم کیا سمجھتی ہو؟ میں شادمانیوں سے گھرا ہوا ہوں؟
امّی: کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟ سب ہی کچھ تو ہے۔
اسلم: باوجود اس کے ایک ادھورا پن اوڑھے جی رہا ہوں۔ کچھ کمی سی محسوس کر رہا ہوں، ہر جگہ، ہر چیز میں۔
امّی: یہاں ہر کسی کو کسی کچھ کی تلاش ہے۔
اسلم: مگر میرا تو سب کچھ میرے پاس تھا۔ نہ جانے کیسے بکھر گیا۔
امّی: بکھری ہوئی چیز کو تم نے کبھی پھر سے سمیٹنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔
اسلم: کرتا ہوں، تو پارے کی طرح چٹکی میں آنے سے پہلے ہی بکھر بکھر سی جاتی ہے۔
امّی: چٹکی سے نہیں، اپنے احساسات کی پلکوں سے سمیٹنے کی کوشش کر کے دیکھو۔ (خاموشی)
اسلم: میں تمہیں کبھی سمجھ نہیں پایا۔
امّی: سمجھنے کی کبھی کوشش بھی کی تھی؟
اسلم: کوشش تو کی مگر۔۔۔
امّی: تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟
اسلم: کیسے ہوا؟ نہیں معلوم کیسے ہوا۔۔۔ مگر ہوا۔
امّی: سارا قصور میرا ہی تھا؟
اسلم: قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔
امّی: پھر یہ ادھورا پن اوڑھے کیوں جی رہے ہیں، ہم؟
اسلم: شاید ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔
امّی: اس لفظ سے دل کو بہلایا جا سکتا ہے مگر ذہن۔۔۔
اسلم: ہاں۔ شاید ٹھیک کہہ رہی ہو تم (خاموشی)
امّی: کیا سوچ رہے ہو؟
اسلم: کاش، اس وقت ویسا نہ سوچا ہوتا تو۔۔۔
امّی: کیا سوچا تھا؟
اسلم: تم اَن پڑھ ہو، گنوار ہو۔
امّی: اور؟
اسلم: کیسے نبھے گی؟ چار پڑھے لکھے لوگوں میں تمہیں لے کر کیسے۔۔۔
امّی: یہی سوچ کر تم مجھے چھوڑ کر چل دیئے تھے؟
اسلم: میں نے کہا بھی تھا یہ۔۔۔
امّی: دوسروں سے۔۔۔
اسلم: سب تمہارے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔

امّی: سب نہیں، بہانہ۔
اسلم: بہانہ۔
امّی: ہاں، سچ بولنے کی ہمت تم میں اُس وقت تھی، نہ آج اس عمر میں ہے۔
اسلم: میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟
امّی: سراسر۔
اسلم: پھر سچائی کیا ہے؟
امّی: کتنے بزدل ہو۔
اسلم: سب بتاؤ۔
امّی: تم نے مجھے اَن پڑھ سمجھ کر نہیں ٹھنڈی سمجھ کر چھوڑا تھا۔
اسلم: عائشہ
امّی: خدا کے لیے مت بلاؤ مجھے اس نام سے۔
اسلم: میں تمہارا شوہر ہوں۔
امّی: مجھے یاد ہے۔
اسلم: اور تم میری بیوی ہو۔
امّی: یہ میری مجبوری ہے۔
(کینٹین کا لڑکا چائے کی کیتلی اور آٹھ دس کپ لئے ہوئے زینے سے ہوتا ہوا اسٹیج پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)
اقبال: (لڑکے کو دیکھ کر) دھت تیرے کی، تو اس وقت یہاں کہاں سے آ ٹپکا؟
مسز اقبال: خوب موقع پر آیا ہے۔
گوپال: (اندر سے) چائے آ گئی، چلو باہر آ ؤ (اسٹیج پر آ کر) اب ریہرسل بعد میں کر لینا پہلے چائے پی لی جائے۔ آیئے گلشن صاحب۔
(گلشن کرسی سے اُٹھ کر اسٹیج پر آ تا ہے۔ اقبال، گریش اور ملہوترا سگریٹ جلا کر ایک طرف باتیں کرتے ٹھہرے ہیں۔ فریدہ اور روپا دوسری طرف باتوں میں مصروف ہیں)
مسز اقبال: میں تو تھک گئی گلشن صاحب۔ آئندہ ایسے ڈرامہ سے میری توبہ۔
گلشن: کیوں؟ اتنا اچھا Tempo تو جمایا تھا تم لوگوں نے۔
مسز اقبال: دماغ کی رگیں پھٹنے کی تیاری میں ہیں۔ اوہ۔۔۔ باپ رے سمجھ میں نہیں آ تا اتنی دیر کیسے بولتی رہی میں۔ (اب روشنی اقبال، گریش اور ملہوترا پر تیز ہوتی ہے۔ وہ باتیں کرتے سنائی پڑتے ہیں)
ملہوترا: میں نے نہیں سوچا تھا، کہ ڈرامہ اتنا جمے گا۔
گوپال: (چائے کا کپ لئے) واہ۔۔۔ اس نئی لونڈیا نے تو کمال کر دیا، یار۔
اقبال: کیا خاک کمال کیا اس نے، ڈیڈی ڈیڈی کہتے ہوئے ایسے لپٹ گئی کہ اپنے تو چھکے چھوٹ گئے۔
گوپال: کچھ بھی ہو یار، مجھے تو Born Artist لگتی ہے۔
گریش: کمال یہ ہے کہ نئی ہوتے ہوئے بھی کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔
اقبال: مگر میرا تو باجا بجا دیا یار۔ اب بھی پسینہ آ رہا ہے۔
گوپال: خوش نصیب ہو میاں۔ ہمیں ایسا موقع کبھی نہیں ملا۔
گلشن: ملہوترا۔
ملہوترا: (جاتے ہوئے) آیا۔ (روشنی گلشن اور ملہوترا پر تیز ہو جاتی ہے دوسروں پر کم)
گلشن: ریکارڈنگ ٹھیک ہو رہی ہے؟
ملہوترا: بالکل
گلشن: کیسا رہا تجربہ؟
ملہوترا: بہت ہی بڑھیا۔ مجھے ایسی امید نہ تھی۔ شاید تھوڑا Edit کرنا ہوگا۔
گلشن: کر لیں گے (مسز اقبال سے) میڈم، مگر Climax بڑھیا ہونا چاہیے۔
مسز اقبال: آپ کیا چاہتے ہیں؟
گلشن: میں کچھ نہیں چاہتا اور آپ لوگ بھی کچھ نہ چاہو تو اچھا ہوگا۔ اپنے آپ کو کردار کے حوالے کر دو۔
فریدہ: گلشن صاحب۔ سگریٹ پیجئے گا؟ (گلشن اس کے پاس جا کر سگریٹ لیتا ہے)
گلشن: فریدہ کہو کیسا لگا؟
فریدہ: Wonderful
روپا: کیا خاک Wonderful دلہن کو تو ڈرامہ سے غائب ہی کر دیا۔
فریدہ: موقع دیکھ کر پھر سے گھس آ ؤنا۔
گلشن: ہاں، ہاں۔ بیشتر اس کے ڈرامہ کے فلو کو دھکّا نہ لگے۔
فریدہ: میرا کام کیسا لگا؟
گلشن: بہت اچھا۔ مگر تم جب ڈیڈی سے لپٹ گئی تو میں سمجھا کہ ڈرامہ زیادہ دیر نہیں چلے گا مگر ڈیڈی کے یہ کہنے پر کہ ''میں کتنا خوش نصیب ہوں'' جواب میں تم نے کہا ''میں کتنی بدنصیب ہوں''۔۔۔ واہ سچ پوچھو تو ڈرامہ کا رنگ وہی سے بدلا۔
فریدہ: اور آپ نے ماں کی Entry خوب موقع پر کروائی۔ ورنہ تو میری کھٹیا کھڑی ہو گئی تھی۔
گلشن: تم نے ڈیڈی سے جیسے ہی پوچھا کہ ''آپ امّی سے ملے؟'' تو مجھے لگا ڈرامہ لڑکھڑا رہا ہے۔
فریدہ: اور کیا کہتی؟ سالا ڈیڈی نرسنگ ہوم کی لالچ دے رہا تھا مجھے۔
(تینوں ہنستے ہیں۔ ہنستے ہوئے گلشن دوسری اُور جاتا ہے)
روپا: فریدہ، ڈرامہ میں تم اور ڈیڈی دو بار جذباتی سطح پر، بہت قریب آ گئے تھے مگر دونوں مرتبہ تم نے فاصلہ بڑھا دیا۔
فریدہ: ہاں۔۔۔
روپا: کیوں؟

فریدہ: شاید اس لیے کہ مجھے لفظ ''ڈیڈی'' سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔

روپا: ایسا کیوں؟

فریدہ: ممی اور ڈیڈی کے تعلقات۔۔۔

روپا: ٹھیک نہیں ہیں؟

فریدہ: نہیں

روپا: سبب

فریدہ: کچھ بھی نہیں، اور بہت کچھ۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر اہمیت دے دی جاتی ہے۔۔۔ دشمنوں سے کی جانے والی نفرت اپنوں سے کی جانے والی نفرت سے زیادہ قاتل ہوتی ہے۔ بڑا قہر ڈھاتی ہے یہ نفرت۔ یہ گالی گلوچ، مار پیٹ، محلے بھر کی نیند حرام، پڑوسیوں کا اپنی کھڑکیوں سے تماشہ دیکھنا۔ کیا بتاؤں روپا برسوں دیکھا، سہا۔۔۔ آخر کار پڑھائی کے بہانے ہوسٹل چلی آئی۔

روپا: آخر تمہارے ڈیڈی ایسا کیوں کرتے ہیں؟

فریدہ: یہ ایک لمبی کہانی ہے کیا کہوں۔ ایک زمانے میں میرے نانا بڑے مالدار شخص۔۔۔ (آگے کی باتیں سنائی نہیں دیتیں ایسا دکھائی دیتا ہے)

مسز اقبال: (چائے کی کیتلی لے کر آتی ہے۔ اقبال کے پاس) تھوری چائے ہے لے لو (چائے لیتا ہے)

اقبال: مجھے تمہارا آخری ڈائیلاگ پسند نہیں آیا۔

مسز اقبال: کیوں؟

اقبال: بڑی بیہودہ بات کہہ دی تم نے۔

مسز اقبال: جب تم نے کہی تھی تب۔۔۔ (چُپی)

مسز اقبال: ایک رات بستر پر تم نے ناراض ہو کر مجھ سے نہیں کہا تھا کہ۔۔۔

اقبال: (مسکرا کر) تو تم نے اسے یہاں لا کر جوڑا ہے۔ مگر اس وقت تمہیں یہ بات کیسے یاد آ گئی؟

مسز اقبال: تمہیں نے یاد دلا دی۔

اقبال: میں نے؟

مسز اقبال: میری Entry کے وقت تمہارا آخری ڈائیلاگ ''برف کی مانند سرپڑ گئی'' یہ سُن کر مجھے وہ رات یاد آ گئی۔

اقبال: اس بات کو ہمیشہ یاد رکھتی ہو؟

گلشن: اقبال، شروع کرو۔ ملہوترا چائے کے پیسے دے کر لڑکے کو دفع کرو۔

اقبال: اب اس بات کو آگے مت بڑھانا۔ وہ اپنا Personal Metter ہے۔

مسز اقبال: یہاں کسے معلوم ہوگا کہ تم نے مجھے کبھی ایسا کہا تھا۔

اقبال: پھر بھی۔۔۔

گلشن: Come on اقبال۔ سب لوگ اندر چلے جاؤ۔۔۔ ہاں تو تمہارا آخری ڈائیلاگ کیا تھا؟ (اقبال سوچنے لگا) امّی سوچنے دو اِسے۔ تم شروع کرو۔

امّی: کہاں سے؟

گلشن: تم نے مجھے اَن پڑھ سمجھ کر نہیں چھوڑا تھا بلکہ۔۔۔ (اقبال، مسز اقبال ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مسز اقبال زیرِ لب مسکراتی ہے)

امّی: تم نے مجھے اَن پڑھ سمجھ کر نہیں بلکہ ٹھنڈی سمجھ کر چھوڑا تھا۔

اسلم: عائشہ

امّی: خدا کے لیے مت بلاؤ مجھے اس نام سے۔

اسلم: میں تمہارا شوہر ہوں۔

امّی: مجھے یاد ہے۔

گلشن: نہیں، نہیں۔ یہاں سے کاٹ دو۔

اسلم: کیوں۔

گلشن: امّی نے تم پر تہمت رکھی ہے۔ تم اس کا جواب دینے کے بجائے بات کہیں اور لے جا رہے ہو۔

امّی: ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتے اس لیے بات کا رُخ بدل رہے ہوں مگر آپ بے فکر رہیں میں انہیں ایسے بچ کر جانے نہیں دوں گی (اقبال کی طرف شرارتاً دیکھ کر) چوٹ میرے دل پر لگی ہے (اسلم سے) تم نے مجھے اَن پڑھ سمجھ کر نہیں بلکہ ٹھنڈی سمجھ کر چھوڑا تھا۔

اسلم: عائشہ

امّی: خدا کے لیے مت بلاؤ مجھے اس نام سے

اسلم: میں تمہارا شوہر ہوں۔

امّی: مجھے یاد ہے۔

اسلم: اور تم میری بیوی ہو۔

امّی: یہ میری مجبوری ہے۔

اسلم: کیسی مجبوری؟

امّی: ماضی سے جڑے رہنے کی۔

اسلم: تم طلاق چاہتی تھی؟

امّی: حیرت اس بات کی ہے کہ اب تک تم نے طلاق کیوں نہیں دی؟

اسلم: میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔

امّی: سوچا تو ہوگا مگر اس پر عمل کرنے کا حوصلہ۔۔۔

اسلم: یہ تمہارا وہم ہے۔

امّی: ہاں یہ میرا وہم ہے۔ دواخانہ کا بہانہ کر کے تم چل دیئے یہ میرا وہم تھا۔ اس رات بستر پر اپنے سے دور دھکیلتے ہوئے تم نے نفرت سے مجھ سے کہا تھا میں ٹھنڈی ہوں، وہ میرا وہم تھا۔ حقیقت تو صرف یہی ہے کہ میں اَن پڑھ، گنوار، جاہل ہوں۔

اسلم: اس رات تم نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا؟

امّی: وہ تمہاری جلد بازی کا نتیجہ تھا۔ جس جسم کو جوان ہونے کے بعد اس

کے باپ تک نے چھوا نہیں تھا اس کنوارے جسم سے پہلی ملاقات میں ہی تم نے ایک ساتھ سب کچھ حاصل کرنا چاہا تھا۔

اسلم: وہ انسانی جنس کا تقاضہ تھا۔

امّی: وہ تقاضا میرے ساتھ بھی تو تھا۔۔۔کیا کیا نہیں سُنا تھا سہاگ رات کے بارے میں۔ جب بھی تنہائیوں میں اس کا تصور کرتی۔۔۔ایک اجنبی کمرا، نا قابلِ برداشت دل کی دھڑکنیں، بستر کے ایک کنارے بیٹھی میں، خراماں خراماں تمہارا میری طرف بڑھنا، قریب آ کر لرزتے ہاتھوں سے میری ٹھوڑی کو ہلکے سے اوپر اٹھا کر چند بکھرے لفظوں میں۔۔۔(آہ بھر کر) مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ خواب خواب ہی رہا۔ حسرت حسرت ہی رہی۔ باتوں باتوں میں تم نے مجھے اپنے سارے کپڑے۔۔۔چھی مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے (اپنا چہرہ چھپا کر) جب تک نہیں بجائی تھی تم نے۔۔۔چھی، چھی!! (خاموشی) میں نے روکا۔۔۔تم ضد پر آ گئے۔ میں سمٹی چلی گئی اور تم اُبلتے گئے۔ آخر تم نے طیش میں آ کر مجھے اپنے سے دور دھکیلتے ہوئے کہا "تم ٹھنڈی ہوں بالکل ٹھنڈی" (خاموشی) تمہارے اس ایک جملے نے میری ابلتی ہوئی حسرتوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ عورت کو ٹھنڈا کر دیا مگر تم نے اسے محسوس نہیں کیا کیونکہ تمہیں تلاش تھی ایک گرم جسم کی۔۔۔(فریدہ داخل ہوتی ہے۔ امّی اپنے آپ کو سنبھالتی ہے) کیسی ہے اب نجمہ کی طبیعت؟

فریدہ: جی، اچھی ہے۔

امّی: خدا کا شکر ہے کہ وہ جلد اچھی ہوگئی۔

فریدہ: ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی امّی۔ ویسے بھی آج حرارت زیادہ ہے اس پر گھر کے ہر دروازے کھڑکیوں پر چلمنیں ٹنگی ہوئی ہیں نہ جانے ہماری عورتوں کو ہوا کب نصیب ہوگی؟

امّی: بس کر اب۔ تجھے کپڑے نہیں بدلنے ہیں؟ ابھی دولہے کے گھر کی عورتیں آئیں گی ان کے بیچ ایسے ہی گھوموگی؟ (فریدہ مڑتی ہے) اور دیکھ نجمہ کے قریب ہی رہنا خدا نہ کرے۔۔۔

فریدہ: اسے کچھ نہیں ہوگا (امّی جانے کو مڑتی ہے) امّی (امّی رکتی ہے) امّی ڈیڈی کہہ رہے تھے۔۔۔ان کا نرسنگ ہوم ہے۔

امّی: تو؟

فریدہ: کہہ رہے ہیں میں Housemen Ship ختم کرنے کے بعد اُن کے نرسنگ ہوم کی دیکھ بھال کروں۔

امّی: اوہ۔۔۔(اسلم سے) سمجھی۔ تم اس کے مستقبل کے لیے اتنے فکرمند کیوں تھے۔

اسلم: میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔

امّی: اگر خود غرضی غلط چیز نہیں تو۔

اسلم: اسے خود غرضی کہتی ہو؟

امّی: اس پر ہماری کافی باتیں ہو چکی ہیں۔ تم اسے آگے نہ بڑھاؤ تو اچھا۔

اسلم: میں آگے نہیں بڑھا رہا۔ فریدہ نے تم سے اجازت چاہی ہے اسے جواب دینے کے بجائے تم مجھے الجھا رہی ہو (کچھ دیر اسلم کے دیکھنے کے بعد)

امّی: فریدہ

فریدہ: جی امّی

امّی: تم نے کیا طے کیا ہے؟

فریدہ: ویسے نہیں امّی۔۔۔

امّی: ویسے نہیں تو جیسے بھی۔ دیکھو، اب تم چھوٹی نہیں ہو۔ پڑھ لکھ کر سیانی ہو گئی ہو اور پھر میں نے کبھی اپنے گھر کے دروازوں، کھڑکیوں پر چلمن نہیں ڈالی۔ میں تم دونوں کے بیچ چلمن نہیں بنوں گی۔

فریدہ: امّی۔۔۔(دور سے بینڈ باجوں کی آواز ابھرتی ہے)

امّی: اپنے مستقبل کے لیے، زندگی کے اس موڑ پر اس بات کا فیصلہ تمہیں خود کرنا ہوگا کہ تمہیں کس جانب قدم بڑھانا ہے۔۔۔؟ ایک طرف بسی بسائی دنیا آباد ہے اور دوسری طرف۔۔۔میری طرف سے پوری آزادی ہے تمہیں۔۔۔

فریدہ: مجھے نہیں چاہیے بسی بسائی دنیا امّی۔

اسلم: مگر کیوں؟

فریدہ: میں اپنی دنیا آپ بساؤں گی۔

اسلم: کیا ضرورت ہے ایسی پریشانی مول لینے کی؟ جبکہ میں اپنا نرسنگ ہوم تمہارے نام کرنے کو تیار ہوں۔

فریدہ: یہ نرسنگ ہوم آپ کے نام کس نے کیا تھا ڈیڈی؟

اسلم: برسوں کی کڑی محنت کے بعد میں نے اسے بنوایا ہے بیٹے۔

فریدہ: تو مجھے بھی ایسی محنت کرنے دیجیے۔

اسلم: بیٹے، یہ راستہ دشوار ہے۔ اس دور میں زندگی بنتے بنتے بنتی ہے۔

فریدہ: بات زندگی بننے یا بگڑنے کی نہیں ہے ڈیڈی، بات ہے جدوجہد سے حاصل ہونے والی تسکین کی۔ وہ تسکین جو کسی چیز کو حاصل کرنے کی لگن میں نصیب ہوتی ہے۔

(بینڈ باجا کی آواز اتنی قریب آ گئی ہے کہ ان کی باتیں سنائی نہیں دیتیں۔ روپا دلہن کی سہیلی بن کر بھاگتے ہوئے آتی ہے۔ دوسری طرف جاتے جاتے رُک جاتی ہے۔ فریدہ کے پاس آ کر اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کھینچتی ہے۔)

روپا: (بینڈ کے شور میں اونچی آواز سے) فریدہ، جلدی چل دولہا آ گیا ہے۔ دولہا آ گیا ہے چل بھی (بینڈ کی آواز رُک جاتی ہے) چل بھی۔ نجمہ کا دولہا دیکھیں گے۔ فریدہ مڑتی ہے۔ فریدہ ایک نظر اسلم کو دیکھتی ہے)

اسلم: زندگی احتیاط چاہتی ہے۔

فریدہ: (رُک کر) زندگی نہیں، عمر۔۔۔ایک عمر۔۔۔جو ابھی آپ کی ہے۔

(فریدہ بھاگتے ہوئے چلی جاتی ہے۔ اسلم کچھ کہنے کو ہے۔ امّی بھی جاتی ہے)

گلشن: (اپنی کرسی سے اٹھ کر) Very Good بس ڈرامہ یہاں ختم کر دو۔ (اسٹیج پر آتا ہے۔ سب لوگ خوشی سے اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں)

ایک صدی کا قصّہ

شمی کپور

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

اُسے ہندوستان کا Elvis Presley کہا جاتا تھا۔ وہ اُسی کی طرح ناچتا تھا۔ اُسی کے جیسے کپڑے پہنتا تھا۔ اُسی کی طرح اپنے بال بناتا تھا۔ اُسنے ناچ گانے کی کوئی ٹریننگ نہیں لی تھی مگر جب وہ ناچتا تھا تو لوگ اُسکے ساتھ تھر کنے لگتے تھے۔ اُسنے ڈانس کا اپنا ایک اسٹائل ایجاد کیا تھا۔ وہ پرتھوی راج کپور کا بیٹا تھا۔ نام تھا شمشیر راج کپور، یعنی شمی کپور۔ وہ 21 اکتوبر 1931 کو بمبئی میں پیدا ہوا۔ شمشیر پرتھوی راج کپور اور رام سرنی کپور کی دوسری اولاد تھی۔ سب سے بڑا راج کپور تھا۔ بمبئی میں پیدا ہونے کے باوجود اُسنے اپنے بچپن کا زیادہ تر حصہ پشاور کی کپور حویلی میں گزارا جواُن کا آبائی گھر تھا۔ اُسکے بعد وہ کلکتہ چلا آیا جہاں اُسنے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اُس نے آگے کی پڑھائی سینٹ جوزف کانونٹ میں کی اور ڈون بسکو اسکول سے اپنا میٹرک پاس کیا۔ ایک مختصر عرصے کے لئے اُسنے رویا کالج میں پڑھائی کی اور پھر پڑھائی چھوڑ کے وہ کلکتہ چلا گیا جہاں اُسکا باپ پرتھوی راج کپور کا تھیٹر فعال تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ جڑ گیا۔ 1948 میں اُسنے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ وہ ایک جونیئر آرٹسٹ کے طور پر کام کرنے لگا۔ اُسکی ماہانہ تنخواہ پچاس روپے تھی۔ یہاں اُسکا دل نہیں لگا اور وہ پھر سے اپنے باپ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ 1948 سے لے کے 1952 تک یعنی پورے چار سال وہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا رہا۔ سن باون میں اپنے باپ سے تین سو روپے کی آخری تنخواہ لے کے وہ پھر سے فلمی دنیا کی طرف نکل پڑا۔ اسی سال اُسے ''جیون جیوتی'' نام کی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کے ہدایت کار مہیش کول تھے اور اسکی پہلی ہیروئن چاند عثمانی تھی۔ یہ فلم 1953 میں ریلیز ہوئی۔ اسی دوران اُسکا دل قاہرہ کی ایک بیلے ڈانسر نادیہ گامل پر آ گیا۔ یہ دونوں سری لنکا میں ملے جہاں شمی چھٹیاں منانے گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے۔ یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا۔ جب نادیہ اپنے وطن قاہرہ واپس لوٹ گئی تو پیار کی یہ کہانی اُسی کے ساتھ ختم ہوگئی۔

شمی کپور نے سترہ فلمیں کیں مگر اُسے وہ مقبولیت اور شہرت نہیں ملی جس کا ہر اداکار متمنی ہوتا ہے۔ اُسنے ''ریل کا ڈبہ'' مدھو بالا کے ساتھ کی۔ ''ٹھوکر'' شیاما کے ساتھ کی۔ ''لیلا مجنوں'' نوتن کے ساتھ کی۔ ''تانگے والی'' انیتا گوہا کے ساتھ کی جب کہ اس فلم کا ہیرو بلراج ساہنی تھا اور اُسکے ساتھ نروپا رائے تھی۔ اسی طرح اُسنے ''ڈاکو'' ششی کلا کے ساتھ کی اور ''مس کوکا کولا'' گیتا بالی کے ساتھ۔ ''رنگین راتیں'' مالا سنہا اور گیتا بالی کے ساتھ۔ ''میم صاحب'' میں اُسنے مینا کماری کے مقابل منفی رول ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فلم ''رنگین راتیں'' میں اُسے گیتا بالی نے کام دلوایا تھا۔ اُسنے ہر طرح کے رول کئے۔ سنجیدہ، مزاحیہ، المیہ، رومانٹک مگر اتنی فلمیں کرنے کے باوجود اُسے کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔

ششا دھر مکھر جی جو کہ اشوک کمار کے بہنوئی تھے اور فلمستان کے روح رواں تھے، فلمستان سے الگ ہو گئے اور اُسنے سالے اشوک کمار اور اپنے چھوٹے بھائی سبودھ مکھر جی کیساتھ مل کر فلمالیہ کی نیو ڈالی۔ ناصر حسین ششا دھر مکھر جی کے ساتھ چلا آیا۔ ششا دھر مکھر جی اُسکی وفاداری سے اتنا خوش تھا کہ اُسنے اُسے پہلی فلم ڈائرکٹ کرنے کا موقع عطا کیا۔ یہ فلم تھی ''تم سا نہیں دیکھا''۔ ششا دھر مکھر جی ایک محدود بجٹ میں فلمیں بنانے کا فارمولہ آزمانا چاہتے تھے۔ ناصر حسین دیو آنند کے ساتھ دو کامیاب فلمیں بطور رائٹر کر چکا تھا اسلئے دونوں میں کافی تال میل پیدا ہوا تھا۔ ناصر حسین چاہتا تھا کہ دیو آنند اُسکی فلم میں کام کرے۔ ایک دن جب ناصر حسین نے دیو آنند سے بات کی تو اُسنے کہانی سننے کی خواہش ظاہر کی۔ ناصر حسین نے اُسے پورا اسکرپٹ سنا دیا۔ دیو آنند فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہیروئن کے لئے وجینتی مالا کا انتخاب کیا گیا۔ ناصر حسین اس بات سے بے خبر تھا کہ ششا دھر مکھر جی نے شمی کپور سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے اپنی اگلی فلم میں پیش کرے گا۔ ایک دن ششا دھر مکھر جی نے ناصر حسین کو اپنے آفس میں طلب کیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُس نے فلم کے لئے کوئی ہیرو فائنل کیا کہ نہیں۔ ناصر حسین نے کہا کہ دیو اور وجینتی مالا فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ششا دھر مکھر جی نے ناصر حسین سے کہا۔ ''دیو آنند کو چھوڑ کے تم شمی کپور کو ٹرائی کیوں نہیں کرتے؟'' شمی کپور کا نام سن کر ناصر حسین دنگ رہ گیا۔ ششا دھر مکھر جی جیسا جید پرڈیوسر اُسے ایک ایسے ہیرو کو لینے کی سفارش کر رہا تھا جو کہ سی گریڈ فلموں میں کام کر رہا تھا اور جسکی امیج ایک لور بوائے کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ناصر حسین نے ششا دھر مکھر جی سے کہا کہ اپنی فلم ایک رومانٹک فلم ہے۔ شمی کپور کی امیج لور بوائے کی نہیں ہے۔ وہ رومانٹک ہیرو لگے گا نہیں۔ جواب میں ششا دھر مکھر جی نے کہا۔ تم اُس سے ایک بار ملو۔ اُسکو اپنی مونچھیں صاف کرنے کو بولو۔ پھر اُسے ایک ڈائرکٹر کی نظر سے آنکو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے کردار میں فٹ بیٹھ جائے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ناصر حسین نے حامی بھر لی۔

اگلے روز وہ شمی کپور سے ملا اور اُس سے باتوں ہی باتوں میں فلم کا تذکرہ کیا۔ وہ ششا دھر مکھر جی کے کہنے کے مطابق شمی کپور سے کئی مرتبہ ملا۔ اُسنے اُسے اپنی مونچھیں صاف کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مونچھیں منڈھوانے کے بعد اُسکی شخصیت ہی بدل گئی۔ وہ بڑا دلکش لگنے لگا۔ دھیرے دھیرے ناصر حسین کو لگنے لگا کہ شمی کپور اس رول میں فٹ بیٹھ جائے گا۔ فلم شروع ہوئی۔ وجینتی مالا بھی فلم سے باہر ہو گئی اُسکی جگہ فلمستان اسٹوڈیو کے مالک تولا رام جالان کی منظور نظر امیتا نے لے لی۔ اس فلم کو او۔ پی۔ نیر نے سنگیت سے آراستہ کیا تھا اور گانے مجروع سلطانپوری نے تحریر کئے تھے۔ اس فلم کی کہانی اسکرین پلے اور مکالمے ناصر حسین نے تحریر کئے تھے۔ یہ فلم 1957 میں پردہ سیمیں کی زینت بنی۔ اس فلم نے ایسی

دھوم مچائی کہ شمی کپور راتوں رات اسٹار بن گیا۔

بقول شخصے شمی کپور کی کامیابی کے پیچھے گیتا بالی کا ہاتھ تھا۔ گیتا بالی سے شمی کپور کی ملاقات 1955 میں فلم ''مس کوکا کولا'' کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ اس فلم کا ہدایت کار شمی کا دوست ہری آہلووالیہ تھا۔ گیتا بالی ایک کامیاب ایکٹرس تھی جب کہ شمی کپور ابھی تک فلمی دنیا میں اپنی جگہ نہ بنا پایا تھا۔ فلم کے سیٹ پر دونوں کی ملاقات ایسے ہی ہوئی جیسے ایک ہیرو کی ملاقات اپنی ہیروئن سے ہوتی ہے۔ شوٹنگ کے دوران وہ اس سردارنی سے دب کے رہا۔ فلم پوری ہوئی بس قصہ ختم۔

اس فلم کے بعد اُنہوں نے ایک اور فلم سائن کی جس کا نام ''رنگین راتیں'' تھا۔ اس فلم کو مشہور ہدایت کا کیدار شرما بنا رہے تھے۔ چونکہ وہ ایک فلم ساتھ میں کر چکے تھے اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ وہ شوٹنگ کے لئے رانی کھیت پہونچ گئے جو کہ ایک ہل اسٹیشن ہے۔ دن بھر شوٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ شام کو دونوں گھومنے نکل جاتے تھے۔ گیتا بالی کو پہاڑوں پر گھومنا بہت اچھا لگتا تھا جب کہ شمی کو شکار کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے ساتھ بندوق لیکر چلتا تھا اور شکار کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ ایک شام اُسنے ایک شیر کو دیکھا۔ جونہی اُسنے نشانہ باندھا شیر نے اُسے چکمہ دیا۔ اُسے شکار کے ہاتھ سے چلے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ گیتا تھی جو شمی کو حوصلہ دیتی رہی۔ گھبراؤ مت۔ وہ شیر بچ کے نہیں جائے گا۔ ایک شام جب وہ شوٹنگ سے واپس لوٹ رہے تھے گیتا بالی کی جیپ اُس سے آگے تھی جب کہ اُسکی گاڑی گیتا کی گاڑی کے پیچھے تھی۔ اچانک گیتا کی جیپ ایک پُل کے بیچوں بیچ رک گئی۔ شمی نے دیکھا کہ گیتا بونٹ پر جا کے کھڑی ہوگئی۔ جب شمی کی جیپ قریب پہونچی تو گیتا شمی سے بولی۔ شمی وہ رہا تمہارا شکار۔ جب شمی نے جیپ کے آگے شیر کو کھڑا پایا تو اُسکی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب شمی اس سردارنی کی دلیری پر فریفتہ ہوگیا۔ تاریخ تھی ۱۲ اپریل ۱۹۵۵۔

سوال یہ تھا کہ ''رنگین راتیں'' کی ہیروئن مالا سنہا تھی جب کہ اس فلم میں اُسکا کوئی رول نہیں تھا پھر اُسنے اس فلم میں ایک غیر روایتی رول کرنے کیلئے حامی کیسے بھر لی جب کہ وہ مرکزی کردار ادا کرتی تھی۔ اصل میں وہ شمی کپور کو چاہنے لگی تھی۔ چونکہ یہ یک طرفہ عشق تھا اس لئے وہ شمی کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ اب جب کہ شمی بھی اُسکی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا، اُسنے گیتا کے سامنے شادی کی پیشکش رکھی جو اُسنے ٹھکرا دی۔ وہ پیار کا اقرار تو کر رہی تھی مگر شادی کے معاملے میں وہ خود ہی رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ اُسنے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اُسکے پیچھے پڑا رہا۔ وہ ایک بچے کی طرح بار بار اُس سے ایک ہی سوال کرتا۔ مجھ سے کب شادی کروگی؟ وہ ہر بار یہ کہہ کر اُسکا دل توڑ دیتی، ابھی نہیں۔ گیتا بڑی صاف گو اور نیک دل لڑکی تھی۔ اُسنے شمی سے کہا کہ وہ اُس سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور وہ اُسکے سوائے کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی مگر وہ اُس سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اپنے پریوار کے ساتھ دغا نہیں کر سکتی۔ وہ سب اُس کے سہارے کے محتاج ہیں۔

اُسکے منع کرنے کے باوجود ہر ایک گھنٹے کے بعد اُس سے پوچھتا۔ مجھ سے کب شادی کروگی۔ چار مہینے کے مسلسل رونے گڑگڑانے اور منتیں کرنے کے بعد آخر ایک دن انہونی ہوگئی۔ شمی کے گھر والے پرتھوی تھیٹرس کے ساتھ بھوپال چلے گئے تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا اسلئے وہ جوہو کے ایک ہوٹل میں رک گیا تھا۔ اسی بیچ گیتا وہاں آگئی۔ اُسنے ایک بار پھر اُس سے شادی کرنے کی پیشکش کی، یہ سوچ کر کہ وہ پھر اُسکی پیشکش ٹھکرا دے گی مگر اُس دن معجزہ ہوگیا۔ اُسنے شمی سے کہا۔ چلو ہم شادی کر لیتے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔ شمی نے پوچھا۔ ابھی؟ اُسنے زور دے کے کہا۔ ہاں ابھی اور اسی وقت۔ وہ اپنے بیڈ سے اُچھل کر بولا۔ چلو۔ ابھی شادی کر لیتے ہیں۔

اُسنے اُسے گاڑی میں بٹھا لیا اور سیدھے جانی واکر کے گھر چلے گئے۔ جانی واکر نے ایک ہفتے پہلے نور سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ وہ اُس سے صلاح لینا چاہتے تھے۔ وہ جب جانی واکر سے ملے تو اُسنے شمی سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اسلئے ہمیں قاضی کو نکاح کرانے کے لئے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تم لوگ ہندو ہو، تم کسی مندر میں جا کر اپنا بیاہ رچا سکتے ہو۔ شمی گیتا کو وہاں سے اپنے دوست ہری آہلووالیہ کے گھر پر لے گیا۔ وہ ان دونوں کو نیپین سی روڑ کے بان گنگا مندر میں لے گیا۔ بھور کا وقت تھا۔ شمی کرتے پاجامہ میں تھا جب کہ گیتا کڑھائی دار شلوار کرتے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ پنڈت نے مندر کے اندر جا کر دونوں کی شادی کی۔ ان دونوں نے اگنی کند کے گرد سات پھیرے لئے۔ جب پنڈت نے شمی سے کہا کہ وہ گیتا کی مانگ میں سیندور ڈال دے تو اُس وقت وہ سیندور کہاں سے لاتا۔ شمی کو ایک تدبیر سوجھی۔ اُسنے گیتا بالی کا میک اپ بکس کھولا اور اُسمیں سے لپ اسٹک نکالی۔ یہ ہندوستان کا ایسا پہلا جوڑا تھا جس نے سیندور کی جگہ لپ اسٹک سے اپنی بیوی کی مانگ بھری تھی۔ ہری آہلووالیہ اکلوتا گواہ تھا جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وہ گیتا کو لے کے اپنے دادا کے پاس پہونچ گیا۔ دادا نے دونوں کو گلے لگایا اور اُنہیں جی بھر کے آشیرواد دیا۔ شمی نے بھوپال فون کر کے اپنے والدین کو یہ خوشخبری سنائی۔ وہ یہ خبر سن کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اُسکے بعد وہ گیتا کے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنانے چلے گئے۔ اگست 1955 میں شمی کی شادی گیتا بالی سے ہوئی۔ اُسکے ٹھیک دو سال بعد فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' ریلیز ہوئی جس نے شمی کی تقدیر بدل کے رکھ دی۔ وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔ اُسکے بعد فلمستان کی دوسری فلم ''دل دے کے دیکھو'' آئی۔ اس فلم میں اُسکی ہیروئن آشا پاریکھ تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی ناصر حسین ہی تھے۔ اس فلم نے بھی باکس آفس پر دھوم مچا دی۔ یہ فلم 1959 میں ریلیز ہوئی۔ ''تم سا نہیں دیکھا'' کی طرح اس فلم کے نغمے بھی کافی مقبول ہوئے۔ شمی کپور کی مقبولیت میں محمد رفیع کی آواز کا کافی عمل دخل تھا۔ شمی کامیابی کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھتا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک فلم کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ ''اُجالا'' ''چار دل چار راہئیں'' ''بسنت'' ''کالج گرل'' ''سنگاپور'' ''بوائے فرینڈ'' ''دل تیرا دیوانہ'' وغیرہ۔

1961 میں فلمالیہ کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی۔ فلم کا نام ''جنگلی'' تھا۔

اس فلم میں ششادھر مکھرجی نے نسیم بانو کی بیٹی سائرہ بانو کو شمی کپور کے مدمقابل پیش کیا تھا۔ فلم بیحد کامیاب رہی۔ گیتا کے مبارک قدم شمی کی زندگی میں کیا پڑے کہ اُسکی ہر فلم کامیابی کی معراج کو چھونے لگی۔ شمی کپور کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی نئی ہیروئن کو شمی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا تو فلمی شائقین اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ سائرہ بانو، آشا پاریکھ، راجشری اور شرمیلا ٹیگور ایسی چند ہیروئنیں ہیں جنہیں شمی کپور کی بدولت پہلی ہی فلم سے قبولیت اور مقبولیت ملی۔

شمی کپور ایک ہمہ جہت فن کار تھا۔ وہ ہر طرح کے رول کرنے میں ماہر تھا۔ فلم ''پروفیسر'' اُسکی ایک زندہ مثال ہے۔ اس فلم میں اُسنے ایک بوڑھے پروفیسر اور ایک نوجوان عاشق کا رول جس خوبی اور نفاست سے ادا کیا، وہ قابل دید تھا۔ اس فلم نے بھی ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ شمی کپور کی فلموں کی خاص بات یہ ہوتی تھی کہ فلم کی موسیقی لاجواب ہوتی تھی۔ شمی کو سنگیت کا گیان بچپن سے ہی ملا تھا۔ اُنکی والدہ نے راج کپور اور شمی کپور کو بچپن میں سنگیت سکھانے کا بندوبست کیا تھا۔ دونوں اچھے اور برے سنگیت کو سمجھنے کی حس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ راج کپور اور شمی کپور کی فلموں کے گانے بڑے مدھر اور دل میں اُترنے والے ہوتے تھے۔ شمی کپور گانے کی ریکارڈنگ سے پہلے موسیقار کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا اور دھن پسند ہونے کے بعد ہی گانا ریکارڈ ہوتا تھا۔

1964 کی فلم ''کشمیر کی کلی'' کے فلمساز اور ہدایت کار شکتی سامنت تھے۔ اس فلم کے موسیقار او۔ پی۔ نیر تھے۔ شکتی سامنت اس فلم کا پہلا گانا ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔ شمی کپور ملک سے باہر تھا اسلئے اُسنے اُسکی عدم موجودگی میں فلم کے گانے کی ریکارڈنگ ہوئی۔ جب شمی وطن لوٹا اور اُسے پتا چلا کہ گانا ریکارڈ ہو چکا ہے تو وہ شکتی سامنت سے کافی ناراض ہوا۔ اُسنے کئی حرکتیں ایک گانے کے لئے سوچ کے رکھیں تھیں اسلئے وہ اس بات سے خفا تھا کہ اُسے بتائے بنا اُنہوں نے گانا کیوں ریکارڈ کیا۔ شکتی سامنت نے اُسے ایک بار گانا سننے کے لئے کہا۔ جب اُسنے گانا سنا تو وہ اُچھل پڑا۔ یہی وہ حرکتیں تھیں جو اُسنے سوچ کے رکھی تھیں۔ وہ جا کر محمد رفیع سے ملا اور اُس سے پوچھا کہ جو حرکتیں اُسنے سوچ کے رکھی تھیں، اُن کو اُسکی آگہی کیسے ہوئی؟ کیا وہ انتریامی ہیں۔ رفیع صاحب پہلے مسکرائے اور پھر دھیمے سُر میں شمی کپور سے بولے کہ جب وہ ریکارڈنگ کے لئے اسٹوڈیو پہونچ گئے اور اُنہیں گانا دیا گیا تو اُنہوں نے موسیقار سے پوچھا کہ یہ گانا کس اداکار پر فلمایا جانے والا ہے تو او پی نیر نے کہا کہ شمی کپور پر، تب جا کے وہ گانے کے بول پڑھتے پڑھتے کہنے لگے کہ شمی جی اس لائن پر ہاتھ اتھے ہلا دے گا اور اتھے ایسی حرکت کرے گا۔ بس یہ سوچ کے گانا ریکارڈ ہو گیا۔ وہ گانا تھا۔

''تعریف کروں کیا اُسکی جس نے تجھے بنایا''

ناصر حسین پہلی بار ایک کرائم تھرلر بنانا چاہتے تھے جس کا نام 'تیسری منزل'' تھا۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ یہ فلم ناصر حسین نے لکھی اور پرڈیوس کی تھی جب کہ اس فلم کے ہدایت کار وجے آنند تھے۔ اس فلم کے کلیدی رول میں شمی کپور اور آشا پاریکھ تھے۔ پہلے اس فلم کے لئے دیو آنند کو سائن کیا گیا تھا۔ دیو آنند ناصر حسین کی پہلی پسند تھے۔ شوٹنگ سے پہلے ہی دونوں میں کسی بات کو لے کر اختلاف پیدا ہو گیا کہ دیو آنند نے فلم چھوڑ دی۔ ایک بار پھر ناصر حسین شمی کپور کی شرن میں پہونچ گئے۔ شمی کپور نے فلم میں کام کرنا مان لیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس فلم کے لئے دیو آنند کو پہلے سائن کیا گیا تھا۔ اس فلم کے لئے ناصر حسین ایک نئے موسیقار کے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے۔ شمی کپور کی پہلی پسند او۔ پی۔ نیر اور شنکر جے کشن ہوا کرتے تھے۔ ناصر حسین کسی وجہ سے شنکر جے کشن کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آشا بھونسلے اور او۔ پی۔ نیر ایک لمبے عرصے کے بعد الگ ہو گئے تھے۔ آشا بھونسلے نے ایک نوجوان موسیقار کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ نوجوان موسیقار تھا راہول دیو برمن۔ اُسنے ناصر حسین کو اس بات کے لئے آمادہ کر لیا کہ وہ راہول کو اپنی فلموں میں موسیقی دینے کا موقع فراہم کریں۔ آشا کی آواز آشا پاریکھ کو بہت زیادہ سوٹ کرتی تھی اسلئے ناصر حسین کو آشا بھونسلے کی بات ماننی پڑی۔ اُسنے شمی سے کہا کہ وہ اس بار راہول دیو برمن کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ اب شمی کپور کو آر۔ ڈی۔ برمن کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا کیونکہ وہ ایک اسٹار تھا اور فلمیں اُسکے نام سے چلتی تھیں۔ ویسے بھی ہماری فلم انڈسٹری کا یہ چلن رہا ہے کہ ہیروئن اور سنگیت کار کا چناؤ ہیرو کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ناصر حسین نے شمی کپور کو راہول دیو برمن کی کئی دھنیں سنائیں۔ پہلی ہی دھن سن کر وہ جھوم اُٹھا ۔ راہول دیو برمن پاس ہو گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ فلم کی شوٹنگ شد و مد سے چل رہی تھی کہ شمی کپور کی زندگی میں ایک طوفان آ گیا۔ ایک ایسا طوفان جس نے اُسکی دنیا ہی اُلٹ کے رکھدی۔ گیتا بالی جسے خسرہ ہو گیا تھا، وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ 1965 میں اُسکا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا جان گسل سانحہ تھا جس نے شمی کپور کو توڑ کے رکھ دیا۔ وہ گیتا بالی سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔ فلم کی شوٹنگ رک گئی۔ شمی کپور اپنی پیاری بیوی کے سوگ میں ایسے ڈوب گیا کہ اُسنے باہر کی دنیا سے ناطہ ہی توڑ لیا۔ ''تیسری منزل'' کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ سیٹ کو بے وجہ کھڑا رکھنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اُن دنوں اسٹوڈیو کا ایک دن کا کرایہ ہزاروں روپیہ ہوتا تھا۔ شمی کپور ان باتوں سے بے خبر نہ تھا اسلئے اُسنے ناصر حسین کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ یا تو سیٹ توڑ دیں یا کسی اور کو لے کر یہ فلم مکمل کر لیں۔ ناصر حسین اور شمی کپور کی دوستی اتنی گہری اور مضبوط تھی کہ سود و زیاں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس نے شمی کو جواب بھیجا کہ جب تک شمی اس صدمے سے باہر نہیں آئے گا فلم کا سیٹ ایسے ہی رہے گا، چاہے اُسے ایک سال تک شمی کا انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ چھ مہینے تک فلم کا سیٹ کھڑا رہا۔ چھ مہینے کے بعد جب شمی کپور اپنی بھابی کرشنا کپور (مسز راج کپور) کی کوششوں سے اس صدمے سے باہر آیا تو سب سے پہلے اُس نے ''تیسری منزل'' کی شوٹنگ میں حصہ لیا۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو ایک بار پھر اس فلم نے کامیابی کا پرچم لہرا دیا۔ اس فلم کی موسیقی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ جہاں دیکھو لوگ ان دھنوں پر تھرکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

1965 سے لے کے 1970 تک شمی کپور کا جادو سر چڑھ کے بولتا رہا۔ اس بیچ اُسکی کئی فلمیں ریلیز ہوئیں جو بیحد کامیاب رہیں ۔ ''جانور'' ''بدتمیز'' ''پریت نہ جانے ریت'' ''این ایوننگ ان پیرس'' ''لاٹ صاحب''

''برہمچاری''''پرنس''''تم سے اچھا کون ہے''''پاگل کہیں کا''اور''انداز''''چھوٹے سرکار''''منورنجن''منورنجن شمی کپور کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔اُسکے بعد اُسنے بطور ہدایت کار ایک اور فلم کی جس کا نام''بنڈل باز''تھا جسکا ہیرو راجیش کھنہ تھا۔دونوں فلمیں کچھ خاص کمال نہ دکھا سکیں۔''چھوٹے سرکار''بحیثیت ہیرو اُسکی آخری فلم تھی۔اُسکے بعد وہ کریکٹر رول کرنے لگا۔

فلم''برہمچاری''کی شوٹنگ کے دوراں اُسکا دل ممتاز پر آ گیا۔وہ اس فلم میں ایک اہم رول ادا کر رہی تھی۔اُسنے ممتاز کے سامنے شادی کی پیشکش رکھی مگر ساتھ میں یہ شرط رکھی کہ وہ شادی کے بعد فلموں کو خیر باد کہہ دے گی۔ممتاز کو یہ شرط منظور نہ تھی اسلئے اُسنے شادی کی پیشکش ٹھکرا دی۔27 جنوری 1969 کو شمی کپور نے بھاو نگر (گجرات) کی شاہی گھرانے سے تعلق رکھنے والی نیلما دیوی سے شادی کی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ نیلما دیوی شمی کپور اور گیتا بالی کی زبردست مداح و پرستار تھی۔ایک بار جب اُسنے گیتا بالی سے آٹو گراف لیا تو اُسنے اُسکے آٹو گراف بک پر لکھ دیا کہ مجھے یاد رکھنا جیسے اُسے پہلے سے ہی اس بات کی آگہی ہو گئی تھی کہ اُسکے جانے کے بعد اُسکی جگہ وہی لینے والی ہے۔گیتا بالی سے اُسکے دو بچے ہوئے۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔بیٹا ادتیہ راج کپور اُسوقت نو سال کا تھا جب اُسکی ماں اُسے داغ مفارقت دے گئی۔ماں کی جدائی کا اُسکی صحت پر بہت برا اثر پڑنے لگا۔نیلما دیوی نے اُسکی وہ کمی پوری کی۔اُسنے نہ صرف ان دونوں بچوں کو ماں کا پیار دیا بلکہ انکی خاطر بہت بڑی قربانی دی۔اُسنے اپنی کوکھ سے کسی بھی بچے کو جنم نہ دینے کا فیصلہ کر لیا جس پر وہ آج تک قائم ہے۔ادتیہ راج کپور اور بیٹی کنچن فلمی چمک دمک سے دور ہی رہے۔

شمی کپور کو 4 اگست 2011 کو برج کینڈی اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔وہ ایک لمبے عرصے سے گردے کی بیماری میں مبتلا تھا۔14 اگست کو شمی کپور نے آخری سانس لی۔جب شمی کپور کی میت شمشان گھر کی طرف لیجائی جا رہی تھی تو راستے میں جگہ جگہ لاؤڈ سپیکر پر شمی کپور کے گانے گونج رہے تھے۔چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے وغیرہ۔شمی کپور ایک زندہ دل انسان تھا۔اُسنے فلمی اداکاری کو ایک نئی جہت بخشی۔وہ اپنے بیشتر ڈانس خود ہی کمپوز کرتا تھا۔اُسکی بہترین فلموں میں ''برہمچاری''کو سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔اُسنے فلمی دنیا کی بیشتر ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا۔جن میں مدھو بالا سے لے کے پدمنی کولہا پوری شامل ہے۔اُسنے دلیپ کمار کے ساتھ فلم''ودھاتا''میں کام کیا۔''پروفیسر پیارے لال''میں دھرمیندر کے ساتھ،''راکی''میں سنجے دت کے ساتھ،''پریم روگ''میں رشی کپور کے ساتھ،''دیش پریمی''میں امیتابھ بچن کے ساتھ،''ہیرو''میں جیکی شروف کے ساتھ،''بے تاب''میں سنی دیول کے ساتھ،''اجازت''میں نصیرالدین کے ساتھ،''چمتکار''میں شاہ رخ خان کے ساتھ،''اور پیار ہو گیا''میں بوبی دیول کے ساتھ،''جانم سمجھا کرو''میں سلمان خان کے ساتھ،''واہ تیرا کیا کہنا''میں گوندا کے ساتھ اور سب سے آخر میں اپنے بھتیجے رشی کپور کے بیٹے رنبیر کپور کے ساتھ فلم ''راک اسٹار''میں۔

بقیہ : استثنائی صورتیں

۴۔ خاندان کے مرد حضرات کا گھر کی خواتین کے لیے مشفقانہ رویہ اور ترجیحی سلوک بمقابلہ تیسری جنس کے اس مسئلہ کو اور شدید بنا دیتا ہے۔

ان افراد کو ہمیشہ اس بات پر دکھ رہتا ہے کہ وہ تمام رشتے ان سے دور ہو گئے ہیں جو ان سے محبت کرتے تھے اور بے قصور ہونے کے باوجود ان کا گھر کے دیگر افراد کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ایسے حالات میں صرف ماں کا ایک ایسا رشتہ باقی رہ جاتا ہے جو انہیں بے قصور سمجھتے ہوئے ممتا کی محبت سے مجبور ہو کر جب بھی موقع ملے سینے سے لگا لیتی ہے اور وہ بھی چھپ کر ماں سے ملنے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جبکہ خاندان کے دیگر افراد ان کی شکل تک دیکھنا گوارہ نہیں کرتے۔

حالات کے جبر سے مجبور ہو کر یہ افراد گھر سے باہر اپنے جیسے ایک نئے خاندان میں شامل ہو جاتے ہیں جن کی اپنی روایات، رسمیں، طرز معاشرت اور اصول ہوتے ہیں۔ان میں بزرگ افراد اور پھر ان کے سربراہ بھی مقرر ہوتے ہیں اور انہی کی رسموں اور ذریعہ معاش کو یہ ہیجڑہ افراد اختیار کر کے اجتماعی زندگی گزارتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔

مندرجہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ڈاکٹر رینو بہل اس طرف توجہ دلاتی ہیں کہ ان بدقسمت اور بے قصور افراد کے بھی انسانی حقوق ہوتے ہیں اور مناسب توجہ، ہمدردی اور تعلیم و تربیت سے انہیں معاشرے کا کارآمد شہری بنایا جا سکتا ہے تا کہ وہ اس اذیت ناک صورتِ حال سے نکل کر بہتر زندگی گزار سکیں۔

ناول کی کہانی ایک متوسط گھرانے کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیکھر رکھا گیا۔سات آٹھ برس کی عمر میں جب اُس نے اپنی ظاہری مردانہ جنس کے برعکس گفتگو اور حرکات و سکنات شروع کیں تو پھر اُسے کن مشکلات اور تکلیف دہ حالات سے گزر کر''شیکھا''کا روپ اختیار کرنا پڑا۔گو کہ اُس کے اندر یہ خواہش ہمیشہ زندہ رہی کہ کاش معاشرہ اس جیسے دیگر مجبور اور بے قصور افراد کے لیے ہمدردی اور انسانیت کے نام پر ان کے جائز حقوق دلانے میں مددگار بنے تا کہ وہ بھی مختلف ہُنر سیکھ کر مفید اور فعال کردار ادا کرنے کے قابل بن سکیں۔

ڈاکٹر رینو بہل نے جس پیرائے میں یہ ناول لکھا ہے اسے پڑھنا شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنا آسان نہیں۔آخر میں وہ قارئین کی سوچ، رہنمائی اور عمل کے لیے اسی مجبور اور بے قصور فرد کی زبان میں ایک سوال چھوڑ جاتی ہیں کہ:

''میرے ہونے میں کیا برائی ہے''

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محبِ گرامی، گلزار جاوید صاحب، خوش رہیے۔

گزشتہ کل مربّی ڈاکٹر حسن منظر صاحب کی مزاج پُرسی کے لیے اُن کے دولت کدے پر جانے کا اتفاق ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے آناً فاناً سامنے کی میز سے تازہ چہارسو کی دو کاپیاں اُٹھا کر مبارک باد پیش کرتے ہوئے پیش کیں تو بے ساختہ زبان سے یہ شعر خود بخود ادا ہو گیا:

اے مصور تیرے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
خوب تصویر بنائی ہے میرے بہلانے کو

یوں تو چہارسو کے ہر شمارے میں آپ کا انداز خلاّقانہ ہوتا ہے جس سے تازگی کے ساتھ نئے پن کا احساس بھی ہوتا ہے مگر تازہ شمارہ دیکھ کر دل کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ زیرِ نظر شمارے میں تو آپ نے کمال ہی کر ڈالا۔ سرِ ورق سے لے کر پسِ ورق تک ہر صفحہ منہ سے بولتا نظر آ رہا ہے۔ شاید یہ احساسات اپنی ذات کو چہارسو کے آئینے میں دیکھ کر ہوئی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ نے انفرادیت کا جو انداز روزِ اوّل سے اپنایا تھا ہنوز اُس میں تازگی اور توانائی موجود ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توانائیوں میں برکت عطا کرے۔ آمین

سحر انصاری (کراچی)

میرے گلزار، نئے سال کی مبارک قبول کرو۔

چہارسو کا سحر انصاری نمبر قاری کو ہر لحاظ سے سحر زدہ کر رہا ہے۔ میں اپنی حد تک یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ سحر انصاری صاحب سے واقفیت کے باوجود اُن کے بارے میں کسی طرح کا تاثر میرے دل و دماغ میں نہ تھا مگر سحر صاحب کی نسبت فتح محمد ملک، سلیم یزدانی، مظہر جمیل اور مبین مرزا کے مضامین پڑھ کر سحر صاحب کے اوصاف روشن اور واضح ہوتے گئے۔ رہی سہی کسر آپ کے براہِ راست نے پوری کر دی۔ کیا تیکھے سوالات کیے ہیں اور جوابات بھی سحر صاحب نے بڑے ناپ تول کر دیے ہیں۔

تابش خانزادہ کی گرفت روز بروز مضبوط ہو رہی ہے اور قاری کا اشتیاق ہر قسط کے بعد بڑھ جاتا ہے اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہونے لگتا ہے۔ فیروز عالم جس سادگی اور شستہ بیانی سے طب کی ادق اصطلاحوں کو بیان کر کے ہمیں باخبر کر رہے ہیں اُس کے عوض اس نوجوان کے لیے جتنی بھی دعائیں کی جائیں کم ہیں۔

افسانے سبھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ مسرور جہاں کا ''عزت دار'' سلام بن رزاق کی ''گائے کہانیاں''، دیپک بُدکی کا ''کُتے والی عورت''، رینو بہل کا ''ڈوبتی نسلیں'' اور گلزار جاوید کے ''منکہ مسمی فیروز دین'' نے بہت لطف دیا۔ مسرور جہاں نے ہندوستان کی تقسیم کے بعد تہذیب و تمدن کے موضوع کو جس طرح آشکار کیا ہے اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ افسوس آج کل انتہا پسندوں نے ہندوستان کا منظر نامہ جس طرح گرما دیا ہے اُس کے بطن سے گائے کہانیاں وجود میں آنا قابلِ افسوس بھی ہے اور قابلِ مذمت بھی۔ دیپک بُدکی نے اپنے مخصوص انداز میں جس مسئلے کو موضوعِ قلم بنایا ہے اُس سے پورا پورا انصاف بھی کیا ہے۔ یہ لڑکی مطلب رینو بہل اکثر چونکاتی بھی ہے اور حیران بھی کرتی ہے۔ اس بار اس نے مشرقی پنجاب کے جس انسانیت کُش مسئلہ کی نشان دہی کی ہے وہ کافی حد تک سچ پر مبنی ہے مگر حکومت میں بیٹھے لوگ نجانے کون سی گھٹی پی کر سوئے ہوئے ہیں۔ میری جھولی میں اور تو کچھ نہیں دعاؤں کی سوغات ہے جو میں ہمیشہ رینو کی نذر کرتا رہوں گا۔

اور یہ کہ تم نے ''منکہ مسمی فیروز دین'' لکھی ہے یہ کہانی کم اور آپ بیتی زیادہ لگتی ہے۔ کبھی فون پر بتلانا کہ یہ خیال تمہیں کب اور کہاں ٹکرایا۔ کیا خوب رواں بیان ہے ہم تو شہرِ خاموش لکھتے آئے ہیں مگر آپ کی تفصیل اس قدر خوشگوار ہے کہ دل چاہے ابھی کہ ابھی قبر میں لیٹ کر اپنے اوپر خود ہی مٹی ڈال لی جائے۔ آپ نے جس انداز میں یہ سرگزشت بیان کی کہ دل مرنے کے لیے للچانے لگا۔ واہ کیا سُپر داستان ہے کہ آنکھوں دیکھی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کرکٹ کی کمنٹری کرتا ہے۔ Aware Beyound کا طرز گفتگو ''اوئے ساڈا پیوا ایتّی چھیتی مرن آ لا ئیں'' ایک نہایت اچھوتے پلاٹ کو آپ نے فیملی کے ممبر کے طور پر بیان کیا ہے۔ بار بار پڑھتا ہوں اور ہر بار آپ کے لیے دعا کرتا ہوں ''God bless you pen and personality''

شعری حصہ بھی بہت جاندار ہے بشیر بدر، غالب عرفان، آصف ثاقب، شوق انصاری، مہندر پرتاپ چاند، یونس شرر، پروین شیر، نسیم سحر اور ڈاکٹر ریاض احمد کی تخلیقات نے بہت خوش وقت کیا خاص کر سبیلہ انعام صدیقی کی غزل کے اشعار بہت اچھے لگے۔ میری طرف سے اس نوخیز شاعرہ کو دعائیں کہیے۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو ایس اے)

محترم گلزار بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۸ وصول ہوا۔ آپ نے اس دفعہ اس شمارے کو سحر انصاری صاحب کے نام کیا ہے۔ کئی سالوں سے آپ چہارسو کے ذریعہ باحیات دانشوروں کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں اور تلاش کر کر کے ان لوگوں کے فن اور اردو کی خدمات کو اجاگر کر رہے ہیں۔ جو اس کے مستحق تو ہیں مگر کچھ پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ اس شمارے میں آپ کی محنت اور بے لوث خلوص جھلکتا ہے۔ یقیناً آنے والے وقتوں میں یہ شمارے اردو ادب کے ان طلبہ کے لئے جو اردو کے موجودہ دور پر تحقیق کریں گے بہت ہی مددگار ثابت ہوں گے۔ اتنی مشقت

اورتحقیق کے بات ایسے شماروں کا جزااوران کی قیمت صرف ''دل مضطرب اورنگاہ شفیقانہ؟؟؟'' اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آپ کے ہاتھ کوئی دفینہ لگ گیا ہے۔جس سے آپ اپنا یہ شوق پورا کررہے ہیں اورہم جیسے ترسے ہوئے لوگوں کی پیاس بجھا رہے ہیں۔۔اللہ آپ کوشادوآبادرکھے۔

سحر صاحب نہ صرف کراچی بلکہ اردو کے عالمی قارئین کے لئے بھی ایک معتبر شخصیت ہیں اور انکی نگارشات تنقید نگاروں سے تحسین وصول کرچکی ہیں۔ اس شمارے میں ان پر پروفیسر فتح محمد ملک، مبین مرزا، مجتبیٰ حسین اور سلیم یزدانی جیسے مستند قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں جو انصاری صاحب کے فن پر منہ بولتا ثبوت ہیں۔مجھے مظہر جمیل کا ''سحر بھائی'' اچھا لگا کہ اس میں ایک ذاتی لگاؤ کا رنگ تھا۔

افسانوں میں مسرور جہاں کا عزت دار اور سلام بن رزاق کا گائے کہانیاں پسند آیا۔شاعری میں غالب عرفان، مہندر پرتاب چاند اور نسیم سحر کی نگارشات دل کو بھائیں۔

دیگر مشمولات میں تابش کا قسط وار ناول بہت دلچسپ ہے، سیمیں کرن تیزی سے عروج کی طرف رواں دواں ہیں، شگفتہ نازلی کی شاعری دل کو چھو لیتی ہے۔آپ کے افسانے منکہ مسمی فیروز دین حسب سابق دل پر گہرا اثر کر گیا، آپ کا خاص اسلوب ہے جو آپ نے اس میں بھی برقرار رکھا ہے۔دیپک کنول کا 'وجنتی مالا''۔۔۔اف کیا یاددلا دیا۔ بڑی بڑی کجراری آنکھیں اور رس بھرا بدن، میرے نوجوانی بلکہ کم عمری کے دن۔۔۔۔دلیپ کے ساتھ دیوداس اور گنگا جمنا۔۔پردیپ کمار کے ساتھ ناگن اور انجان اور راج کپور کے ساتھ سنگم۔۔حیرت ہے کہ بالی وڈ کی آج کی ہیروئنیں اپنے تمام کپڑے اتار کر بھی وہ کشش نہیں پیدا کر پاتیں جو اس زمانے کی ہیروئنیں ساڑھیوں میں لپٹ کر کرتی تھیں۔

فیروز عالم (لاس اینجلس)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات و آداب۔

گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ، نومبر، دسمبر 2018 بھی ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کے توسط سے نظر نواز ہوا۔پروفیسر سحر انصاری کے نام قرطاس اعزاز پڑھا، پڑھ کر ان کی گوناں گوں شخصیت سے مزید واقفیت ہوئی۔ان کے مضمون " اکیسویں صدی اور ادیب" نے نئی نسل اور جدید دور کے ادیبوں کی نبضیں ٹٹولی ہیں۔سحر انصاری کے اعزاز میں موجود تحریروں نے انصاری صاحب کی ذات و کائنات کا احاطہ تو نہیں کیا لیکن کافی حد تک ایک نئے قاری کے لیے معلومات کا خزینہ ہیں۔

افسانوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ہر افسانے میں کمال کی دلکشی اور جاذبیت موجود ہے۔خواہ سرور جہاں کا " عزت دار " ہو یا سلام بن رزّاق کا " گائے کہانیاں" دیپک بدکی کی کہانی " کتے والی عورت " ہو یا پھر بے خبر قاتل، ہر ایک نے اپنا ذہن پر بھی تاثر قائم کیا۔مگر جن افسانوں نے دیر تک ذہن و دل میں ایک ہلچل سی پیدا کی ان میں سب سے پہلے جمیل عثمان کا افسانہ انہم فعلوھا ہے۔ایک لمحے کے لیے بھی کہانی سے رابطہ نہیں ٹوٹتا۔کمال کی جاذبیت موجود ہی۔کہانی کے اختتامیے نے منٹو کی یاددلا دی۔جس طرح وہ اپنی کہانیوں کی جان زیادہ تر آخری پیراگراف میں ڈالتے ہیں اسی طرح انہم فعلوھا نے بھی چونکا دیا۔گلزار جاوید صاحب کا افسانہ "منکہ مسمیٰ فیروز دین" نے جس قسم کی فضا بندی افسانے کے شروع میں کی وہی سحر انگیزی آخری سطر تک باقی رہی۔ایک عمدہ افسانہ کیا ہوتا ہے اور قاری کی گرفت کیوں کر کی جانی چاہیے یہ کوئی گلزار جاوید کے افسانے سے سیکھے۔رینو بہل کے افسانے " ڈوبتی نسلیں " نے نوجوانوں میں موجود نشے کی لت کو بڑی خوبصورت سے بیان کیا ہے۔کہانی اچھی ہے اور ایک منجھے ہوئے لکھاری کے موئے قلم سے مزین تمام اوصاف لیے ہوئے ہے۔بشیر مالیر کوٹلوی صاحب کے افسانے نے تو کمال ہی کر دیا۔" فکرت " نے آج کے دولت مند خود ساختہ ادیبوں اور شاعروں کو جس انداز سے نشانہ بنایا ہے اور ساتھ نئے لکھنے والوں کے عدم مطالعہ کی طرف نشاندہی کی ہے وہ صد فیصد حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔

" گھر کی بہار " اور " محبوب کی سنّت " نے بھی ذہن و دل میں تازگی اور پاکیزگی کا اہتمام کیا۔خصوصت سے نسیم سحر کی غزل نے اپنی طرف توجہ کھینچی۔انہوں نے جس خوبصورتی سے درخت کو مختلف معنوں اور جدا جدا رشتوں میں دکھایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر علی عباس (چنڈی گڑھ، بھارت)

چہارسو رقم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

جناب سحر انصاری کی ساحری سے بھرپور ''چہارسو'' مشیر طلسم بن کر آیا۔سحر انصاری کی شاعرانہ اور ادبیانہ کرشمے دیکھے۔یہ دیکھنے کے لائق سُنے بہت تھے۔اللہ رکھے سحر صاحب خوب کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔انہوں نے محنت اور لگن سے ادب میں ایک تاریخی مقام حاصل کرلیا۔''چہارسو'' کی خصوصیات میں ایک پیش کاری کا الگ تھلگ پیرایہ بھی ہے۔

''ڈوبتی نسلیں'' اور ''منکہ مسمی فیروز دین'' معاشرے کے سانحاتی دکھ درد کے نقش ہیں۔ڈوبتی نسلیں پاکستان اور بھارت کے نئے نویلوں کی بے راہ روی کی حقیقی تصویر ہے۔منکہ مسمی فیروز دین میں اچھوتی اور انوکھی افسانوی فضا قائم کی گئی ہے۔دونوں افسانے متاثر کرتے ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی تحریریں ایسی ہیں جو از قبیل شاذ ہیں۔

شاعری از چہارسو بار بار پڑھی جی نہیں بھرا۔دیپک کنول نے ''وجنتی مالا'' کا خاکہ پُر اثر قرینے سے لکھا ہے۔وجنتی مالا پر مفروضے نہیں لکھے گئے اور نہ بتائے گئے ہیں ورنہ میڈیا میں جتنے منہ ہوں اتنی ہی باتیں ہوتی ہیں۔مرلی چندر کے خط میں پایا جانے والا خلوص اور پیار دل کو لگا۔ڈاکٹر ریاض احمد، نوید سروش اور رینو بہل نے اس ناچیز کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے مہربانی ان کی نوید سروش تو ہر خط میں گوشۂ چشمے ادھر کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

دل گرفتہ سہی جان باقی رہے
زندہ رہنے کا امکان باقی رہے

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

عزیز گرامی قدر، گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو ماہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۸ء اپنی درخشندہ روایت کا آئینہ اور پروفیسر وسیم بریلوی کے ادبی تصربات کا گواہ بن کر قارئین سے خراج تحسین وصول کرنے کا سبب بنا۔ سب سے پہلے ''ارادوں کا سفر'' کے ذیل میں محمد انعام الحق نے ان کی زندگی بھر کا ادبی و علمی کارِ ہنر کمال اختصار سے پیش کیا۔ ''رسم وفا عزیز ہے'' پروفیسر وسیم بریلوی نے خود اپنے روز و شب کا مرقع کھینچا۔ صبر و جبر کی ازلی کشمکش کا ایک رخ یہ بھی پیش کیا کہ:

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں کونے میں
مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے

ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ یہ مہذب معاشرہ آج بھی گھٹنوں کے بل چل رہا ہے اور ذہنی و فکری پیش رفت کے مقابلے میں ''پیر پرستی'' کا قائل ہے۔ فراق گورکھپوری نے ان کو اپنا محبوب شاعر بتا کر ان کی قامت شعری کا اعتراف کیا ہے۔ ''وسیم کی شاعری حیات کی احساس افزا شاعری ہے''

میں چل رہا ہوں کہ چلنا بھی ایک عادت ہے
یہ بھول کر کے یہ رستہ کہاں کو جاتا ہے

آپ نے ''براہِ راست'' میں سوالات کے انبار لگائے اور پروفیسر وسیم بریلوی نے ہر سوال کا جواب اس انداز سے دیا کہ بہت سے خوشگوار اور دلچسپ واقعات پڑھنے کو ملے اور جا بجا اشعار نے ان کی گفتگو یا مکالمے کو جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ان کی آٹھ غزلیں چہارسو کی زینت بنیں۔ ان کے ہاں نیا خیال اور نئی امثال بکثرت ملتی ہیں۔

تیرے خیال کے ہاتھوں کچھ ایسا بکھرا ہوں
کہ جیسے بچہ کتابیں ادھر اُدھر کر دے

پروفیسر وسیم بریلی کے رہنے والے ہیں، تقسیم ملک سے پہلے میں بریلی سے ملحق عزت نگر میں قیام پذیر رہا اور اکثر بریلی آنا جانا رہا۔ اس زمانے میں ابھی قرطاس و قلم سے رشتہ قائم نہیں ہوا تھا مگر ہمارے کورس میں میر درد، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خان مومن کی غزلیں زیر مطالعہ رہیں۔ وسیم بریلوی نے ۱۹۴۰ء میں اور میں نے ۱۹۳۱ء میں آنکھ کھولی۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی ان عظیم شاعروں کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھے مگر ان کی غزل میں میر تقی میر کا رنگ غالب ہے۔ یقیناً وہ کلاسیکی غزل اور جدید لہجے کے خوبصورت امتزاج کو عزیز جانتے ہیں۔

چہارسو میں قرطاس اعزاز پروفیسر وسیم بریلوی کے نام ان کا استحقاق ہے اور آپ نے قارئین اور ان کے درمیان جو رابطہ قائم کیا اسے بہ نظر استحصان دیکھا جائے گا، بھارت میں ہونے والے مشاعروں میں ان کو انٹرنیٹ پر دیکھتے رہتے ہیں مگر جو لطف اور تعلق خاطر چہارسو سے عبارت ہے کیا کہنے۔ آپ کا تہہ دل سے شکریہ کہ آپ نے وسیم بریلوی کو ہمارے دل کے اور قریب کر دیا ہے۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۸ء نظم و نثر اور دیگر ادبی شعبوں میں خدمات سرانجام دینے والے ادیب و شاعر پروفیسر سحر انصاری سے منسوب ہے جن کے لیے مرحوم فیض احمد فیض کے حوالے سے قرطاس اعزاز ہی بڑی سند ہے اور ان کی ہمہ جہت شخصیت پر انہیں کا اپنا ایک شعر گواہ ہے:

وہ پاس آئے تو موضوع گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

شمارہ میں بہت اچھے افسانے، مضامین اور شاعری شامل ہے۔

آپ کے افسانے ''منکہ مسمی فیروز دین'' کا اسلوب بیان اور منظر نامہ اچھوتا اور دلچسپ ہے جو قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور دیر تک اس کے اثرات ذہن پر موجود رہتے ہیں۔ کہانی عبرتناک اور سبق آموز بھی ہے۔ محنتی فیروز دین اور اس کی وفا شعار بیوی کی طرف سے اگر ان کے دونوں بیٹوں کو مناسب تربیت تعلیم اور رہنمائی کے علاوہ نگرانی بھی ممکن ہوتی تو فیروز دین کی زندگی یوں اذیت ناک نہ ہوتی۔

رینو بہل کا افسانہ ''ڈوبتی نسلیں'' پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نوجوانوں میں جرائم خصوصاً منشیات کے کثرت سے پھیلتے ہوئے رجحان کے باعث خاندان تباہ ہو رہے ہیں جبکہ معاشرہ اور حکومت اس وبا کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ والدین کے لیے اس میں واضح اشارے موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبدالباری کا افسانہ ''یادوں کی لڑی'' محبت کے پاکیزہ جذبات اور احساسات سے بھرپور ایک خوبصورت تحریر ہے جسے پڑھتے ہوئے آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور یہ آپ بیتی کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ دیگر دلچسپ افسانوں میں مسرور جہاں کا ''عزت دار'' دیپک بدکی کا ''کتے والی عورت'' اور محمد بشیر کا ''فکرت'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا ''گٹھیا'' ''Gout'' پر عام فہم الفاظ میں طبی معلومات کا مضمون قابلِ تحسین ہے۔ شاعری میں سحر انصاری، یونس شرر، یوگیندر بہل تشنہ، پروین شیر، بشیر بدر، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند اور سائرہ بھارتی کے کلام نے متاثر کیا۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید، آداب۔

اس بار قرطاسِ اعزاز میں پروفیسر وسیم بریلوی کا گوشہ بہت بھرپور ہے۔ اور سب سے اعلیٰ آپ کا انٹرویو لینے کا انداز ہے۔ شخصیت کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

انل ٹھکّر کا افسانہ ''بددعا'' بہت عمدہ افسانہ ہے۔ پڑھ کر آنکھیں

بھیگ گئیں۔ہم ہیں تو لاہور کے قدیمی رہنے والے لیکن میرے والد کچھ سالوں کے لیے کلانور چلے گئے تھے۔والدہ اکثر بتایا کرتی تھیں کہ ہم لوگ گھروں کو تالے لگا کر قافلوں کی صورت میں نکلے تھے۔ان کا خیال تھا کہ کچھ ہی دن کی بات ہے یہ ہنگامے دور ہوں گے تو وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔راستے میں جو بربریت ہوئی وہ بتا کر اکثر رو پڑتی تھیں۔حملہ آور کماد کے کھیتوں میں چھپے رہتے تھے جیسے ہی قافلہ اس مقام پر پہنچتا وہ کرپانوں اور چھروں کے ساتھ قافلے پر حملہ آور ہوتے جو عورت ہاتھ لگتی گھسیٹ کر لے جاتے۔بچوں اور مردوں کو جانوروں کی طرح ذبح کرتے اور بھاگ جاتے۔راستے میں کوئی دریا تھا جس کا پانی میری والدہ بتاتی ہیں کہ لاشوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔یہ لوگ کلانور سے لاہور تک پیدل آئے تھے۔بہرحال دنوں طرف سے انسانیت سوز ظلم بھی ہوئے اور دونوں طرف کے اچھے لوگوں نے بہت سے لوگوں کی جانیں بھی بچائیں۔

رینو بہل کا ''داؤد کا چاند'' بہت مزے کا اور معلوماتی ہے۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام نظر سے گزرا تو مجھے بہت سال پہلے کا ان کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ یاد آ گیا جو انہوں نے میرے ایک پنجابی افسانے پر لکھا تھا۔میں نے اس پوسٹ کارڈ کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔

سیما پیروز (لاہور)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے قرطاسِ اعزاز موسوم و منسوب ہو جائے تو بذاتِ خود قرطاسِ اعزاز مزید معزز، مؤقر و معتبر ہو جاتا ہے۔بلاشبہ پروفیسر سحر انصاری صاحب کا بھی ایسی ہی نادر و نایاب شخصیات میں شمار ہوتا ہے فیض صاحب کے تاثرات وارشادات قابلِ قدر اور دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔

ہم چہارسو کے مشکور ہی نہیں ممنون بھی ہیں جنہوں نے قارئین کے ادبی ذوق کی سیرابی کے لیے اس نوع کے دانشورانہ، دوستانہ اور مخلصانہ ذہنی ارتفاع کا اہتمام کیا جس کے توسط سے ان کی تخلیقی وتہذیبی جہتوں سے آ گہی پائی اور ذہنی ارتکاز کے لیے فنی شناسائی سے ہمکنار ہوئے جو از خود مطالعے کے لیے باعث تفاخر ہے۔

غزلیہ ونظمیہ کلام کا انتخاب بہت عمدہ۔کلام شاعر میں خود تخلیق کار کی ذات کی متنوع عکس بندی اور فنی تمثال گری کے نقش جھلکتے ہیں۔خدا سے بات کرتے ہیں بے حد منفرد شعری عنوان ہے۔درحقیقت اس عنوان سے اردو غزل کے طرزِ تخاطب کو آسمانی رفعتیں اور سمندری پہنائیاں عطا ہوئی ہیں جو کہ شعری کائنات کے لیے وجہ امتیاز اور باعث توقیر ہیں۔

''منکہ مسمی فیروز دین'' کثیر الجہاتی موضوع پر پھیلی ہوئی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار فیروز دین ہر ہیرے سے جڑا ہوا اور ہر ڈوری اُسی سے بندھی ہوئی ہے ہر سمت و جہت بظاہر کیسی ہی الگ کیوں نہ ہو لیکن در پردہ اس کا ربط وضبط اور تعین فیروز دین کی ذات سے ہی ہوتا ہے۔سماجی واخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کی چارہ گری، انسانی اعضا کی پیوندکاری، صلہ شناسی یا قدر دانی پانا ملکی وغیر ملکی معاونت کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ عمر کے مختلف مراحل میں بھی اُسے آسودہ خاطر مطمئن نہیں کر پاتا تو وہ اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں خود کو ملزم نہیں بلکہ مجرم بنا کر کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے تا کہ خود احتسابی کی کڑی بھٹی سے خود کو گزار کے شاید کندن بن جائے مگر سو باتوں کی ایک بات کہ ابتدا تا انتہا وہ اپنے تمام تر ملکی وجغرافیائی حدود اربع کے ساتھ رہتا منکہ مسمی فیروز دین ہی ہے۔وسیع و عریض کینوس کی کہانی کے پھیلاؤ کو سمیٹنا اور مربوط مسلسل رکھنا مختلف نشیب وفراز سے گزارنا، مرکزی کردار کی نفسیاتی کیفیات کے اُتار چڑھاؤ کو سنبھالے رکھنا، مشاہدے کی ہنروری تجربے کی عمیق نظری اور قلمی مشاقی پر توصیفی حد تک دلالت کرتے ہیں۔

سحر انصاری صاحب کے خراج تحسین کے ساتھ ہی میں اپنی سطریں تمام کرتی ہوں:

کبھی کوئی شگفتہ سا بہانہ یاد رہتا ہے
وہ موسم یاد رہتا ہے ، زمانہ یاد رہتا ہے

سحر صاحب نے کیا بے ساختہ یہ سوچ موزوں کی

''نشانی یاد رہتی ہے، نشانہ یاد رہتا ہے!''

شگفتہ نازلی (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ملا ہے۔وسیم بریلوی کی تازہ شعریات عرب سے عجم تک پہنچ چکی ہیں ان کا یہ شعر کہاں نہیں گیا:

خوشی کی آنکھ میں آنسو کی بھی جگہ رکھنا
بُرے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

''چہارسو'' میں ان کے فکر وفن کے نئے دروازے کھلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔براہ راست وہ ظاہر اور باطن سے مخاطب ہیں۔آپ کے تند وتیز، ٹھنڈے اور گرم سوالات سے سماج کے لیے علم وادب سے ایک نیا بیانیہ ترتیب پا رہا ہے اور وسیم صاحب حرف حرف منکشف ہو رہے ہیں۔

جاوید سلیمی، پروفیسر محمد حسن (عصر حاضر کے زخموں کی گواہی) نصرت ظہیر، عشرت ظفر اور عبدالاحد ساز نے وسیم بریلوی صاحب کے فکر وفن اور شخصیت پر اس عمدگی سے لکھا ہے کہ وسیم صاحب کے افکار اور شعری نظریات کی تفہیم ہو رہی ہے اور ان کی تشکیل دی ہوئی نئی شعری متھ تک رسائی ہو رہی ہے۔

چار افسانے انل ٹھکّر، شہناز خانم عابدی، شموئل احمد اور سیمیں کرن کے افسانے تمام افسانے لاجواب ہیں۔خصوص میں سیمیں کرن کا افسانہ ''جلتی بے خبری سے'' جس ایجاز اور اعجاز سے لکھا گیا ہے کمال کا ہے۔

آصف ثاقب، محمود الحسن، فیصل عظیم، حسن عسکری کاظمی، اشرف جاوید، عرش صہبائی، فرح کامران، نوید سروش، عبداللہ جاوید، یوگیندر بہل تشنہ،

جمیل عثمان، انیس الرحمٰن اور طاہر شیرازی کی غزلیہ اور نظمیہ تخلیقات سے روح و دل کو طراوت مل رہی ہے۔ غازی علم الدین ہمارے عہد کی بلند پایہ علمی شخصیت ہیں ان کا مضمون اپنے موضوع کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ حسن منظر کی تخلیق نشان راہ، نشان راہ ہے۔ دیپک کنول نے بھارت بھوشن کو خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ لکھا ہے۔ شاعری بوئی والا بابا، آصف ثاقب پر قربان ہو رہی ہے۔

چمک ان کی فلک آرا ہوئی ہے
نجومِ چشمِ نم بے جا نہیں ہے

اسد عباس خان (جھنگ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۲۷، نومبر، دسمبر ۲۰۱۸ء) اپنے اختصاص کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ''براہِ راست'' کا مکالمہ میرے لیے ہر بار سوچ کے نئے دریچے وا کرتا ہے۔ آپ کے سوالات اور فکر، شاعر اور نقاد پروفیسر سحر انصاری کے جوابات نے دیر تک اپنے سحر میں رکھا۔ سحر صاحب کا مطالعہ زبردست ہے آج بھی وہ کتاب کو عزیز رکھتے ہیں وہ کراچی کی علمی وادبی فضا میں سنجیدہ فکر کے داعی ہیں۔ فتح محمد ملک نے سحر انصاری کے سوالات میں چند اہم نظموں پر اظہار خیال کیا ہے جو عشق حقیقی کی بنیاد ہیں۔ سلیم یزدانی صاحب نے سحر انصاری کی شخصیت کے چند مضبوط و منفرد پہلوؤں کی نشاندہی دلچسپ پیرائے میں کی ہے ایک پہلو یہ بھی ہے۔

''بولے! یزدانی شکر ہے آگ جلدی بجھائی گئی، میرے آنے سے پہلے، بہت کچھ جل کر خاک ہوا۔ بہت کچھ پھر بھی بچ رہا۔۔۔ ہونٹ کانپے اور آنسو بہہ کر ان کے گالوں پر آ گئے۔'' (ص۔۲۰)

مظہر جمیل نے اُن کی ذہانت، ادبی ولسانی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ رضی مجتبیٰ اور مبین مرزا کی تحریریں سحر صاحب کے فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لیے بنیادی حوالہ ہیں۔ فاری شانے سحر انصاری کے غزلیہ کلام کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔

سلام بن رزاق کی ''گائے کہانیاں'' جرأت اظہار کی زبردست مثال ہے۔ مذہب (کوئی بھی ملک ہو) کے نام پر کس کس طرح معصوم لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ مذہب کو ایک تماشا بنا دیا ہے۔ کرب ناک کہانیاں ہیں۔ سید نصرت بخاری کی کہانی ''بے خبر قاتل''، اور رینو بہل کا افسانہ ''ڈوبتی نسلیں'' جو المیے بیان کیے گئے ہیں اُس سے مفر نہیں۔ ''شہر کا آخری اجنبی شخص'' میں محمد جمیل اختر نے ''عصبیت'' کو بڑے سلیقے سے موضوع بنایا ہے۔ تحریر و تقریر پر پابندی یا زبان بندی کے پس منظر میں ایک ظلم کو بیان کیا ہے۔ گلزار جاوید بھائی آپ افسانہ کیا تخلیق کرتے ہیں احساسات کو زبان عطا کر دیتے ہیں ''منکہ مسمی فیروز دین'' کی زندگی دکھوں، بدلتے ہوئے حالات، ایسی دنیا میں قیام جو جنت کی طرح ہے۔ روداد سنانے پر اصرار، اہلِ دنیا پھر نہ سمجھ سکیں تو۔۔۔؟ آپ نے ایک مشکل موضوع کو بصورت خط تحریر میں لا کر فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور تجسس کی کیفیت آخر تک برقرار رہی ہے۔

ایک صدی کا قصہ میں دیپک کنول نے کامیاب اور پُرکشش اداکارہ ''وجنتی مالا'' کی داستان عروج بیان کی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب چہارسو کے قارئین کے لیے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں وہ بیماری کی وجوہ، علاج اور احتیاط کی تفصیل جس آسانی سے بیان کر رہے ہیں اس پرچے میں گٹھیا (Gout) کے متعلق مفید معلومات ہیں۔

بشیر بدر صاحب کی تیس برس پرانی غزل نے نیا مزا دیا اُن کی غزل جوان اور تازہ دم ہے۔ غالب عرفان، آصف ثاقب، واصف حسین واصف، شاہین مفتی اور اشرف جاوید کی غزلوں کے اشعار فنی پختگی کے ساتھ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ عارف شفیق کی غزل کا لہجہ بدلا ہوا ہے۔ فرح طوبا، شریف شیوہ، ابراہیم عدیل، سبیلہ انعام صدیقی، عطاءالرحمٰن قاضی کی غزلوں کے کچھ اشعار میں نیا پن ہے جو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اس شمارے میں نظمیں بھی جاندار ہیں خصوصاً پروین شیر کی نظم ''سمٹتا دائرہ''، فیصل عظیم کی ''حاصلِ محفل'' احمد کلیم کی ''کرفیو'' یہ تخلیق دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ نسیم سحر صاحب نے ''سانحہ پشاور'' کے شہید اور زخمی طلبہ کو یاد کیا ہے۔

یہ جنگ جاری رہے گی ہماری فتح تلک
ہمارے عزم، مصمّم مزید ہو گئے ہیں

وسیم صدیقی کی نظم ''والد صاحب کے نام'' میرے دل کی آواز بھی ہے۔ عطیہ سکندر علی نے سحر انصاری کی نظموں کا انتخاب کیا ہے ہر نظم فکری تہہ داری کی مثال ہے۔

وجیہہ الوقار ''رس رابطے'' کی ترتیب و تدوین سلیقے سے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر ریاض احمد، آغا گل، شگفتہ نازلی اور نسیم سحر صاحب کے خط اہم ہیں اچھا تجزیہ کیا ہے۔ جناب عطش درانی، محترمہ الطاف فاطمہ، محترمہ پروین عاطف، محترمہ فہمیدہ ریاض، جناب سہیل غازی پوری اردو دنیا ان کے انتقال پُر ملال پر افسردہ ہے۔ ۸۔ دسمبر ۲۰۱۸ء کو حیدرآباد کے خوش فکر شاعر شوکت نوید اور ۱۹۔ دسمبر ۲۰۱۸ء کو کراچی کے سینئر شاعر سجاد بابر بھی داغ مفارقت دے گئے۔ علی اعجاز (اداکار و صداکار) بھی رخصت ہوئے یہی زندگی کا انجام ہے رہے نام اللہ کا۔

نوید سروش (میرپورخاص)

مکرم و محترم جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۸ء بھرپور آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز کی مسند پر جناب سحر انصاری جاہ جلال کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ملک کے معروف اہلِ علم و دانش نے اُن کے بے مثال فن اور دلکش شخصیت پر آرا کا اظہار کیا جو بہت اچھا لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ براہِ راست میں سوال و جواب نے بھی خوب خوب رنگ آمیزی کی جس سے سحر

انصاری صاحب کی شاعری اور شخصیت مزید واضح ہوگئی۔

جہاں تک مجلّے میں شائع ہونے والے افسانوں کی بات ہے اُن میں ''عزت دار، کتنے والی عورت، فکرت، ڈوبتی نسلیں، منکہ مسمّی فیروز دین'' بار بار پڑھنے کے لائق افسانے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم چہارسو کے قارئین کو مختلف بیماریوں کے متعلق جس انداز سے آگاہ کرتے ہیں اور انہی کا حصہ ہے۔ شاعری میں غالب عرفان، آصف ثاقب، نسیم سحر، اشرف جاوید، سیفی سرونجی، نوید سروش، طاہر شیرازی کا کلام دل کو بھایا۔ دیپک کنول نے فلمی دنیا سے ''جگنتی مالا'' پر دلکش پیرائے میں لکھا ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' حسب معمول اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز آپ کے مجلّے کو اس لیے منفرد مقام عطا کرتا ہے کہ گلزار صاحب اتنے خوبصورت انداز میں کسی منتخب بلند پایہ ادیب کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں کہ قاری خود کو اس میں شامل سمجھتا ہے۔ تین چار صفحات پر متذکرہ ہستی کی فنی و شخصی زندگی کے اکثر پہلو واضح ہو جاتے ہیں باقی ماندہ نجی و ادبی محاسن دیگر ہمعصر صاحب قلم اپنے اپنے مضامین میں یوں اُجاگر کروا دیتے ہیں گویا قارئین ان صاحب سے عرصہ دراز سے آشنائی رکھتے ہیں۔ سحر انصاری صاحب کے حصے میں بھی کچھ ایسا ہی تجربہ ہوا۔

مسرور جہاں صاحبہ کی کہانی ''عزت دار'' ہمارا قدیمی سماجی المیہ رہا ہے۔ جس میں شرافت و دیانت کو پسِ پشت ڈال کر سدا حسب نسب کو فوقیت دی گئی۔ موصوفہ نے عزت کے متلاشی خاندان کے حصے کو چابکدستی سے تحریر کیا۔ زبان کی چاشنی نے اسے مزید مرصع کر دیا۔ سلام بن رزاق کی ''گائے کہانیاں'' بہت افسوسناک اور عبرت ناک حقائق ہیں۔ سیکولر بھارت میں اقلیتیں کس کرب سے دوچار ہیں۔ رزاق صاحب نے خوبی سے یہ پردہ چاک کیا ہے۔ بھارتی دانشوروں کو آواز بلند کرنی چاہیے کہ اکیسویں صدی میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ''حیوانوں کو انسانوں پر ترجیح دی جائے؟''

دیپک بدکی صاحب کا ''کتے والی عورت'' ایک معاشرتی گراوٹ کی آئینہ دار کہانی ہے۔ جس میں عمدگی کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے کہ نوعمر بچیوں سے ادھیڑ عمر خواتین کو اپنے ہی خاندان کے مردوں کے ہاتھوں کیسا جنسی تشدد برداشت کرنا پڑتا ہے۔ باقی ماندہ افسانے بھی بہت عمدہ ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث ہر ایک پر تحریر کرنا مشکل ہے البتہ گلزار جاوید صاحب کی کہانی ''منکہ مسمّی فیروز دین'' بڑے یکتا اور عجیب وغریب عنوان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ گلزار صاحب بہت زیرک اور منجھے ہوئے قلم کار ہیں۔ معاشرے کے ممنوعہ مسائل کو بھی بڑی ذہانت کے ساتھ افسانے کا روپ عطا کر کے قارئین کو دنگ کر ڈالتے ہیں۔ اس کہانی میں صاحب ثروت کو اولاد کے لیے ''Sperma'' کی ضرورت تھی جب کہ اس سے گزشتہ افسانہ ''کانچ کا چھنا کا'' اس سے بھی زیادہ خطرناک موضوع تھا جس کو بڑی تہہ داری اور جرأت سے تحریر کیا گیا۔ میں دونوں افسانوں پر گلزار صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نیرّ اقبال علوی (لاہور)

بھائی گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم

آپ کی توجہ اور محبت سے ''چہارسو'' مل جاتا ہے، ہم لوگوں تک اسے پہنچانے کے لئے آپ کس قدر محنت کرتے ہیں اس کا اندازہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کم ہوگا۔ آپ سے بھی محبت کرنے والے لوگ یہاں موجود ہیں بلا کسی تفریق کے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، آپ کا دم بہت غنیمت ہے۔

تازہ شمارہ سحر انصاری صاحب کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ سحر صاحب کی ذات بھی کیسی دلفریب ہے کہ ہر طبقے میں مقبول ہیں۔ مگر مجھے وسیم بریلوی صاحب کے سلسلے کا رسالہ نہیں ملا۔ اب کیسے ملے گا، میں نہیں جانتا۔ آپ کا افسانہ حسب معمول بہت خوب ہے، یوں سبھی افسانے بہت اچھے ہیں۔ آپ خود ایک صاحب نظر فنکار ہیں اور افسانہ تو آپ کا میدان ہی ہے۔ اس لئے آپ کی نگاہیں بھی بہت دوررس ہیں۔

عبدالصمد (پٹنہ، بھارت)

ڈیئر گلزار بھائی، سلام۔

اس بار سحر انصاری صاحب کے چہارسو نمبر نے خوب مزہ دیا۔ دیر آید درست آید خوب آید۔ تمام مضامین، انٹرویو اور سحر بھائی کے رشحاتِ قلم سے اُن کی شخصیت اور فن نمایاں ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ جی خوش ہوتا ہے کہ آپ اردو ادب میں ایسا کام کر رہے ہیں جو نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی رہنمائی کا کام دے گا۔

ہر بار کی طرح تابش خانزادہ، ڈاکٹر فیروز عالم، دیپک کنول نے قاری کی توجہ خوب خوب حاصل کی ہے۔ سچ کہوں تو میں ان تینوں کا ایک طرح سے عاشق ہو گیا ہوں۔

افسانے سبھی لائق توجہ ہیں مگر بہت دنوں کے بعد نئے تیور، نئے انداز اور نئی اُٹھان کے ساتھ ''منکہ مسمّی فیروز دین'' پڑھا تو قلم خود بخود رواں ہو گیا۔ افسانے کا انداز داستانوں والا ہے، کہانی کا پھیلائی بھی کچھ ایسا ہی ہے اگرچہ گلزار جاوید پر کوئی دباؤ نہیں تاہم علامتوں سے کام لیا گیا ہے۔ سات سو چھیاسی (۷۸۶) جسے ہم بچپن میں پرچے کے اوپر لکھا کرتے تھے کہ یوں اللہ پاس کر دیتا ہے اور یہ مومن کے لیے کامیابی کی کنجی ہے۔ یہی اعداد اور پھر ق۔ ب اسلام نگر، کچی آبادی افسانے کا ٹریٹمنٹ ناول والا ہے۔ منٹو نے جو ذاتیں بنائیں اب تک الحمدللہ اسی پر مستحکم کردار ہیں۔ فیروز دین کے اردگرد منشی پریم چندر کے افسانے ''کفن'' کی بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

...... نئے سیاسی رجحانات......

اشرف جاوید اردو شاعری کے حوالے سے ادب کی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔شاعری میں زبان و بیان اور خیالات کے اظہار کا سلیقہ ان کی فنی پختگی اور ہنرمندی پر دلالت کرتا ہے اور ایسا وہی شاعر کرسکتا ہے جس کی زندگی کے مختلف موضوعات پر گرفت ہو،لیکن دلچسپ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے انہوں نے قومی و عالمی سیاست کے گنجلک موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کے مطالعے سے ہمیں ان موضوعات کے پس منظر اور پیش منظر، گہرائی اور تضادات سمجھنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔''نئے سیاسی رجحانات'' میں اشرف جاوید نے اس طرح سے قومی و عالمی سیاست کے اہم موضوعات کا احاطہ کیا جس سے اردو میں لکھنے والے اکثر تجزیہ نگار محروم ہیں۔درحقیقت زیادہ تر سیاسی تجزیہ نگار کسی بھی موضوع کے تاریخی پس منظر کو جانے بغیر اپنا موقف پیش کررہے ہوتے ہیں جبکہ اشرف جاوید واقعات وحالات کی دلیل کے ساتھ تجزیہ نگاری کرتے ہیں۔اردو زبان پر اپنی عالمانہ مہارات کے سبب وہ اس مشکل کام کو بڑی خوب صورتی سے آسان بنادیتے ہیں۔

...... فرخ سہیل گوئندی

اشاعت:۲۰۱۸، قیمت:۶۰۰، دستیابی: جمہوری پبلی کیشنز، لاہور۔

...... یادوں کے زخم......

آزاد رشیدی نے کلیات زندگی میں ہی مرتب کرلیا تھا کتاب کا نام اور انتساب بھی ان کا ہی تحریر کردہ ہے نام انہوں نے ''حدیثِ دل'' تجویز کیا تھا لیکن اس نام سے کوئٹہ کے ایک شاعر نسیم احمد نسیم کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے اس لیے اب یہ کلیات ''یادوں کے زخم'' کے نام سے منظر عامہ پر لا رہا ہوں یہ نام بھی ان کی خودنوشت کا عنوان ہے۔آزاد رشیدی کا پہلا مجموعہ ''اچھا تو جناب ہیں'' کے نام سے خود مرتب کیا تھا۔اس مجموعے میں ان کے تحریر کردہ خاکے اور فکاہیے ہیں۔افسوس ان کا وہ مجموعہ بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اگرچہ میں نے بہت کوشش کی کہ میں اسے شائع کردوں لیکن وہ میرے مالی حالات کے پیش نظر ٹالتے رہے اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی تھی کہ ان کے ایک دوست اور شاگرد نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے شائع کریں گے۔ہمارے مشترکہ دوست اختر رانا نے کتابت بھی کردی تھی مگر آزاد رشیدی کے اس دوست اور شاگرد دونوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور اس کتاب کو بھی ان کے انتقال کے بعد میں نے اپنے ادارے کے زیر اہتمام شائع کیا۔ ......عزیز جبران انصاری

اشاعت:۲۰۱۸، قیمت:۴۰۰، دستیابی: جبران اشاعت گھر، اردو بازار، کراچی۔

......گلشنِ ادب ......

زیرِ نظر مسودہ ''گلشنِ ادب''، جس کا پہلا حصہ اُردو نعت پر تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔راقم چونکہ خود تحقیقی اور تنقیدی مراحل سے گزر رہا ہے اس لیے اس کے خیال میں اردو نعت پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے سکالرز کے لیے یہ انتہائی اہم مضامین ہیں۔یہ بیان کرنا بڑا خوش کُن ہے کہ ''نعت'' کے حوالے سے تحقیق و جستجو عثمان کا عشق بھی ہے اور وہ اسے اپنا فرض بھی سمجھتا ہے۔اسی حوالے سے برنارڈ شا کا ایک قول ہے کہ:

''جب فرائضِ منصبی اور خواہشِ قلبی کی حدیں آپس میں مل جائیں تو اسے خوش نصیبی کہتے ہیں۔''

اس حوالے سے عثمان بڑا خوش نصیب ہے کہ وہ یہ دونوں کام بہ احسن نبھا رہا ہے۔اس کتاب کا دوسرا حصہ مختلف ادبی شخصیات کے تعارف، حالاتِ زندگی اور مختلف کلام کے حوالے سے مضامین پر مشتمل ہے۔جس میں خاص طور پر سرزمینِ تاندلیانوالہ کے اُردو اور پنجابی کے معاصر شعراء کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ عثمان اپنی سرزمین اور اس کے لکھاریوں کے لیے کس قدر مخلص ہے۔

......پروفیسر ظہیر عباس

اشاعت:۲۰۱۸، قیمت:۶۰۰، دستیابی: مہر گرافکس پبلیشرز، فیصل آباد۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی